یکے از مطبوعاتِ مجلسِ ترقیِ ادب لاہور

مقدمہ تاریخِ ادبیاتِ عرب

از

ایچ۔ اے۔ آر۔ گب

★

مترجمہ

سیّد محمد اولاد علی گیلانی

مع تعلیقات و حواشی و سوانح و نمونۂ کلامِ شعرائے عرب

مجلسِ ترقیِ ادب ۲۔ نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ۔ لاہور

پیش لفظ

عربی ادب کی تاریخ کے موضوع پر کوئی مفید کتاب آج تک اُردو زبان میں شائع نہیں ہوئی اور اس کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ بالخصوص ایم ۔ اے عربی و اسلامیات کے طلبہ اور دوسرے شائقین ادب کی علمی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے یہ ضروری معلوم ہوتا تھا کہ اس موضوع پر کوئی مختصر مگر جامع کتاب لکھی جائے ۔ میرے فاضل دوست پروفیسر ڈاکٹر عنایت اللہ صاحب رئیس شعبۂ عربی پنجاب یونیورسٹی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ پروفیسر گب کی مشہور کتاب Introduction to the History of Arabic Literature کا ترجمہ اُردو زبان میں کر دیا جائے تو ارباب ذوق کی یہ ضرورت کافی حد تک پوری ہو سکتی ہے چنانچہ اس ارشاد کی تعمیل کردی گئی ۔ بعد میں چند احباب کے مشورے کے مطابق چند مفید معلومات اور ناقدانہ حواشی کے اضافے کے علاوہ چیدہ چیدہ شعرائے عرب کے سوانح اور ان کے کلام کا انتخاب بھی ترجمے کے ساتھ شامل کردیا گیا تاکہ یہ زیادہ سے زیادہ کارآمد ہو سکے۔ اب یہ کتاب اپنی مکمل صورت میں ناظرین کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے ۔

اس سلسلے میں میں حکیم علی احمد عباسی صاحب پروفیسر جہان زیب کالج سیدو شریف (سوات) کا شکر گذار ہوں کہ انھوں نے

ناشر

کریم احمد خان ، معتمد مجلس ترقی ادب ، لاہور

مطبع

جدید اردو ٹائپ پریس

۳۱- چیمبرلین روڈ ، لاہور

زیر اہتمام

مرزا نصیر بیگ

With thanks to and the kind permission of the Oxford University Press.

(Syed Mohammad Aulad Ali Gillani)

به تشکر و اجازت اکسفورڈ یونیورسٹی پریس

(سید محمد اولاد علی گیلانی)

بار اول ۱۰۰۰ ۱۹۵۹ء

قیمت پانچ روپے

بڑی محنت اور جانکاہی سے اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق نہایت مفید ناقدانہ حواشی کا اضافہ کیا جو بطور ضمیمہ کتاب میں شامل کر دئے گئے ہیں۔ مولانا مرتضی احمد خان صاحب میکش نے مسودے پر نظر ثانی فرمائی اور اپنے مفید مشوروں سے میری امداد کی - میں ان احباب کا تہ دل سے ممنون ہوں۔

میں استاد الافاضل ڈاکٹر محمد شفیع صاحب رئیس دائرۃ المعارف اسلامیہ کا بھی بصمیم قلب ممنون ہوں جن کی شفارس پر وائس چانسلر صاحب پنجاب یونیورسٹی نے مجھے اس کتاب کی اشاعت کی اجازت مرحمت فرمائی -

دائرۃ المعارف اسلام (سید محمد اولاد علی گیلانی)
پنجاب یونیورسٹی لاہور

فہرس

—

۱۔ تمہید

عربی ادب کسی ایک قوم کا نہیں بلکہ ایک مکمل تہذیب کا قابل یادگار اور پائدار ترکہ ہے۔
اس ادب کی نشو و نما کرنے والوں میں مختلف حسب و نسب کے لوگوں کا حصہ ہے ۔ یہ لوگ عرب فاتحین کے زیر اثر اپنی قومی زبانوں، روایتوں اور رسموں کو کھو چکے تھے۔ عقائد و خیالات کی یک جہتی اور ہم آہنگی نے انہیں ایک جدید اور وسیع تر "عرب" قوم بنا دیا تھا (یعنی مسلم قوم یا امت مسلمہ—م) ۔ ان میں سے صرف ایرانی لوگ ہی ایسے تھے جو عربوں کے بہت سے رجحانات اور خصوصیات کو اختیار کر لینے کے باوجود آخرکار اس کوشش میں کامیاب ہوئے کہ اپنی ذہنی اور نسلی خود مختاری کو بحال کر سکیں ۔ اس میں شک نہیں کہ مشرقی ممالک میں ایرانی ادب کی دن دونی اور رات چوگنی ترقی نے عربی زبان کی فوقیت کو پس پشت ڈال دیا تاہم اس زبان نے اسلامی دینیات، فلسفہ اور سائنس (علوم حکمیہ) میں ایک عالم گیر زبان ہونے کا رتبہ برقرار رکھا ہے ۔ قدیم رومی اور یونانی زبان کے ادبیات کے مقابلے میں اس زبان کا پھلنا پھولنا نہ صرف ایک مہذب ماحول پر منحصر تھا بلکہ

ان لوگوں کی کشادہ دلی اور سر پرستی پر بھی جو اس وقت بلند مرتبوں پر سر فراز تھے - اسلامی تہذیب کے تاریخی تغیرات میں اس زبان کا ادب بھی برابر کا شریک حال رہا ، اس لیے اس میں پوری صحت کے ساتھ مقامی سیاست اور تہذیب و تمدن کی جھلک نظر آتی ہے - جوں جوں معاشرۂ اسلامی میں زوال آتا گیا ، اس زبان کے ادب کا زور اور اثر بھی انحطاط پذیر ہوتا چلا گیا ، لیکن جب تک کسی نہ کسی پایہ تخت میں کوئی نہ کوئی بادشاہ یا وزیر ایسا رہا جسے علوم و فنون کی سرپرستی کرنے میں مسرت ، نفع یا شہرت حاصل ہوتی تھی یہ مشعل ، گو کسی قدر دھندلی سہی ، مگر رہی برابر فروزاں ، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کبھی ایک ملک میں اور کبھی دوسرے ملک میں ادبی سرگرمیوں کے مراکز قائم ہوتے رہے ، یہاں تک کہ قریب قریب وہ زمانہ آ گیا جب ایشیا اور افریقہ میں ترکی فتوحات اور یورپ میں نشأۃ ثانیہ کا دور شروع ہوا - اس زمانے میں اس مشعل نے گل ہو جانے سے پہلے عربی تہذیب کے کھنڈروں میں کچھ عرصے کے لیے خوب ضیا پاشی کی - اس سے بعد کی صدیوں کا ادب اگرچہ ضخامت کے لحاظ سے بہت وقیع ہے لیکن قرون مظلمہ کے بے ذوق کام کی نقل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا - مصر و شام کے ملکوں میں عربی ادبیات کی موجودہ تجدید میں ایک ایسی روح کارفرما ہے جو مخصوص قدیم تہذیب کے ادبیات سے بالکل مختلف ہے -

عربی ادب کو بھی انہی بدبختیوں کا سامنا کرنا پڑا جو

قدیم یونانی رومی ادب کو پیش آئیں ' یعنی بہت سی قیمتی تصانیف کے متعلق یہ احتمال ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے ضائع ہو چکی ہیں ' گو بیشمار تصانیف علمائے یورپ کی صبرآزما کاوشوں کے ذریعہ زمانے کی دستبرد سے محفوظ بھی کر لی گئی ہیں - ان خزانوں کی حفاظت کا انحصار جس معاشرے پر تھا (یعنی علماء اسلام اور عام مسلمان—م) وہ اگر معاند نہیں تھا تو ان امور سے بے تعلق ضرور تھا جو اسلامی دینیات کے محدود حلقوں اور اس کی مقررہ قیود سے باہر تھے - لہذا یہ کہنا بجا ہے کہ ہمارے نقطۂ نظر سے جو کتابیں اسلامی تہذیب کے لیے سب سے زیادہ قابل فخر و عزت شمار ہو سکتی تھیں وہی ضائع ہو گئیں ' لیکن پھر بھی بے شمار مواد ابھی موجود ہے - یہ مخطوطات ایسی پراگندہ صورت میں ہیں کہ نہ انہیں آسانی سے حاصل کیا جا سکتا ہے اور نہ ان کے متعلق تفتیش و تفحص ہی کی کوئی سبیل پیدا ہوئی ہے' یعنی تمام اہم تصانیف جو اس وقت موجود ہیں وہ اگرچہ عربی دان طبقے کو تو حاصل ہو سکتی ہیں لیکن ایسی کتابیں نسبتاً کم ہیں جن کا معتبر ترجمہ کسی مغربی زبان میں کر لیا گیا ہو - البتہ ایسے تراجم کی تعداد اب روز بروز بڑھ رہی ہے -[1]

۱- یورپ کی مغربی زبانوں میں تراجم کی فہرست تتمۂ کتاب میں دے دی گئی ہے اور ہر مصنف یا کتاب جس کا ذکر اس فہرست میں ہے اس پر تارے کا نشان لگا دیا گیا ہے -

مسلمانوں کی کتابیں کچھ ان کے ذہنی زوال کی بنا پر ضائع نہیں ہوئیں - ان کی اضاعت کے اسباب سیاسی ہیں - چنگیزیوں کے ہاتھوں بغداد اور ممالک شرقیہ

جن لوگوں نے اسلامی تہذیب کی تعمیر میں حصہ لیا ان میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی جنہیں خالص عربی النسل ہونے

کی تباہی اور نصرانیوں کے ہاتھوں ہسپانیہ اور صقلیہ (سسلی) کی بربادی۔ یہ دو ایسے عالمگیر اور سخت ترین حادثے ہوئے کہ مسلمان خون کے آنسو روتے ہیں اور مہذب دنیا ان پر جتنا بھی ماتم کرے کم ہے۔ ان وحشیوں نے کتب خانوں کا ضائع کرنا اپنا شعار بنا لیا تھا۔ پھر جو کتابیں ان قدرناشناس جاہلوں کی دست برد سے بچ گئیں انہیں یورپ کے لوگوں نے اس وقت اڑا لیا جب وہ تہذیب آشنا ہوئے اور مسلم ممالک پر ان کا سیاسی تسلط قائم ہوگیا۔ یہ ہیں وہ کتابیں جو اس وقت یورپ کے کتب خانوں کی زینت بنی ہوئی ہیں اور جن کے ذریعہ علمائے یورپ اپنی تحقیق و تفتیش کا تفوق اہل علم پر ثابت کرنے کے درپے ہیں۔ حالانکہ اکثر علوم و فنون میں نئے انکشافات اور مفید ایجادیں مسلمانوں نے کی ہیں۔ مسلمانوں سے پہلے با قاعدہ علم کی حیثیت سے نہ تاریخ مدون تھی' نہ جغرافیہ' نہ طب و تشریح' نہ طبیعیات' نہ علم النبات' نہ علم الحیوان' نہ فلسفہ اور نہ دینیات۔ انتہا یہ ہے کہ تقویم کا تصور بھی دنیا کے پاس نہیں تھا۔ جتنے سن اس وقت رائج ہیں یہ سب سن ھجری کے بعد صحیح طریقہ سے مرتب کیے گئے ہیں۔

رہا یہ الزام کہ اسلامی معاشرے کی تنگ نظری یا علمائے اسلام کی رجعت پسندی کی بناء پر وہ کتابیں جو مصنف کے نزدیک اسلامی تہذیب کے لیے سب سے زیادہ قابل "فخر و عزت" ہو سکتی تھیں وہی ضائع ہوگئیں تو یہ اسلامی معاشرے کی انتہائی توہین اور علمائے اسلام پر صریح بہتان ہے۔ مسلمانوں کی سی وسعت نظر اور فراخ دلی تو دنیا کی کسی قوم میں کبھی پیدا ھی نہیں ہوئی اور آج بھی کہیں نہیں پائی جاتی۔ مسلمانوں نے تاریخ انسانیت میں دنیا کو بالکل پہلی مرتبہ تحریر و تقریر کی جس آزادی سے روشناس کیا اسی کے تحت انہوں نے ہر قسم کی کتب کا وجود برداشت کر لیا حتی کہ ایسی کتابوں کا بھی جو خود دین اسلام کو مسخ کرنے' سلف صالحین پر طعن کرنے اور تاریخ اسلامی کے صحیح خد و خال مٹانے کے لیے لکھی گئیں۔ انہوں نے ان کتابوں کے جواب لکھنے اور اہل باطل سے مناظرہ کرنے کی زحمت تو اٹھائی لیکن یہ نہیں کیا کہ سرکاری طور پر انہیں ضبط کراکے تلف کر دیتے۔ خلفاء و امراء اور علمائے اسلام اگر پادریوں کے نقش قدم پر چلتے اور زمین گول کہنے والوں یا دوربین ایجاد کرنے والوں کو مرتد قرار دے کر قتل

کا فخر حاصل ہو - اس لیے عربوں نے ادبیات عرب کی ترقی میں مقابلتاً تھوڑا حصہ لیا - بایں ہمہ اس ادب میں خیالات اور اظہار خیالات

کروا ڈالے تو کیا ہلاکو اور نصرانیوں کی جہل دوستی سے بچی ہوئی کتابیں جو مطبوعہ نہیں تھیں بلکہ مخطوطات کی شکل میں تھیں اتنی نہ ہوتیں کہ مصنف بھی انہیں "بے شمار" کہنے پر مجبور ہے ؟

ضرورت تو اس بات کی تھی کہ جاہل کافروں اور اہل یورپ کی سیاہ چیرہ دستیوں پر طعن کیا جاتا نہ کہ مسلمانوں پر — جنہوں نے اشاعت علوم و فنون کو اس وقت اپنا فرض بنایا جبکہ مسیحیوں کے پادری' ہند کے برہمن اور تمام ممالک کے مذہبی مقتدا چاہتے تھے کہ عوام کالانعام رہیں اور کسی طرح علم عام نہ ہونے پائے - علم کی یہ اجارہ داری کہ اس سے قیادت کا سرچشمہ کوئی خاص نسل یا محدود طبقہ ہو جائے وہ چیز تھی جسے مسلم معاشرہ برداشت نہیں کر سکتا - چنانچہ ایسی ہر تحریک کو مسلمانوں نے پوری قوت سے کچل دیا - نبی الامی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو خاتم النبیین بنا کر اس لیے مبعوث فرمایا گیا ہے کہ کمالات نبوت کے فیضان سے بقدر ظرف ہر کہ و مہ بہرہ اندوز ہو:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَّنَذِيرًا (۳۴ : ۲۸)

[ہم نے تمام بنی نوع انسان کی طرف آپ کی بعثت کا سوائے اس کے اور کوئی مقصد نہیں رکھا کہ دعوت قبول کرنے والوں کو آپ (مقامات علیا اور رضوان خداوندی کی) بشارت دیں اور (دعوت رد کرنے والوں کو پستیوں اور ناکامیوں سے) ڈرائیں -]

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلَٰكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ (۷ : ۱۷۵)

[ہم تو اسے بلند کرنا چاہتے تھے لیکن وہ زمینی رشتوں میں الجھ کر رہ گیا -]

اقوام عالم کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ علم و فضل' آزادی' سیاست اور دولت کو انہوں نے مخصوص طبقوں میں محدود کر رکھا تھا - دنیا میں صرف امت مسلمہ ایسی قوم پیدا ہوئی جس نے ہر فرد پر عالم ہونا فرض گردانا -

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَىٰ كُلِّ مُسْلِمٍ (ابن ماجہ)

کے طور طریقے ملک عرب ہی سے ماخوذ تھے، اور انہی لوگوں سے اثر پذیر تھے جن کی بدولت اور جن کی وساطت سے اس ادب نے ساتویں صدی مسیحی میں فاتحانہ قوت کی حیثیت حاصل کر لی ۔[۲]

[ہر مسلمان مرد اور عورت پر علم حاصل کرنا فرض ہے]
اور دنیا میں صرف ایک اسلامی معاشرہ ہی ہے جس میں پیدائشی بزرگی اور برتری کا کوئی تصور نہیں ۔ ہر فرد اپنے ذاتی اعمال کی برتری اور اپنے نفس کی اعلیٰ تربیت کی بنا پر بزرگ و برتر مانا جاتا ہے ۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللہِ اَتْقَاکُمْ

[تمہاری نسلوں اور ان کی شاخوں کی تقسیم صرف تعارف کے لیے ہے ۔ اللہ کے ہاں تم میں بزرگ و برتر وہ ہے جو اتقاء اور پرہیزگاری میں ممتاز ہو ۔]

اسلامی معاشرہ صحیح بنیادوں پر قائم ہو تو اس کا کوئی فرد جاہل نہیں رہ سکتا ، چنانچہ کچھ عرصہ پہلے تک یہی کیفیت تھی ، گو آج نہیں ، لیکن انشاء اللہ عنقریب پھر ہو جائے گی اور پھر بلند پایہ تصانیف کی وہی کثرت ہوگی جو اسلامی معاشرے کا خاص امتیاز ہے ۔ مسلمان اگر حدود اللہ کی عظمت قائم رکھیں تو تاتاریوں اور فرنگیوں کی سی اقوام کے ہاتھوں تاراج ہو جانے کے امکانات کیوں پیدا ہوں ؟

۲ - عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ عربی ادب کی خدمت غیر عرب مسلمانوں اور غیر مسلموں نے کی اور دوسری طرف یہ بھی کہ انہوں نے جو کچھ کیا عربوں کی سیاسی بالادستی کی بناء پر کیا ۔ گویا عربوں کی سیاست اسلام کی عالمگیر تحریک کے مطابق نہ تھی بلکہ تاتاریوں ، رومیوں اور مغربیوں کی طرح ہوس ملک گیری اور استعمار پرستی کے تحت انہوں نے اقوام عالم کو زیر کر کے ان میں محکومانہ ذہنیت پیدا کی اور خود تو کورے رہے مگر اپنے علوم و فنون اور اپنے ادب کی خدمت ان مفتوح "غلاموں" کے سپرد کر دی ۔

"اہل تحقیق" کا یہ دستور ہے کہ دعوت محمدیہ کی صورت مسخ کرنے کے لیے وہ تعمیری امور میں عربوں کی قائدانہ سرگرمیوں کو نظر انداز کر کے ان کا صرف ایک پہلو دیکھتے ہیں یعنی حاکمانہ اور وہ بھی محض سیاسی

پیشتر اس کے کہ ہم اپنے نفس مضمون کی طرف متوجہ ہوں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس باب میں اور اس سے اگلے باب میں ہم اس طبعی اور لسانی ماحول کا خاکہ پیش کر دیں جس میں عربی ادب نے ابتدا ہی سے نشو و نما پائی -

---

زاویۂ نگاہ ہے - اے کاش کہ وہ اس بارے ہی میں انصاف کو کام میں لاتے! لیکن انہیں تو فقہ و حدیث کی ترویج میں بھی پست سیاست اور خلفائے اسلام کی نفس پروری اور ہوس پرستی ہی نظر آتی ہے -

نبی عربی، خلافت عربیہ، مبلغ عرب، اور علما و فقہا و معلم بھی سب عرب، پھر یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ اپنے ہی ادب کی تعمیر میں عربوں کا ہاتھ بہت کم تھا - یہ سیدھی اور صاف بات سمجھ میں کیوں نہیں آتی کہ عرب معلموں کے مقابلے میں ان کے غیر عرب شاگرد بے شمار تھے - اکناف عالم میں ان شاگردوں کا پھیل جانا اور وہاں برکات نبویہ کے فیضان کا عام کر دینا سبب ہے اس بات کا کہ عرب مصنفوں اور مؤلفوں کی تعداد کم نظر آتی ہے، ورنہ اگر علماء اور مصنفوں کا کوئی مبسوط تذکرہ مرتب کیا جائے یا موجودہ تذکروں میں تفحص کو کام میں لایا جائے تو ہر صنف علم و فن کے ائمہ میں عربی النسل لوگ کافی تعداد میں یعنی اپنی آبادی کے تناسب سے بہت زیادہ نظر آئیں گے - یہ لوگ بظاہر نگاہوں سے اوجھل کیوں ہیں؟ محض اس لیے کہ انہی کا یہ معجزہ اور کمال تھا کہ انہوں نے اسلامی روح اس طرح پھونک دی اور خود اپنے آپ کو نمونہ بنا کر ایسے پیش کیا کہ قدیم تہذیبوں کے محدود اور حریفانہ رجحانات پس پشت ڈال دیئے گئے اور تمام نومسلم اقوام اس قابل ہو گئیں کہ عربوں کے ساتھ مل کر ایک جامع "مسلم قومیت" اختیار کر لیں -

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے نہایت جانفشانی کے ساتھ تابعین کی تربیت و تعلیم فرمائی اور خلافت امویہ تک اس کا خاص اہتمام کیا گیا کہ محض مناصب حکومت ہی پر نہیں بلکہ زندگی کے تمام شعبوں کی قیادت عربوں کے ہاتھ میں رہے تا کہ باہر سے داخل ہونے والے عناصر پر نگاہ رکھی جا سکے کہ وہ تخریب کی طرف تو نہیں جا رہے - اس طرح اسلامی معاشرے کے اندر نہایت سلیقے کے ساتھ نومسلموں ہی کی نہیں بلکہ دارالاسلام کے غیرمسلموں (ذمیوں) کی

عربی علم ادب کا مولد ایک ریتلا کف دست میدان تھا ' جو وسطی اور شمال مشرق عرب میں جزوی طور پر لق و دق صحرا اور جزوی طور پر کاهستان تھا ۔ اس ملک کی سرزمین چند ایک نخلستانوں کو چھوڑ کر جو کہیں کہیں ملتے ہیں

تعمیری روایات کو بھی عرب روایات میں سمویا گیا ۔ عباسیوں کے زمانے میں اس امتزاج کی تکمیل ہوئی اور آئندہ کے لیے راستے کھلے ۔

یہ تھی اصل بنا جس کی بنا پر امت مسلمہ کے غیر عرب افراد نے قرآن اور علوم قرآنیہ کی تدوین میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور یہی تھی اس بات کی صحیح وجہ کہ جتنے ممالک پہلی صدی ہجری میں اسلام کا گہوارہ بنے وہاں قرآن کی زبان رائج ہوگئی اور ایسی تہذیب پروان چڑھنے لگی جو نہ عربی تھی نہ عجمی بلکہ اسلامی تھی اور مختلف دیار و امصار کے مہذب عناصر کے باہم تعاون سے وجود میں آئی تھی ۔ اس تہذیب کے حدود اتنے وسیع ہیں اور اس میں ایسی لچک ہے کہ ہر جغرافیائی ماحول میں بہ اطمینان و آسائش رائج ہو سکتی ہے ۔

عربوں کو جب اس امانت کا امین اور اس تحریک کا علمبردار بنایا گیا تو دیگر اقوام عالم کی مذہبی تحریکوں کی طرح انہوں نے "برھمیت" پیدا نہیں کی ۔ بلکہ سب سے پہلے اپنے ہی قومی تصور حیات پر اندر کے میدان میں ضرب کاری لگائی ' اور پھر اسلامی مذہب اختیار کرکے اپنا فیض عام کر دیا ۔ ہر استاد کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ اس کے شاگرد اس کی زندگی ہی میں مسند ارشاد پر بیٹھ جائیں ۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ صحابہ کرام رض کی موجودگی ہی میں' صنادید قریش' علمائے انصار ' اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام ' جن کے نور سے یہ تمام عالم منور اور جن کے فیضان سے مستفیض ہے ' وہ اپنی آنکھیں یہ دیکھ کر ٹھنڈی کرتے تھے کہ کہیں عطاء و نافع پر نگاہیں اٹھتی ہیں' کہیں عکرمہ پر اور کہیں حسن بصری اور ابوحنیفہ پر (رضی اللہ عنہم اجمعین) ۔

اس طرح زندگی کے ہر شعبے میں غیر عرب اقوام کو عربوں کے دوش بدوش اسلامی معاشرے میں سر برآوردہ بنا دیا گیا اور سو برس کی تعلیم و تربیت کے بعد یہ لوگ حکومت میں بھی شریک کر لیے گئے' چنانچہ وہ عظیم ترین معاشرہ اور بے نظیر برادری وجود میں آئی جسے "امت مسلمہ" کہتے ہیں ۔

بے تنوع اور بنجر ہے، جس میں گرمی، سردی، خشک سالی اور سیلاب کے حوادث کے باعث برابر تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی - اس لیے یہاں مستقل طور پر (ایک جگہ) رہنے والی قوموں کے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں - اس ملک کے باشندوں کو ضرورت اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ وہ خانہ بدوشی کی زندگی بسر کریں - ان کا گذارہ زیادہ تر اونٹوں اور بھیڑوں کی پیداوار پر موقوف ہے اور اس لیے وہ متواتر نئی چراگاہوں کی تلاش میں ایک مقام سے دوسرے مقام پر نقل مکانی کرتے رہتے ہیں - ان کی زندگی کی اس یک رنگ رفتار میں تند و تیز راحت و رنج کے مواقع صرف اس وقت آتے ہیں جب ملک میں خوراک کی فراوانی ہو یا کئی سالوں کی متواتر قحط سالی کی وجہ سے صبر آزما تکالیف کا مقابلہ کرنا پڑ جائے یا آپس کے جنگ و جدال میں یا ملک کے کناروں پر کی

پچھلی تین چار صدیوں کا اگر جائزہ لیا جائے—یعنی مسلمانوں کے سیاسی اور ثقافتی ماحول میں جب اضمحلال آنا شروع ہوا' اور رفتہ رفتہ تمام عالم اسلام میں نکبت و جہالت پھیلتی گئی—اس کے اسباب چاہے کچھ ہوں' ہمیں جو اس وقت دیکھنا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے نشأۃ ثانیہ کی جتنی تحریکیں اٹھیں' مدارس قائم ہوئے' تبلیغی ادارے بنے' علمی و فنی کتابیں لکھی گئیں' دشمنان دین سے مناظرے ہوئے' اور سیاست میں طاقتور مخالفوں سے پنجہ کشی کی گئی تو ہر جگہ اور ہر موقعہ پر قیادت کرتے ہوئے عربی نسل ہی کے لوگ کیوں نظر آتے ہیں؟ ہر عصر کی فہرست رجال مرتب ہو تو ایک طومار ہو جائے - اِسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب خلافت عربیہ تھی اور عربوں کی قوت مجتمع' تو انہوں نے کیا کچھ نہ کیا ہوگا - (پروفیسر حکیم علی احمد عباسی)

خوش حال آبادی پر یلغاروں اور حملوں میں ناکامی یا فتح نصیب ہو ۔ ان کی دلیاوی اور مادی ماحول ان کی عادات ، خیالات اور زبان پر بے حد اثر انداز ہوا ' اور عرب زندگی اور عربی ادب کے ہر پہلو پر ان حالات کے تکرار اور فوری انقلابات کا گہرا نقش قائم ہے ۔ اس قسم کے خانہ بدوش لوگوں کا حیطۂ خیال ماحول کے محدود ہونے کی وجہ سے لازمی طور پر محدود ہے - بقاء کی جد و جہد اتنی سخت اور صبر آزما ہے کہ انہیں آج کے دن کی عملی اور مادی ضروریات مہیا کرنے کے سوا اور کچھ سوجھ ہی نہیں سکتا چہ جائیکہ ان میں دینی نظریات اور غیر مادی تصورات پر غور و فکر کرنے کا مادہ پیدا ہو ۔ ان کا تمام فلسفہ چند ما قلّ و دلّ ضرب الامثال پر مشتمل ہے اور ان کا مذہب ایک دور از کار واہمہ ہے ۔ ان کے خیال کا اظہار محسوسات کے ذریعہ ہوتا ہے اور ان کی زبان چند سادہ سرگرمیوں اور مادی صفات کی اصطلاحات کے سوا دوسرے تخیلات کے اظہار کے لیے بہت کم الفاظ یا تراکیب رکھتی ہے - زندگی اور اس کے ماحول کی یکسانیت نے اس زبان کو مادی زندگی کی اقلیم میں نشو و ارتقاء کا ایسا اعلی موقع دے دیا جس نے گویا خیالات کی بے مائیگی کی کمی پوری کر دی ' لہذا اس زبان میں نہ صرف ہم معنی الفاظ کی کثرت ہے بلکہ اس میں مظاہر قدرت کی ہر صنف کے لیے خواہ وہ کتنی ہی دقیق کیوں نہ ہو اور ہر قسم کی پیچیدہ سے پیچیدہ عملی سرگرمی کے لیے موزوں ترین اصطلاح موجود ہے - زبان کی یہ

خصوصیت کم و بیش صورت میں ان لوگوں میں بھی نمایاں طور پر پائی جاتی ہے جن کی عادات و خصائل اور جن کے مدارج تہذیب و تمدن عرب کے بدوؤں سے مشابہ ہیں - لیکن عربی زبان اپنے الفاظ کی حیرت انگیز فراوانی کی وجہ سے عدیم المثال ہے اور اس لحاظ سے اس نے اعلی ترقی یافتہ تمدن و تہذیب کے ادب کی تعمیر میں مہتم بالشان کام کیا -

عربی زبان وسطی اور شمالی عرب کے خانہ بدوش قبائل ہی کا مخصوص ورثہ نہیں بلکہ اس ملک میں ایسی قومیں بھی مستقل طور پر آباد تھیں جن کے تعلقات دوسری مہذب اقوام سے قریب تر ہو چکے تھے - عرب کے جنوب مغربی گوشے میں یمن کی قدیم تہذیب اور شام و عراق کے سرحدی علاقوں کے درمیان مستقل تجارتی تعلقات قائم تھے، جن کی وجہ سے ثقافتی اثرات کی راہیں وسط عرب میں بھی کھل گئیں - تجارتی شاہراہوں کے کھلنے کی وجہ سے معروف برادریاں پیدا ہوگئیں، مثلاً اہل مکہ جو خون اور زبان کے تعلقات کی وجہ سے خانہ بدوشوں کے زیادہ قریب تھے اور بظاہر اپنے اطوار و خصائل میں بھی ان سے کچھ زیادہ ممیز نہ تھے - دریائے فرات کے کنارے حیرہ کے مقام پر ایک عرب خاندان ایرانی تحفظ میں حکومت کیا کرتا تھا، اور ملک شام کے ڈانڈوں پر قدرتی طور پر عربوں کو نصرانی آرامی تہذیب سے زیادہ قریب کا واسطہ ہوگیا، لیکن عربی زبان نے آرامی ادب کا اثر اسی طرح بہت کم قبول کیا جس طرح کہ عرب کے

خانہ بدوش قبایل آرامی تہذیب و ثقافت کا اثر قبول کرنے سے سے بچے رہے، جن کا مقصد ہی یہ تھا کہ وہ قدرت کے ہاتھوں مطعون ہو کر یا تو اپنی ابتدائی سادگی ہی کو قائم و برقرار رکھیں یا تنازع للبقاء کی کشمکش کے رگڑے میں آکر فنا ہو جائیں۔

۲۔ عربی زبان

جنوب مغربی ایشیا کی زبانوں میں چند نایاب بولیوں کے سوا عربی زبان ہی ایک زبان ہے جو عمر میں سب سے چھوٹی ہے اور ان تمام زبانوں کی زندہ نمایندہ ہے جو زبانوں کے ایک معین اور خودمختار گروہ کے لحاظ سے سامی گروہ کے نام سے مشہور ہے - یہ زبانیں آپس میں بہت کچھ ایک دوسری سے ملتی جلتی ہیں، اور ان میں الفاظ اور بناوٹ کے لحاظ سے ایسے قریبی روابط نمایاں ہیں جن سے بدیہی طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان سب کا ماخذ ایک ہی ہے -[1] اس گروہ میں متعدد بولیاں ایسی ہیں جن میں منفرد خصوصیات پائی جاتی ہیں اور (معمولی چھوٹی چھوٹی مقامی بولیوں کو چھوڑتے ہوئے) ان کی مسلمہ تقسیم حسب ذیل ہے:

I- (الف) بابل اور اشوریہ کے مخروطی انداز تحریر کی زبان جو عام طور پر آشوری یا مشرقی زبان کے نام سے مشہور ہے -

---

۱۔ یہ سب زبانیں در اصل ہیں ہی ایک - ان کی مدون شکل اور باقاعدہ شکل عربی ہے۔ عربی ان سے مشتق نہیں بلکہ ان کی ارتقائی شکل ہے یعنی دنیا کی قدیم ترین زبانوں میں سب سے پہلی اور سب سے زیادہ جامع -

(ب) ملک شام اور عراق ایران کی قدیم زبانیں جنہیں مجموعی طور پر شمالی یا شمال مغربی سامی زبان کے نام سے تعبیر کرتے ہیں، یہ پھر دو گروہوں میں منقسم ہیں، یعنی (۱) قدیم ترین اور (۲) زمانۂ مابعد کی زبانیں -

II- (الف) کنعان کی زبانیں جن میں فینقی اور عبرانی نہایت اہم ہیں -

(ب) آرامی زبان جو قبل و بعد از مسیح کی صدیوں میں مغربی ایشیا کی عام فہم زبان رہی - اس کے ساتھ شامی (سریانی) زبان بھی شامل ہے جو شمال مغربی عراق عجم کی ادبی نصرانی زبان تھی -

(ج) ملک عرب کی زبانیں (جنوبی اور جنوب مغربی سامی زبان) -

III- (الف) شمالی عربی، ادبی عربی جو ہمارے زیر مطالعہ ہے -

(ب) جنوبی عرب کی قدیم کتباتی زبان (قدیم یمنی یعنی سبائی زبان یا معینی زبان وغیرہ) مع فروع یعنی جعز اور حبشی زبان، جو ملک حبشہ کی پرانی ادبی زبان تھی -

ان زبانوں میں سے بہت سی ایسی ہیں جو ادبی زبانوں سے بہت زیادہ مختلف ہیں - شمالی عربی کی مخصوص ہم آہنگی کی وجہ غالباً یہ ہے کہ صحرائی زندگی میں یکسانیت موجود ہے، جو ایک طرف تو سامی زبان کے نہایت ابتدائی عناصر کی محافظ رہی ہے اور دوسری جانب جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں فراوانی و بلاغت الفاظ کا

ہر لحاظ سے موجب بنی رہی ہے ۔ ان تمام زبانوں میں اکثر زبانیں ایسی ہیں جن میں غیرملکی الفاظ کم و بیش مقدار میں پائے جاتے ہیں، لیکن ہر حالت میں ایسے الفاظ کو ان ممتاز خصوصیات کا تابع بنا لیا گیا ہے جو تمام سامی زبانوں کا نمایاں خاصہ ہے ۔

ان میں سے بعض خصوصیات مثلاً اس کا پیچیدہ نظام صوتی، مرکب الفاظ کا فقدان وغیرہ ایسی باتیں ہیں جن سے اس وقت ہمیں بحث نہیں ۔ سامی زبانوں کی ممتاز ترین خصوصیت اصل مادہ اور اس سے اشتقاق کا طریقہ ہے اور اسی پر ہمیں کچھ تفصیل کے ساتھ بحث کرنے کی ضرورت بھی محسوس ہوتی ہے، کیونکہ اس طریقے کے علم کے بغیر عربی ادبیات کے خاص محاسن سمجھ میں نہیں آسکتے ۔ عربی ادب میں دوسرے ادبیات کی طرح فصاحت و بلاغت، ظرافت و مزاح اور تحریر میں صنائع و بدائع کا استعمال ماہرین زبان نے کیا ہے ۔

سامی (Semetic) زبان میں ہر ابتدائی تصور کو صرف حروف کے ذریعہ ظاہر کیا جاتا ہے اور ان میں زیادہ کثرت ایسے الفاظ کی ہے جو سہ حرفی ہیں ۔ یہ تین حروف مادہ اشتقاق کا کام دیتے ہیں، اور معانی کی ابتدائی تبدیلیاں اندرونی حروف علت کی تبدیلیوں اور اختلافات کے ذریعہ ظاہر کی جاتی ہیں ۔ ثانوی تبدیلیاں یا تعلیلات بھی یا تو اسی طریقے سے عمل میں آتی ہیں یا حروف زائد یا لاحقوں کو بروئے کار لایا جاتا ہے ۔ مثال کے طور پر مادہ ق ت ل ہی کو لے لیجیے کہ اس سے مار ڈالنے یا قتل کر دینے کا تصور پیدا ہوتا ہے ۔ اس سے

فعل قَتَل (اس نے قتل کیا) نکلا، اسم قَتْل هؤا، اسم فاعل قاتِل بنا اور مفعول قَتِیل بن گیا، اور اسی طرح اور بہت سے مشتقات پیدا ہوگئے۔ مذکورہ بالا معنوں میں هر وہ لفظ جس کا مادۂ اشتقاق ق ت ل هوگا وہ کسی نہ کسی طرح قتل کا تصور هی ظاهر کرے گا۔ مادے کے معانی کو محدود کرنے کا یہ طریقہ اسماء اور افعال دونوں پر یکساں حاوی رهتا هے، لیکن جہاں اسماء میں تراکیب (ابواب) کا یہ سلسلہ بے حد وسیع هے افعال میں گردانوں کی ترتیب کے قواعد کو ایک منضبط اور کڑے طریق سے محدود کر دیا گیا هے۔ سادہ یا مفرد فعل قَتَلَ سے افعال مبالغہ (اس نے بہت قتل کیا—قَتَّلَ)، متعدی بدو فعل (اس نے قتل کیا یا قتل کرایا—اَقْتَلَ) اور جنوبی سامی زبان میں (اس نے قتل کرنے کی کوشش کی، قاتَلَ یعنی اس نے جنگ کی) وغیرہ بن جاتے هیں۔ عربی زبان کی مکمل صرف و نحو میں ان افعال میں سے هر ایک فعل سے راجع الی الفاعل مجہول ترکیبیں بن جاتی هیں۔ بعض افعال سے هر قسم کی مکمل تراکیب بن سکتی هیں، لیکن تقریباً هر مادے میں کوئی نہ کچھ تبدیلیاں ضرور هو سکتی هیں۔

ظاهر هے کہ جب ترکیب افعال کا طریقہ ناقابل تبدیل اور یکساں حالت میں رهتا هے اور اس میں کسی قسم کا استثنا نہیں پایا جاتا، اور چونکہ مادہ همیشہ تین حروف پر مشتمل هوتا هے اس لیے عربی زبان میں ایسے الفاظ کا بے شمار ذخیرہ موجود هے جن کی تعلیلات عام طور پر ایک هی جیسی هیں۔ اندریں صورت ابتداء هی سے عربی

ادبیات میں صرف نظم ھی میں نہیں بلکہ نثر میں بھی قافیہ نے ناگزیر طور پر بہت بڑا کام کیا ہے ۔ عبارت آرائی میں ایک ھی حرف سے شروع ہونے والے الفاظ کا شاندار استعمال بھی ممکن ہے اور صنعت ایہام جس سے اعراض کرنا ھی مشکل ہے ادب لطیف اور اسی قسم کے ادب کی خاص زیبائش و زینت سمجھی جاتی ہے ۔[۱]

مادۂ اشتقاق کی مبالغہ آمیز تبدیلیوں کی وجہ سے کفایت الفاظ کی خصوصیت بھی زبان میں پیدا ہو جاتی ہے اور اس کے زیر اثر ابتدائی عربی نظم و نثر دونوں میں جملوں کا مختصر اور معنی خیز

۱۔ محض یہی نہیں کہ معانی کے پیش نظر ایک مادے سے مختلف مصادر بنتے ھیں بلکہ ایک مادے کے حروف کی ترتیب بدل جانے سے جتنے مادے بنتے ھیں ، ان سب کے معانی میں ایک قدر مشترک پائی جاتی ہے ، مثلاً یہی مادہ ق–ت–ل ہے ، اس کے حروف کا مزید امتزاج حسب ذیل ہوگا : (۱) ق–ل–ت ، (۲) ل–ق–ت ، (۳) ل–ت–ق ۔ ان میں سے صرف ایک مادہ "ق–ل–ت" معروف ہے یعنی قَلِتَ جس کے معنی ھیں ھلاک ہونا ۔ اسی سے مِقْلَات بنا یعنی وہ اونٹنی جو ایک بچہ جن کر نسل کشی سے محروم ہو جائے ــ گویا قَتَل اور قَلِت اپنے معانی کے اعتبار سے بنیادی مغائرت نہیں رکھتے ۔ یہی حال تمام دوسرے مادوں کا ہے ۔

عربی مادوں کی اسی معنوی مشابہت سے علم الحروف مدون کیا گیا ۔ اسلام سے پہلے بھی کَہَنَہ (یعنی کاھن لوگ جو پوشیدہ باتیں بتاتے اور غیب کی خبریں دیتے تھے) اور راق (یعنی جھاڑ پھونک کرنے والے) وہ ان حروف کے خواص معنوی کو کام میں لاتے تھے ۔ جاھلیت کا یہ علم ظلماتی تھا ، لیکن مسلمانوں نے اسے نورانی قالب دے کر مدون کیا اور اب یہ ایک وسیع ، وقیع ، باقاعدہ اور منضبط علم ہے ۔

قرآن مجید کی جہاں اصلی صفت ہے ذھنی اور روحانی اصلاح ، وھیں اس کے ذریعہ حسی اور مادی دنیا میں بھی قوت تصرف پیدا ہو جاتی ہے ۔ ارشاد حق ہے :

ہونا ظاہر ہے ۔ عربی زبان میں ایسی مشہور ضرب الامثال بہت کم ہیں جو تین یا چار الفاظ سے زیادہ ہوں اور منظوم کلام کا یہ بڑا بھاری نقص سمجھا جاتا تھا کہ کوئی جملہ ایک شعر سے زیادہ بڑھ جائے ۔ اصلی عربی زبان ان (مشرقی گل کاریوں) سے جو عام رواج پا چکی تھیں یکسر معرا تھی ، اور اس قسم کا تکلف جو بعد کے عربی ادب میں پایا جاتا ہے اس کے مآخذ بیرونی ہیں ۔ عربی زبان نے ان

وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ أَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْأَرْضُ أَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتَىٰ ، بَل لِّلَّهِ الْأَمْرُ جَمِيعًا

ہو سکتا ہے کہ اس قرآن کے ذریعہ پہاڑ چلائے جائیں یا زمین کاٹ ڈالی جائے یا اس کی قوت سے مردے کو طاقت گویائی عطا ہو بلکہ تمام امور کی زمام اللہ ہی کے ہاتھ ہے ۔

قرآنی بشارت ہے ۔

(۱۳ . ۳۱)

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ

(۴۱:۵۳)

ہم عنقریب ان کو اپنی نشانیاں حسی دنیا میں بھی دکھا دیں گے اور خود ان کے باطن میں بھی —

اسی وعدۂ ربانی کا ظہور تھا کہ جب مسلمانوں نے قرآنی تعلیمات کے تحت علوم حکمیہ کی تدوین پر توجہ کی تو دنیا کا کوئی علم نہیں چھوڑا جس میں اللہ تعالی کی عظیم نشانیاں نہ دکھا دی ہوں ۔ اسی طرح جب وہ باطنی قوتوں کے ادراک ، ان کے نمو اور ان کے مظاہر کی طرف متوجہ ہوئے تو اسی قرآن سے انہوں نے ایسے ایسے مقامات اور ایسی ایسی بلندیاں سر کیں کہ دوسری قوموں کے خواب و خیال میں بھی نہیں ۔ روحانی منازل قطع کرنے اور عالم ملکوت کی سیر کے علاوہ ، اسی قرآن سے انہوں نے کائنات میں تصرف کی بھی وہ قدرت حاصل کر لی کہ دنیا کوئی قوم اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی ۔

تکلفات کو خوشی سے قبول کر لیا اور بعد کے ادوار کی فصاحت و بلاغت ان عدیم النظیر مواقع کی مرہون ہے جو عربی زبان کو اپنے مترادفات اور ان لطیف تراکیب کی دولت کی وجہ سے حاصل تھی جن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ تاہم قدیم دور کا اظہار خیال اور اختصار پسندی کا طریقہ بھی عام بول چال اور ادب کی بعض اصناف میں جاری رہا اور جاری ہے۔

عربی اسلوب بیان کی اختصار پسندی صرف اس زبان کی لغت کی فراوانی کی مرہون منت نہیں بلکہ اس کے اسباب اور بھی ہیں۔ اس بات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کہ عربوں کا زاویۂ نگاہ محدود تھا، بجا طور پر امید کی جا سکتی تھی کہ عربی زبان (عام طور پر تمام

قرآن حکیم کی آیات سے ان حسی خواص کا مشاہدہ یعنی کرامات کا، اس کثرت اور ایسے تواتر سے چلا آتا ہے کہ جو شخص مسلم معاشرے سے معمولی واقفیت بھی رکھتا ہے وہ ان ظاہری اور باطنی تصرفات کے انکار کی جرأت نہیں کر سکتا۔

مسلمانوں نے حروف کے خواص ہی پر عبور حاصل نہیں کیا بلکہ ان کے اعداد دریافت کر کے یہ بھی عملاً تواتر کے ساتھ ثابت کر دیا کہ حروف کے خواص کے حصول کے لیے "وقوف عددی" ضروری ہے۔ چنانچہ نیت، آداب، اور تعداد کے اعتبار سے ایک ہی آیت کے مختلف اور متنوع خواص مرتب ہوتے ہیں۔ یہ اتنا بڑا اور اصیل علم ہے کہ اس پر سیر حاصل بحث اختصار کے ساتھ مشکل ہے اور یہاں اس کا موقعہ بھی نہیں۔ یہاں تو صرف عربی زبان کی عظمت اور قرآن حکیم کی جلالت کے ادنی ظہور کی طرف اشارہ مقصود تھا اور ہم امید رکھتے ہیں کہ حق کوش و حق نیوش حضرات کے دلوں میں یہ اشارے صحیح فکر و عمل کا جذبہ بیدار کر دیں گے اور وہ نیازمندی و عبودیت کے ساتھ حقائق قرآنیہ کے بارے میں تفحص و تفتیش کی طرف متوجہ ہوں گے۔ (پروفیسر حکیم علی احمد عباسی)۔

سامی زبانوں سمیت) اپنے نقطۂ نظر اور طریق اظہار خیالات میں مفعولی صورت اختیار کرے۔ یہ بات فعل کی نحوی ترکیبوں اور تعلیلوں سے ظاہر ہے۔ ہندی اور فرنگی زبانوں میں تو زمانۂ حال، مستقبل اور ماضی کے اظہار کا شاندار طریقہ قائم ہے، لیکن سامی زبان کے افعال میں صرف ابتدائی قسم کی دو حالتوں کو قائم رکھا گیا ہے جو ابتدائی صورت میں زمانہ کی تعبیر نہیں کرتے، بلکہ محض یہ ظاہر کرتے ہیں کہ آیا فعل کی تکمیل ہوئی یا نہیں۔ اس کمی کو علم ترکیب الکلام کے ایک شاندار طریقے کے ذریعے زمانۂ مابعد کی عربی زبان میں پورا کیا گیا۔ ہندی یورپی زبانوں کا طور فعل (model) کا طریقہ بھی سامی زبانوں میں زیادہ تر مفقود ہی ہے۔ ادبی یا تحریری زبان میں (عام بولی میں نہیں) صرف فعل کا طور شرطیہ یا احتمالیہ صورت اور صیغۂ امر تاکیدی بے حد محدود طریق میں استعمال ہوتے ہیں۔ چنانچہ یَقْتُلُ کی ترکیب سے نہ صرف ''وہ قتل کرتا ہے''، ''وہ مار ڈالے گا'' اور (ترکیب میں) ''وہ مار رہا تھا'' کا مفہوم بھی ظاہر ہوتا ہے بلکہ اس سے ''وہ شاید مار ڈالے یا مار ڈالے گا یا مار سکے گا'' کے معانی بھی نکلتے ہیں۔ اس لفظ کا صحیح مفہوم ہر حالت میں نفس مضمون پر منحصر ہوتا ہے۔ علم ترکیب الکلام کو وسعت دے کر طور فعل کو بشرط ضرورت بڑی صحت کے ساتھ بھی بیان کیا جا سکتا ہے۔ جملوں کو متزلزل اور تنزل کے انداز میں پیش کیا جاتا ہے جس میں یورپین ترکیب نحوی کے با اصول نظام مراتب کی کمی رہ جاتی ہے۔ جملے کے مختلف اجزاء بطور خود قائم

ہوتے ہیں اور وہ شاذ و نادر ہی ایک دوسرے کے تابع ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود جہاں تک ادبی عربی کا تعلق ہے ، اس نحوی نظام و ترکیب کے ربط کی عدم موجودگی کو اکثر اوقات مبالغہ آمیزی سے بیان کیا جاتا ہے۔ کم از کم ابتدائی منظوم کلام میں جملے کے مختلف ٹکڑوں کی اصلی خود مختاری ایک منطقی ترکیب کے تابع ہوتی ہے۔ یہ ترکیب استعمال کے لحاظ سے یکساں رہتی ہے۔ خیالات کے اظہار کے لیے ان غیر مانوس طریقوں کا استعمال عربی زبان کو ان اہل یورپ کی نگاہوں میں کسی قدر درست اور ناموزوں سا بنا دیتا ہے جو ان ٹکڑوں کے باہمی ربط و تعلق کو اچھی طرح اخذ نہیں کر سکتے (یعنی اپنی زبان کی پستی اور عربی زبان کی رفعت کی بنا پر۔م)۔

اس مشکل میں اس وجہ سے اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے کہ الفاظ کی ترکیبی ساخت اور صرف و نحو کے عام نظام مراتب کو مفہوم و مطالب کے سمجھنے کے لئے کافی سمجھا جاتا ہے اور تحریر میں اعراب کا استعمال ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ الغرض عربی متن میں بقول بعض لوگوں کے صرف پچھتر فیصدی معانی موجود ہوتے ہیں اور بقایا پچیس فیصدی پڑھنے والے کو خود مہیا کرنے پڑتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ متن میں ہر لفظ کے معنی جاننے اور نحوی ترکیب کو سمجھنے کے بعد بھی دو بالکل مختلف معنوں کے پیدا ہو جانے کا احتمال رہتا ہے۔ اس طریق سے صرف طلبائے یورپ ہی محروم نہیں رہتے بلکہ مقامی طلباء سے بھی اکثر اوقات غلطی ہو جاتی ہے تاوقتیکہ وہ زبانی روایات کی طرف جو تحریری متن کی معاون ہوتی ہیں رجوع نہ کریں۔ لغوی

مشکلات اور کاتبوں کی جہالت اور لاپروائی سے جو غلطیاں تحریر متن میں ہو جاتی ہیں وہ سب اس کے علاوہ ہیں، کیونکہ عربی زبان میں اس کے رسم الخط کی خصوصیات کی وجہ سے دوسرے ادبی مخطوطات کی بہ نسبت ایسی غلطیوں کا احتمال زیادہ ہوتا ہے۔ (یہ بات ہر زبان میں ہے خصوصاً ان میں جو بالکل صحیح پڑھے جانے کے لیے اعراب کی محتاج ہیں—م) -

۳- رزمیہ دور

(نواح ۵۰۰ تا ۶۲۲ عیسوی)

دنیا بھر کے دوسرے ادبیات کی طرح عربی ادب بھی شعر و سخن کے ابلتے ہوئے چشموں سے پھوٹ نکلا ہے - جس طرح یونانی ادب نے ہومر کی شاعری سے فوری نشو و نما پائی اسی طرح عربی ادب کے سوتے بھی شاعری سے پھوٹ نکلے ' لیکن کلام موزوں کی پیچیدگیوں اور اصطلاحات کلام کی فراوانی اور محاسن کے لحاظ سے عربی کا ادب ، ہومر سے گونہ سبقت حاصل کرتے ہوئے بیک وقت شمالی عرب کے وسیع حصے میں پھیل گیا - قدیم ترین شعرا جن کا کلام ہم تک پہنچا ہے چھٹی صدی عیسوی کے نصف اول سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے کلام میں ایسی لطافت اور لچک پائی جاتی ہے اور ان کو زبان پر اتنا عبور حاصل ہے کہ ان کے جانشین ان سے کسی زمانے میں بھی سبقت لے جانے پر قادر نہیں ہو سکے - اس سے قبل کے زمانے کا حال ہمیں مطلق معلوم نہیں جب شاعری کے نشو و نما اور اس کے ارتقائی تجارب کا دور دورہ ہوگا -

عربی زبان کی شاعری کی ابتداء کا پتہ سیدھے سادے اشعار سے چلتا ہے جس میں لبت کی طرح وزن کا پہلا رکن غیر تاکیدی اور دوسرا تاکیدی ہوتا ہے۔ اس کے بعد مقفیٰ نثر (سجع) میں رجزیہ کلمات ہیں جن کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ان میں جادو کی طاقت موجود ہے۔ شاعر کے اس تصور کی عام فہم مثال بلعم باعور کی کہانی ہے۔ بایں ہمہ کوئی سامی زبان بھی ایسی نہیں جو زمانۂ جاہلیت کے عربوں کی شاعری کے مشابہ ہو۔[1] اس کی سولہ بحروں کی ابتداء جن میں ارکان کی اعلیٰ درجہ کی پیچیدہ تقسیم قائم کی گئی ہے، اب تک مبہم ہے۔ اس کی تشریح جو مقامی ماہرین لسانیات نے کی ہے اور جسے ہمارے زمانے کے چند علماء نے بھی تسلیم کر لیا ہے یہ ہے کہ سب سے پہلے تو یہ اونٹ کی موزوں اور باقاعدہ چال اور رفتار کی حرکات پر مبنی ہے۔ یہ بات بھی یقینی ہے کہ ابتدائی شاعری زیادہ تر ان قبائل میں ترقی پذیر ہوئی جو تہذیب و تمدن سے بہت کم اثر اندوز ہوئے۔ اوزان کی مناسبت کے علاوہ عربی شاعری کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ایک ہی قافیہ ساری نظم میں جاری و ساری رہتا ہے اور اسے قصیدہ یا غزل میں نہایت شاندار طریق سے نبھایا جاتا ہے جس میں ساٹھ سے لے کر سو تک ابیات ہوتے ہیں۔

منظوم کلام اور عام روز مرہ کی زبان کا باہمی تعلق اور بھی

۱۔ یہی ہے اس بات کی دلیل کہ عربی زبان ان زبانوں سے مشتق نہیں ہے بلکہ ان کی ارتقائی شکل ہے اور دراصل یہ مختلف نام عربی کے اس دور کے ہیں جب وہ نشو و نما پا رہی تھی ۔ م۔

زیادہ دلچسپ بلکہ عقدۂ لاینحل ہے۔ ایک طرف تو یہ مانا جاتا ہے کہ دونوں ایک ہی ہیں اور ان میں کچھ فرق نہیں۔ دوسری جانب یہ کہا جاتا ہے کہ شعراء نے شعر و سخن کے لیے ایک ایسی ٹکسالی زبان اختیار کر لی تھی جس کی بنیاد تو وہی روز مرہ کی زبان تھی لیکن الفاظ کی خوبصورتی، محاورہ کی خوبی اور تعلیلات کے محاسن کے لحاظ سے روز مرہ کی زبان سے زیادہ ممتاز تھی۔ ایک ایسی مصنوعی زبان کا نظریہ جو محض شعر و سخن کے لیے وضع کی گئی ہو متعدد وجوہ کے باعث ناقابل تسلیم ہو جاتا ہے۔ غالب گمان یہ ہے کہ شعراء نے بہت سی بولیوں کے الفاظ کو اپنی زبان میں مدغم کرکے اسے مالا مال کر دیا اور اس سے انہیں ان الفاظ کے صحیح استعمال کرنے میں بڑی مدد ملی۔ نظموں کی نحوی ترکیب خاص طور پر ایسے بلند معیار پر پہنچ گئی جس کی مثال دوسری سامی زبانوں میں ہرگز نہیں ملتی، گو روزمرہ کے عربی کلام کی ترکیب ڈھیلی ڈھالی اور واضح ہونے کے بجائے اشارت آفرین ہوتی تھی۔ یہ امر بھی کسی قدر مشکوک ہے کہ آیا یہ ادبی زبان قدیم زمانے ہی سے تمام عرب میں مستعمل تھی یا مقابلتاً بعد کے زمانے میں جاری ہوئی، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعد کے تمام عربی ادب میں اس نے ایک معیار قائم کر دیا۔

یہ غیر یقینی حالت جو اس زبان میں کار فرما ہے، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ چونکہ آٹھویں صدی کے زمانہ تک تحریری نظموں کا مواد بہت کم تھا اور یہ تمام مواد گذشتہ دو صدیوں سے پہلے رواۃ کے ذریعہ ہی سے منتقل ہوتا رہا اور اس سے پہلے ضبط تحریر میں نہ

آیا تھا - یہ ممکن ہے کہ ایک راوی سے دوسرے راوی تک منتقل ہونے میں ان اشعار میں کہیں کہیں کچھ تبدیلی بلا ارادہ آ گئی ہو اور اس تبدیلی کے ذریعہ پرانے محاوروں کی جگہ چست جملے آ گئے ہوں اور بولیوں سے پرانے آثار کی قطع و برید ہو گئی ہو لیکن مواد کی ترکیب کے ضروری لوازم کی وجہ سے معمولی سی تبدیلیوں کے سوا کوئی اہم تبدیلی نہ ہو سکی ہو - شعر و سخن کا کل ذخیرہ نسلاً بعد نسلٍ راویوں کے ذریعے منتقل ہوتا رہا - زمانہ قدیم میں یہ راوی خود بھی شاعر ہوا کرتا تھا جو گویا اپنی شاگردی کا زمانہ اپنے کسی بڑے ہم عصر کی رفاقت میں اس کا راوی ہونے کی حیثیت سے گزارا کرتا تھا ، لیکن آہستہ آہستہ پیشہ ور راویوں کا ایک مستقل گروہ بھی پیدا ہو گیا - بعض مشہور و معروف راویوں کی حیرت انگیز قوت حافظہ کی کئی کہانیاں مشہور ہیں - ان میں سے ایک کا قصہ تو یوں بیان کرتے ہیں کہ اس نے ایک ہی نشست میں دو ہزار نو سو طویل نظمیں پڑھ کر سنا دیں - حافظہ کی ایسی خداداد قوت کے باوجود اغلاط کا پیدا ہو جانا بھی ناگزیر تھا - عربی نظم کی مخصوص بناوٹ کی وجہ سے محذوفات اور بے محل اضافوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک نظم یا شاعر دوسری نظم یا شاعر کے نام کے ساتھ مخلوط و منسوب ہونے لگے - عام رجحان یہ بھی پیدا ہو گیا کہ پرانی شاعری کا رواج مفقود ہو گیا یا اس میں تجدید سی ہونے لگی ، اور بہت سی نظموں کے تاریخی ماخذ اور حالات (جن کے جانے بغیر اکثر اوقات ان کے سمجھنے میں دشواری پیش آ جاتی ہے) یا تو

بالکل ھی فراموش کر دئیے گئے یا انھیں از سر نو گھڑ لیا گیا - اس کے علاوہ تمام راوی بھی اس بات کا ثبوت نہ دے سکتے تھے کہ انھوں نے کبھی اپنی ھی نظموں کو یا کسی غیر معروف شاعر کے کلام کو عہد گذشتہ کے کسی مشہور و معروف شاعر کے نام سے تو منسوب نہیں کر دیا - تاھم اغلاط کے ان تمام ذرایع کے ھونے ھوئے اس بات میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ قدیم عربی شاعری جو ھم تک پہنچی ھے بہت بڑی حد تک قابل اعتماد ھے - اس کلام میں سے جو کچھ بھی اب ھمارے قبضہ میں موجود ھے ، وہ اس کلام کے مقابلہ میں بہت تھوڑا ھے جو تلف ھو چکا ھے لیکن اس میں کم از کم وہ تمام تصانیف شامل ھیں جو مقامی نقادوں کے نزدیک ھر نسل میں بے حد قابل قدر و ستائش رھی ھیں -

اس قسم کے کلام میں سب سے اونچا مرتبہ ''معلقات'' کو حاصل ھے (یہ ایک ایسا نام ھے جس کے معنی کی تشریح آج تک قابل اطمینان طریق سے نہیں ھو سکی) - یہ مجموعہ سات قصیدوں پر مشتمل ھے جنھیں آٹھویں صدی کے ایک راوی نے بیان کیا - ان کے ساتھ تین اور قصیدوں کو بھی عام طور پر شامل کر لیا جاتا ھے - یہ دس شاعروں کے دس قصیدے ھیں - ان دس قصیدوں کے مصنف بھی اتنے ھی ھیں اور ان میں سے ھر ایک قصیدہ اپنے مصنف کا شاھکار سمجھا جاتا ھے - اس مجموعے میں جن شعراء کا کلام پیش کیا گیا ھے وہ عربی شعر و سخن میں چھٹی صدی کے خدایان سخن متصور ھوتے تھے - ''معلقات'' کے زمانے کا ایک اور مجموعہ بھی ھے جو اس کے مؤلف

(المفضل ماہر لسانیات) کے نام پر ''منضلیات'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس مجموعے میں کوئی ۱۲۰ قصیدے اور اجزاء ہیں جو زیادہ تر جاہلیت کے زمانہ کے ذرا کم رتبہ شعراء کا کلام ہے۔ اس سے بعد کے زمانے کے بھی کچھ مجموعے موجود ہیں جو مقابلتاً کم مشہور اور کم معتبر ہیں۔ دیوانوں اور غزلیات کے مجموعوں کے علاوہ نظم منتخب اور اتفاقیہ طور پر کہے ہوئے ابیات کے بیاض بھی بے شمار ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور دیوان ''الحماسہ'' (رزمیہ شعر و سخن) ہے، جسے ابو تمام نے مدون کیا تھا اور جو خود بھی نویں صدی کے مشہور شعراء میں شمار ہوتا تھا۔ اس مجموعہ کا پر جوش ترجمہ جرمن نظم میں Ruckert (روکرٹ) نے کیا ہے، جو مختلف موضوعات کے تحت، دس حصوں میں منقسم ہے۔ ان میں سب سے پہلی اور سب سے طویل نظم وہ ہے جس کے نام پر اس کتاب کا نام رکھا گیا۔ اس کے علاوہ ایک اور بیاض، جس کا نام بھی ''حماسہ'' ہی ہے، چند سال بعد البحتری نے تالیف کی۔ قدیم کلام کے انتخاب ''کتاب الاغانی'' (گیتوں کی کتاب) میں بھی مندرج ہیں، جس کا مصنف ابوالفرج الاصفہانی (م ۹۶۷ء) ہے۔ اس کتاب میں نہایت وسیع اور بے حد قابل قدر مجموعہ سوانح کا ہے، جن سے ہم نے قدیم عربی شاعری کی جملہ معلومات اور تہذیب و تمدن کی تفصیلات اخذ کی ہیں۔ ''کتاب الشعر و الشعراء'' مصنفہ ابن قتیبہ میں، جسے بعض ماہرین فن عربی شاعری کی بہترین بیاض تسلیم کرتے ہیں اسی قسم کا مواد موجود ہے اور لسانیات اور ادب لطیف کی بعض دوسری

تصانیف میں بھی اسی قسم کا مواد موجود ہے -

قدیم شاعری کے پہلے مطالعے سے تو بے ربطی اور بے ذوق کے اثرات پیدا ہوتے ہیں ، کیونکہ اس کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے موضوعات صحرائے عرب کی افق تک محدود ہیں ، اس کے تخیل نے بدوی ماحول میں تربیت پائی ہے ، صحرائی زندگی کی یکسانیت اس سے منعکس ہے ، اور اس کی حقیقت پسندی ' اور صحیح خیال آرائی قیاس اور اکتسابی شعور کی قیود سے مبرا ہے -

ان وجوہ کی بناء پر اس شاعری میں دلچسپی اور اختراعی لوازم کی کمی کا الزام اکثر اوقات عائد کر دیا جاتا ہے - وہ لوگ جو صرف اس کا ترجمہ پڑھتے ہیں ' چند اتفاقیہ طور پر کہے ہوئے مرثیوں اور رجزوں کے سوا ، جنھیں مغربی مذاق کے مطابق بیحد پسند کیا جاتا ہے ، اس میں معیاری قسم کا غلامانہ تتبع اور بے ذوق تقلید کی کثرت پاتے ہیں - ایسا کرنے میں وہ شاعر کا اصل مقصد سمجھنے میں بڑی غلطی کرتے ہیں - شاعر کا یہ مقصد ہرگز نہ تھا کہ وہ کوئی نیا لائحۂ عمل اختراع کرے اور نہ ہی اس کی یہ غرض تھی کہ وہ اپنے سامعین کو اپنی روانئی طبع یا بلند خیالی سے مسحور کرے - اگر ایسا کرنے کا اسے کوئی خیال ہوتا ، تو وہ یقینی طور پر ان کی فہم و فراست کی حدود کو بھی عبور کر جاتا - اس کی غرض و غایت صرف یہ تھی کہ وہ ایک دئیے ہوئے مضمون پر محدود اور مقررہ اصولوں پر کام کرکے ، اس مضمون کے ہر پہلو کو اپنے فن کی مدد سے آراستہ و پیراستہ کرے اور اس طرح حسن بیان ' حسن اسلوب ،

جملوں کی ساخت، محاکات کے اظہار، اور حقائق نگاری میں زور طبع دکھا کر اپنے پیشروؤں سے گونہ سبقت لے جائے۔ قدیم عربی شاعری کا تسلی بخش ترجمہ کسی زبان میں بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کلام میں اختلاف بیان بہت کم ہے اور اس فن کا سارا زور اسی بات میں ختم ہو جاتا ہے کہ اس کلام کو ترجمہ کیسے بغیر کیونکر کہا جائے۔ یہ بات تو ممارست طویلہ اور گہرے مطالعہ کے بعد ہی کہیں جا کر حاصل ہوتی ہے کہ شاعر کی انفرادی حیثیت کی پہچان ہو سکے۔ اس کمال کو حاصل کرنے کے لیے بعد کے زمانے کے عربوں کو بھی مشکلات کا سامنا رہا، چہ جائیکہ اہل یورپ، جنھوں نے اس راز کو سمجھنے کے لیے اپنی زندگیاں ہی وقف کر دیں (اور پھر بھی اس کی تہہ کو نہ پہنچ سکے ہم)۔

ایک مکمل نظم کا معیاری نمونہ قصیدہ یا غزل ہے جس میں عربی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور ان پہلوؤں کو معمولی سے جوڑ توڑ کے ساتھ منضبط کرکے، ایک رسمی نظام کو پیش کر دیا جاتا ہے۔ شاعر کا اصل موضوع خواہ کچھ ہی ہو، اسے نفس مضمون تک رجوع کرنے کے لیے مقررہ منازل طے کرنے ضرور ہیں (البتہ اسے یہ اختیار ہے کہ ان منازل میں سے وہ کسی ایک کو یا اس سے زیادہ منازل کو اختصار سے بیان کر دے)۔

قصیدے کے ابتدائی ابیات میں شاعر کے لیے اس خیال کا اظہار ضروری ہے کہ وہ ایک اونٹ پر سوار ہو کر ایک دو ساتھیوں کے ساتھ کہیں سفر کر رہا ہو۔ چلتے چلتے وہ ایک ایسے مقام پر جا

پہنچتا ہے جہاں اس کے اپنے یا کسی دوست قبیلے نے کبھی عارضی طور پر قیام کیا ہو اور اس وقت کے آثار اب تک وہاں موجود ہوں - وہ اپنے دوستوں سے منت سماجت کرتا ہے کہ آؤ، یہاں کچھ دیر کے لیے ٹھہر جائیں - پھر وہ بڑے الدوہ و غم کے ساتھ ان واقعات کو یاد کرتا ہے کہ کس طرح برسوں پہلے اس نے اپنی زندگی کے بے حد حسین اور پر مسرت ایام اپنی محبوبہ کی معیت میں یہاں گزارے تھے - اب مرور زمانہ کے ہاتھوں مدت ہوئی کہ وہ ایک دوسرے سے جدا ہو چکے ہیں اور اب اس متروک مقام پر غزالان صحرا کلیلیں کر رہے ہیں -

Kratchkowsky کی آزاد تقلید Vostock (م : ۱۰۱)

قِفَا نَبْكِ مِنْ ذِكْرَى حَبِيبٍ وَمَنْزِلِ
بِسِقْطِ اللِّوَى بَيْنَ الدَّخُولِ فَحَوْمَلِ

فَتُوضِحَ فَالْمِقْرَاةِ لَمْ يَعْفُ رَسْمُهَا
لِمَا نَسَجَتْهَا مِنْ جَنُوبٍ وَشَمْأَلِ

وُقُوفًا بِهَا صَحْبِي عَلَيَّ مَطِيَّهُمْ

ٹھہرو (اے میرے دونوں دوستو) آؤ محبوب اور اس کے مسکن کی یاد میں روئیں جو 'دخول' اور 'حومل' کے درمیان ایک ریتلے صحرا میں واقع تھا — اور 'توضح' اور 'مقرات' کے درمیان (اس مسکن کے) آثار ابھی تک بالکل معدوم نہیں ہوئے گو جنوبی اور شمالی ہوائیں برابر چلتی رہی ہیں -

میرے ساتھی اپنے اونٹوں کی مہار موڑ کر میرے نزدیک آ گئے اور ٹھہر کر کہنے لگے 'غم سے نہ مر بلکہ صبر سے برداشت کر - میرا جواب صرف آنسو تھے لیکن ایسے آنسوؤں کا کیا فائدہ جو ریت پر گریں اور ایسی آہیں کس

يَقُولُونَ لا تَهْلِكْ أَسًى وَ تَجَمَّلِ

کام کی، جو تند ہوا میں فنا ہو جائیں۔ (امرألقیس)

نظم کے اس حصہ کو معشوق کے سروپا کے بیان سے اکثر بڑھا دیا جاتا ہے اور اس کے حسن کی خوبصورتی کو کم و بیش تفصیل کے بیان کر دیا جاتا ہے۔

إذ تَسْتَبِيكَ بِذِي غُرُوبٍ وَاضِحٍ
عَذْبٍ مُقَبَّلُهُ لَذِيذِ الْمَطْعَمِ

جب اس نے پہلے پہل مجھے اپنے حسن و جمال کا دیوانہ بنایا (وہ چمک دار موتیوں کے سے دانت اور لعل لب) جن کا بوسہ شہد سے زیادہ لذیذ تھا۔

وَكَأَنَّ فَارَةَ تَاجِرٍ بِقَسِيمَةٍ
سَبَقَتْ عَوَارِضَهَا إِلَيْكَ مِنَ الْفَمِ
أَوْ عَاتِقاً مِنْ أَذْرِعَاتٍ مُعَتَّقاً
مِمَّا تُعَتِّقُهُ مُلُوكُ الْأَعْجَمِ
أَوْ رَوْضَةً أُنُفاً تَضَمَّنَ نَبْتَهَا
غَيْثٌ قَلِيلُ الدِّمْنِ لَيْسَ بِمَعْلَمِ

گویا جیسے کوئی تاجر کوئی نہایت قیمتی عطردان کھولے۔ اس قسم کی خوشبو اس کے منہ سے آتی تھی یا یوں سمجھیے کہ اذرعات کا کوئی پرانا مشکیزہ شراب تھا جسے عرصہ دراز سے شاہان عجم نے محفوظ کر رکھا ہو یا یہ کہ اس کا دھن ایک ان چھوا مرغزار ہے جس کے سبزے کی ذمہ دار وہ بارش ہے جس میں کثافت کم ہے اور مویشی وہاں چرنے نہیں پائے۔

جَادَتْ عَلَيْهَا كُلُّ عَيْنٍ ثَرَّةٍ
فَتَرَكْنَ كُلَّ قَرَارَةٍ كَالدِّرْهَمِ

جس پر متواتر بارش کثرت سے ہوتی رہی ہو اور اس میں کا ہر جوہڑ چمک دار درہم کی مانند گول نظر آئے۔

شیشہ چلنے والی نہریں اس پر آب پاشی اور چھڑکاؤ کرتی ہیں

سَحّاً و تسكاباً فَكُلَّ عَشِيَّةٍ
يَجْرِي عَلَيها الماءُ لم يَتَصرّمِ

وَخَلا الذُّبابُ بِها فَلَيْس بِبارحٍ
غَرِداً كَفِعْلِ الشّارِبِ المُتَرَنِّمِ

تُمْسِي و تُصْبِحُ فوق ظَهْرِ حَشِيّةٍ
وأبِيتُ فَوقَ سَراةِ أَدْهَمَ مُلْجَمِ

اور پانی ہر شام اس میں بہتا ہے
اور یہ سلسلہ کبھی نہیں ٹوٹتا -
اور بھنبھنانے والے کیڑے (اس
وادی) میں بھنبھناتے رہتے ہیں
جس طرح کوئی مست شرابی گا
رہا ہو-
وہ اپنی صبح اور شام ایک اچھے
گدگدے بستر پر بسر کرتی ہے
حالانکہ میں اپنی راتیں ایک لگام
دئیے ہوئے مشکی گھوڑے کی پیٹھ
پر گزارتا ہوں -

اس عاشقانہ تمہید کے بعد جسے اصطلاح میں 'نسیب' کہتے ہیں، شاعر ہوش میں آتا ہے اور اپنے سفر پر آگے روانہ ہوتا ہے اور اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک ماہر فن کی سرگرمی کے ساتھ اپنے اونٹ یا گھوڑے کی تعریف کرتا ہے - اس کی سبک رفتاری کا مقابلہ وہ کسی گورخر، شتر مرغ یا کسی بارہ سنگے سے کرتا ہے لیکن یہ مقابلہ جلد ہی فراموش کر دیا جاتا ہے، کیونکہ سیاق کلام عام حیوانی زندگی یا شکارگاہ کے مناظر کی طرف رجوع ہو جاتا ہے، جو مغربی مذاق کے لیے اکثر اوقات نظم کا نہایت دلکش حصہ ثابت ہوتا ہے -

سفید گائے کا جسم اندھیری رات میں گھرے سمندر کے موتی کی طرح چمکتا ہے جو سلک مروارید سے علیحدہ ہوگیا ہو، اور نور کے تڑکے تک یہی حالت رہتی ہے - صبح ہوتے ہی رات کا سائبان تہہ

کر لیا جاتا ہے۔ پھر وہ حیران ہو کر لڑکھڑاتی ہوئی بھاگ جاتی ہے ...... اب وہ اپنے نزدیک آوازیں سنتی ہے۔ انسانی آوازیں — وہ سہم جاتی ہے، گو اس کو کچھ دکھائی نہیں دیتا : انسان ! آہ وہ انسان جو اس کی تباہی کا موجب ہے! وہ کسی محفوظ جگہ کی تلاش کرتی ہے۔ دن نکلتے تک وہ اپنے آگے پیچھے آوازیں سننے لگ جاتی ہے۔ دشمن کا ہراس اس کے دل میں بڑھتا جاتا ہے۔

تیر انداز ناکام ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ کھلے طور پر اچھے سدھے ہوئے شکاری کتوں کی ڈور چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ کتے گوش بریدہ اور نازک اندام ہیں۔

وہ دوڑ کر نہایت آسانی سے اس کے آگے نکل جاتے ہیں۔ وہ تیزی کے ساتھ مڑ کر انہیں اپنے سینگوں پر لیتی ہے۔ ایسے سینگ جن کی نوکیں سمہری نیزوں سے بھی زیادہ تیز ہیں۔

جس خطرے میں وہ اپنے آپ کو پاتی ہے اس سے وہ خوب واقف ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اگر وہ اپنا بچاؤ کرنے میں چوک گئی تو اسے خاک و خون میں لوٹنا پڑیگا۔ اس لیے اس کا داؤ پیچ سخت غضبناک ہوتا ہے۔

ان کتوں میں سب سے اگلا کتا کساب نام کا تھا۔ وہ اس

نوٹ: مذکورہ بالا اشعار کا ترجمہ مصنف نے لبید (رض) کے قصیدے سے کیا ہے۔ یہ اشعار کا نہایت آزاد ترجمہ ہے، گو مفہوم بڑی لطافت سے بیان کیا، لیکن اصل متن کی عبارت ذرا مختلف ہے و هو هذا :

وَتُضِيْئُ فِي وَجْهِ الظَّلَامِ مُنِيْرَةً ‌ ‌ كَجُمَانَةِ الْبَحْرِيِّ سُلَّ نِظَامُهَا

کو اپنے سینگوں سے مار ڈالتی ہے اور شکاری کتیا اور سخام کو خونا خون کرکے ہلاک کر دیتی ہے۔

اتنی تفصیلات بیان کرنے کے بعد قاعدے کے مطابق شاعر اپنے موضوع کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ بڑے محتاط اور چیدہ الفاظ استعمال کرتے ہوئے وہ اپنے سامعین کے سامنے قبیلہ کی معاشرت کا حال بیان کرتا ہے۔ کبھیں رنگ رلیوں کا ذکر کرتا ہے، کبھیں صحرا میں بجلی کی کڑک کا نقشہ پیش کرتا ہے، کبھیں اپنی شجاعت اور تہور کا تذکرہ سناتا ہے اور کبھیں اپنے قبیلے کے شاندار کارناموں کی تعریف کرتا ہے۔ وہ اپنے مربی یا سرپرست کے گن گاتا ہے اور اسکی سخاوت

حَتّٰی اِذَا انحَسَرَ الظَّلامُ و اَسْفَرَتْ　　بَکَرَتْ تَزِلُّ عَنِ الثَّرٰی اَزْلَامُهَا

تَوَجَّسَتْ رِزَّ الاَنِیسِ فَرَاعَهَا　　عَنْ ظَهْرِ غَیبٍ وَالاَنِیسُ سَقَامُهَا

فَغَدَتْ کِلَا الفَرجَینِ تَحسَبُ اَنَّهُ　　مَوْلَی المَخَافَةِ خَلْفُهَا وَ اَمَامُهَا

حَتّٰی اِذَا یَئِسَ الرُّمَاةُ وَ اَرْسَلُوا　　غُضْفًا دَوَاجِنَ قَافِلًا اَعْصَامُهَا

فَلَحِقْنَ وَ اعْتَکَرَتْ لَهَا مَدْرِیَّةٌ　　کَالسَّمْهَرِیَّةِ حَدُّهَا وَ تَمَامُهَا

لِتَذُودَهُنَّ وَ اَیْقَنَتْ اِنْ لَمْ تَذُدْ　　اَنْ قَدْ اُحِمَّ مِنَ الحُتُوفِ حِمَامُهَا

فَتَقَصَّدَتْ مِنْهَا کَسَابِ فَضُرِّجَتْ　　بِدَمٍ وَ غُودِرَ فِی المَکَرِّ سُخَامُهَا

میں رطب اللسان ہوتا ہے۔ وہ پرمسرت اور فخریہ لہجے میں کسی کامیاب جنگ یا یلغار کی داستان سناتا ہے یا ناصحانہ مگر قنوطی انداز میں صحرا کے فلسفۂ اخلاق پر بحث کرتا ہے۔ الغرض قدیم شاعری اسی قسم کے اظہار خیالات کا گنجینہ ہے۔ کہیں انتقام کے گیت ہیں اور کہیں ہجو کی بھرمار ہے۔ عملی طور پر اس شاعری کی یہی کل کائنات ہے۔ اب یہ فوراً معلوم ہو جائیگا کہ زمانۂ مابعد کے بیاض نویسوں کے لئے یہ بات کس قدر آسان تھی کہ وہ اس ڈھیلے ڈھالے ڈھانچے سے قصائد و غزلیات کے حصے کو علیحدہ کرکے اسے ایک مستقل نظم کی صورت میں پیش کر سکیں۔

یہاں ہم صرف اسی بات پر کفایت کرنا پسند کریں گے کہ مختصر طور پر چند ممتاز شخصیتوں پر بحث کریں۔ صحرائے عرب کے ممتاز شعراء میں نہ صرف زمانے کے لحاظ سے بلکہ بہت سے نقادوں کی رائے کے مطابق سب سے اونچا مرتبہ امرء القیس کو حاصل ہے جو ابتدائی اسلامی توحید پرستوں کے نزدیک جہنم کی آگ کا راستہ دکھانے والوں کا سردار تھا۔ وہ ایک متزلزل سی عرب سلطنت کا اوباش اور جلا وطن شہزادہ تھا۔ اس نے اپنی زندگی کے آخری ایام اسی کوشش میں گزارے کہ وہ کسی طرح اپنے باپ کی موت کا بدلہ لے کر اپنی مفقودہ سلطنت کو بحال کر لے۔ اس کا "معلقہ" جس میں اس نے ایک طوفان کا نہایت حسین بیان باندھا ہے اس کے کمال فن کا ثبوت ہے، جو قدرتی مناظر کے بیان کرنے میں اسے مبدء فیض سے عطا ہوا تھا۔ اس کے اشعار سے حسن و عشق کی کیفیات کے اظہار

کا بھی پتہ چلتا ہے ۔ تاہم اس کی خود غرضی، جو اس کے کلام میں ہر جگہ نمایاں ہے، اس کی نسبت تابط شراً اور الشنفری رہزن شعراء کے کلام میں زیادہ مبالغے کے ساتھ پائی جاتی ہے ۔ امرء القیس کے انتقامی گیت اور شنفری کا لامیہ گویا صحرائی زندگی کی دو شاندار عکس بینیں ہیں ۔ ان دونوں عربی نظموں کا جو بہت مشہور ہیں بار بار ترجمہ ہوا ہے ۔ دوسری نظموں میں تابط شراً نے مختصر مگر جامع اور دل خراش انداز میں اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے و ہو ھذا :

"نہ وہ مسرت کا اظہار کرتا ہے اور نہ شکایت کرتا ہے بلکہ خاموشی سے جو کچھ پیش آئے اسے برداشت کرتا ہے"۔

"وہ اپنے کارناموں اور اپنی آوارگی کے کام کا بڑا مشتاق اور بڑا مجاہد ہے"۔

"وہ دوپہر کے وقت اگر ایک صحرا میں ہوتا ہے تو شام کے وقت تم اسے کسی دوسرے جنگل میں پاؤ گے ۔ گورخر کی طرح وہ دندانہ دار اور سر توڑ چٹانوں کو تنہا عبور کرتا ہے"۔

"وہ ہوا کی طرح کسی جگہ قیام کیے بغیر آگے ہی آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اسے نہ چین حاصل ہے اور نہ وہ سستی کرتا ہے، حالانکہ زور شور کی آندھیوں کے بگولے تیز رفتاری میں اس سے آگے نکل تو جاتے ہیں لیکن آہ سرد بھر کر آخر دم توڑ دیتے ہیں ۔ اس کے پپوٹوں پر نیند کے آثار تو ہیں لیکن وہ ان کو صرف بوجھل خیال کرتا ہے ۔ وہ ہر وقت اس لمحے کے انتظار میں رہتا ہے کہ کب اپنا خنجر نکالے اور کب کثیر التعداد دشمنوں کے سینوں

میں گھونپ کر ان کے دلوں کے خون سے اسے تر کرے "۔

بدوؤں کے اکثر شعراء اپنی شخصیت کو اس قبیلے میں کھو دیتے ہیں جن سے ان کا تعلق ہو، یا جس میں وہ شامل ہوگئے ہوں ۔ ان میں سے ہر ایک اپنی بے پناہ طاقت اور آزادی پر نازاں ہے اور اس فخر کے اظہار میں زمین و آسمان کے ایسے قلابے ملاتا ہے کہ بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے :

مَلَأْنَا الْبَرَّ حَتَّى ضَاقَ عَنَّا   وَمَاءَ الْبَحْرِ نَمْلَأُهُ سَفِينَا

[ہم نے زمین کو بھر دیا یہاں تک کہ وہ ہمارے لیے تنگ ہو گئی اور ہم نے سمندروں کو اپنے جہازوں سے بھر دیا ۔]   (عمرو بن کلثوم)

زہیر کا رنگ علیحدہ ہے ۔ اس کے دیوان کا زیادہ حصہ دو سرداروں کی تعریف کے لیے وقف ہے جنہوں نے بھائیوں کے قتل کے متعلق لڑائی شروع کر دی تھی ۔ اس نے ایک بوڑھے آدمی کی طرح ، اس لڑائی سے علیحدہ رہتے ہوئے، بدوی اخلاقیات کے ماہر ہونے کی حیثیت سے، اپنے ناصحانہ کلام میں ان کے سرداروں کے اخلاقی تصورات کی پوری پوری تشریح کر کے رکھ دی تھی ۔

شعراء کا ایک دوسرا گروہ وہ ہے جو خالص بدو تو بنے رہے مگر یمن کی تہذیب یافتہ اور متمدن برادریوں سے ، بالخصوص ان اقوام سے جو شمال میں آباد تھیں، ان کا رابطہ و تعلق پیدا ہوا ۔ شاہان حیرہ نے یہ معلوم کر لیا کہ شعراء میں وہ لوگ ہیں جو عرب کے عامۃالناس میں ذی اثر ہیں ۔ انہوں نے انہیں اپنے دربار میں بلا بلا کر، بیش قرار انعامات سے ، حوصلہ افزائی کی ، کیونکہ وہ اس بات

کے متمنی تھے، کہ خانہ بدوش لوگوں میں ان کے اثر و اقتدار کی ترقی ہو - یہی طرز عمل حیرہ کے مخالفوں، یعنی شرق اردن کے غسّانی بادشاہوں، نے بھی اختیار کیا، جو نصرانی تھے - وہ بازنطینی تہذیب سے مستفیض ہونے کی وجہ سے کچھ زیادہ مہذب تھے - ان شعراء کے ذریعہ کسی حد تک آرامی تہذیب کے طور طریقے بھی کچھ نہ کچھ خانہ بدوش لوگوں میں رائج ہوگئے - ان شعراء میں سے مشہور ترین شاعر النّابغہ ہے جو ذُبیان کا رہنے والا تھا - اس کے کلام میں اخلاقیات اور ناصحانہ کلام کا عنصر بڑی کثرت سے پایا جاتا ہے، جس سے اس کا ان دونوں درباروں میں مقیم رہنا ثابت ہوتا ہے - اسی وجہ سے شاید یہ روایت مشہور ہوگئی کہ اس نے مسیحی مذہب اختیار کر لیا تھا - یہ تاثرات کچھ عارضی قسم کے ہی تھے، کیونکہ اس سے بعد کے معاصر الاعشیٰ کے کلام میں قرون وسطےٰ کی پیشہ ورانہ غزل گوئی موجود ہے - اس نے اپنے کلام میں اس تہذیب کے تمام عناصر کو جمع کرکے رکھ دیا ہے جو اس وقت عرب میں رائج تھے - اس کی شہرت کا انحصار زیادہ تر اس کی ہجوگوئی اور عیش و نشاط کی غزلیات پر ہے - اس کے کلام کی لطافت اور خوش طبعی، جو اسے شمالی اور جنوبی شاہی درباروں میں شرکت کی وجہ سے حاصل ہوئی، نابغہ کی بلند خیالی اور متانت سے بالکل معرا ہے - اس نکتہ کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہئیے کہ حجاز کے زراعت پیشہ اور شہری یہودی قبائل میں بھی شعراء موجود تھے، لیکن حیرہ کے ماحول کی کچھ مختلف قسم کی شاعری کے مقابلے میں ان شعراء کا کلام

نہایت قلیل مقدار میں محفوظ رہ سکا ہے ۔ البتہ حیرہ کا شعر و سخن
اگلی صدی کے شعر و سخن پر کچھ نہ کچھ ضرور اثر انداز ہوا ۔
ان شاعروں نے سب سے زیادہ تمدنی اور اہم خدمت یہ انجام
دی کہ انہوں نے عرب اور غیر عرب کے درمیانی امتیازات کو اچھی
طرح سمجھ لیا اور اس لیے انہوں نے قبائل کی تنگ حدود سے نکل
کر عرب قومیت کا ایک نیا تصور پیش کر دیا ۔ یہی وہ قومی احساس
تھا جو توسیع کی زبردست تحریک میں اچانک اور بڑے تعجب خیز
طریقہ سے پھوٹ نکلا اور جس کو فوری طور پر ان شہروں سے ، جن کا
نظام زیادہ مضبوط تھا ، ایسی قوت اتصال و ارتباط حاصل ہوئی جس
کی قبائلی تمدن میں نمایاں کمی تھی ۔

٤۔ دور توسیع
(٦٢٢ء تا ٧٥٠ء)

شعراء کے وہ اثرات جن سے خانہ بدوش لوگ اثر پذیر ہوئے شہروں میں بھی بڑی تیزی سے اپنا کام کرتے رہے ' گو اس کی طرز کچھ اور تھی ۔ شہری لوگوں نے ابتدائی زمانے کی قبیلہ بندی کے نظام کو تو قائم رکھا لیکن ان کی وسیع النظری میں اس وجہ سے اضافہ ہو گیا کہ انہوں نے شمال اور جنوب سے تجارتی تعلقات برابر قائم رکھے ۔ حجاز اور نجد کے تجارتی مرکز' تہذیب کے ان عناصر کی وجہ سے ' مرجع انام بن گئے' جن کی ترقی جزیرہ نمائے عرب میں جاری تھی ۔ اس کے علاوہ نصرانی اور یہودی تحریک و تبلیغ بھی ان اثرات کو زیادہ مضبوط کر رہی تھی جو ان لوگوں نے مہذب دنیا سے تعلقات پیدا کرنے کی وجہ سے حاصل کیے تھے ۔ طائف کے ثقفی شاعر اُمیّہ بن ابی الصّلت کے اشعار میں (بشرطیکہ یہ اشعار اسی کے ہوں) اس بد دلی کا اظہار بخوبی واضح ہے جو دانا اور مفکّر لوگوں کے دلوں میں اپنے آبا و اجداد کے خشک توہمات کے متعلق پیدا ہو چکا تھا ۔ گو نجد کی آبادیوں کا اثر عربی ادبیات پر یونہی

خفیف سا ہوا ، لیکن مکہ میں اس اصلاحی نظام کو کافی طاقت حاصل ہوئی جو آخرکار حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بن عبداللہ کی تعلیمات کی صورت میں برآمد ہوا ، جو قبیلہ قریش کے حکمران خاندان کے ایک فرد تھے ۔ آپ کی سوانح حیات میں عہد رسالت کی روایات کی اتنی کثرت ہے کہ آپ کی اسلامی تحریک کے اجرا سے قبل کے حالات بہت کم معلوم ہو سکے ہیں ۔ بچپن کے زمانے سے آپ نے خانہ بدوشوں میں پرورش پائی اور جوانی کی حالت میں آپ سالہا سال تک مراقبہ و مجاہدہ میں بڑے انہماک کے ساتھ مصروف رہے ۔ آخرکار وہ وقت آ پہنچا جب آپ کو اس بات کا احساس کامل ہوا کہ وہ اپنے ہم وطنوں (تمام دنیا — م) کے سامنے خدائے واحد کے جلال و جبروت کا عقیدہ علی الاعلان پیش کریں اور یوم حشر و نشر سے جو یقینی طور پر آنے والا ہے ، لوگوں کو آگاہ کریں کہ اس روز وہ تمام لوگ جنہوں نے اس کے قوانین سے سرکشی کی ہوگی نار جہنم میں ڈال دئیے جائیں گے ۔ دس سال کی پیہم جد و جہد کے بعد آپ صرف چند پکے مومنوں کا ایک گروہ جمع کر سکے ۔ پھر آپ کو سر زمین یثرب کے جھگڑوں کو مٹانے کا موقع مل گیا جن کے ذریعہ آپ پر میدان عمل کی کئی راہیں کھل گئیں ۔ سن ۶۲۲ء کی ایک تاریخ کو اس چھوٹی سی نئی برادری کا ، جس کے ارکان پہلے ہی سے مسلم کہلانے لگے تھے ، نیا سن شروع ہوگیا ۔ آپ نے اپنے پیرووں کی بہت بڑی تعداد کے ساتھ یثرب کی طرف ہجرت فرمائی ۔ اس شہر کا نام اس وقت سے مدینۃ الرسول ہوگیا یعنی شہر رسول ۔ آٹھ سال تک آپ نے

متواتر اهل مکه اور شمال مغربی بدوؤں کے خلاف جہاد کیا اور یکے بعد دیگرے سب پر اپنا سکہ جما لیا ، حتی کہ مکہ بھی سن ۶۳۰ء میں فتح ہو گیا ۔ اس وقت سے تمام مغربی عرب میں آپ کی حکومت بلا شرکت غیرے قائم ہوگئی اور آپ کی زندگی کے باقی ماندہ دو سالوں میں جزیرہ نمائے عرب کے کونے کونے سے وفود اپنا ہدیۂ عقیدت و وفا کیشی پیش کرنے کے لیے مدینے آنے لگے ۔ بعض وفود اس غرض سے بھی حاضر ہوتے تھے کہ باہمی مناقشت کے سلسلے میں ، جن کی وجہ سے ان کے قبائل کی طاقت پاش پاش ہو چکی تھی، آپ کی امداد حاصل کریں ۔

[1]یہ بات آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے بعد ہی حاصل ہو سکی کہ آپ کے وہ تمام مقالات جو انہیں زبانی یاد تھے، ایک کتاب کی صورت میں مدون کیے گئے، جو قرآن کے نام سے مشہور ہے (لغوی معنی ہیں مطالعہ کرنا ، پڑھنا) ۔ اس مجموعے کے معتبر ہونے پر آج تک کسی نے کوئی کھلا شک نہیں کیا ۔ اس کتاب کی عام بے ترتیبی ہی اس کی اندرونی شہادتوں کے علاوہ اس کے متن کی صحت کی شاہد ہے ۔ اس بات کی کہیں کوشش نہیں کی گئی کہ مختلف اجزاء کو کسی تاریخ وار ترتیب کے ساتھ مرتب کیا جائے، یا پھر نفس مضمون کے لحاظ سے اس کی آیات جمع کی جائیں ۔ ابتدائی اور

۱۔ فاضل مصنف کا یہ پیراگراف اسلامی نقطۂ نظر سے سخت قابل اعتراض ہے ۔ اس لیے اس کا مطالعہ مشمولہ تنقیدی و تشریحی نوٹ کے ساتھ کیا جائے جو بطور ضمیمہ نمبر ۲ کتاب کے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے ۔

آخری آیات میں اخلاقی مباحث اور فقہی مسائل کو پہلو بہ پہلو ایک ہی سورت میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اس سے بڑی الجھن پیدا ہوتی ہے۔ مسلمان اور یورپین فضلا نے مختلف آیات کی تاریخی ترتیب قائم کرنے کا کام پورا کیا ہے اور اب اس کا امکان ہے کہ کافی تسلی بخش یقین کے ساتھ اس کا متن دوبارہ جمع کیا جا سکے[1]۔

[چونکہ اس کتاب کا مصنف عیسائی ہے اس لیے یورپ کے مستشرقین کی طرح قرآن کو کلام الٰہی نہیں مانتا بلکہ اسے معاذ اللہ آنحضرتؐ ہی کی تصنیف قرار دیتا ہے۔ اس کے متعلق ایک تنقیدی مقالہ بطور ضمیمہ اس کتاب کے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے جس کے لیے میں اپنے دوست پروفیسر حکیم علی احمد صاحب عباسی کا ممنون ہوں۔ م

مسلمانوں کے نزدیک قرآن پاک کلام الٰہی ہے جو حضرت جبریل علیہ السلام کی وساطت سے لفظ بہ لفظ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم پر نازل ہوا۔ ان کی رائے میں سیاق و سباق، اسلوب بیان یا ترتیب اصول کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن یورپین طالب علم آنحضرتؐ کو محض انسان سمجھ کر اس بات میں خاص دلچسپی لیتا ہے کہ کس طرح ایک حیرت ناک شخصیت کی تدریجی ترقی کرنے کے آثار ظاہر ہوتے چلے گئے، کس طرح آپ کی تعلیمات درجہ بدرجہ ایک نئے مذہب کی شکل اختیار کرکے اطراف و اکناف عالم میں پھیل گئیں[1]۔

۱- ملاحظہ ہو ضمیمہ معنی قرآن -- م۔

قرآن کے ابتدائی حصوں کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کچھ ایسے خیالات میں غلطاں و پیچاں تھے جن کے اظہار میں آپ کو دقت نظر آتی تھی - آپ نہ تو مشاق مقرر تھے نہ آپ کو ایسے الفاظ ملتے تھے جن کے ذریعہ اس نئے پیغام کا اظہار کر سکیں جس کی تبلیغ آپ اپنا فرض خیال کرتے تھے - پیہم ریاضت کے ذریعہ موزوں الفاظ بھی القا ہونے لگے لیکن قرآن کریم میں آخر تک فلسفی تصورات کے اظہار میں خامیاں موجود ہیں - (تنقید کے لیے دیکھیں ضمیمہ ۲) -

آپ کی دوسری مشکل یہ تھی کہ کس قسم کا اسلوب اختیار کیا جائے - ملک کی ادبی زبان اب تک صرف منظوم کلام اور عاشقانہ خیالات کے اظہار کے لیے مقفے نثر کی صورت میں مستعمل ہوتی تھی - عربوں کے نزدیک اظہار خیال کے لیے یہی طریقہ سب سے اعلے مانا جاتا تھا - آپ کے لیے بھی کوئی چارہ نہ تھا سوائے اس کے کہ مقفے نثر کی طرز اختیار کریں (دیکھیں ضمیمہ ۳) -

نزول کے لحاظ سے قرآن پاک کی ابتدائی آیات مختصر اور موثر انداز کی نصیحتیں ہیں جو اکثر اوقات نہایت پر زور اور خوبیوں سے لبریز ہیں - اس اسلوب کے ساتھ ساتھ قرآن پاک میں ادبی صنائع و بدائع کی مثالیں بھی نظر آتی ہیں مثلاً وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوجِ ۝ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُودِ ۝ وَشَاهِدٍ وَمَشْهُودٍ ۝ (۸۵ : ۴)

اہل عرب نے نبی کریم کو شعراء اور کاہنوں کے

زمرے میں شمار کرکے عام طور پر یہ خیال کیا کہ آپ کو یہ سب باتیں کوئی جن بتاتا ہے۔ اس عقیدے کی تردید کے لیے، نیز اس وجہ سے بھی کہ آپ کو زبان پر پورا قابو ہوتا چلا گیا، آپ نے اسلوب تغزل کو بہت کچھ کم کر دیا۔ الہامات (وحی — م) کے موضوعات میں تدریجی تبدیلی کی وجہ سے انداز بیان میں بھی تبدیلی رونما ہوئی۔ پیغمبرانہ تنبیہات، پیش گوئیاں، دینی تعلیمات اور انبیائے سابقین کے قصے بیان کیے گئے ''جو زیادہ تر یہودی ماخذ سے حاصل کیے گئے ہیں''۔ (یہ خیال غلط ہے۔ دیکھیں حاشیہ مشمولہ) بالآخر مدنی دور میں یہ بیان عام موضوعات اور فقہی قواعد پر آ کر ختم ہو جاتا ہے۔ سب سے آخری سورتیں سادہ اور سلیس نثر میں ہیں جن میں کچھ ڈھیلی قسم کی قافیہ بندی بھی پائی جاتی ہے۔[1]

۱۔ مصنف کے نزدیک مدنی سورتیں سادہ سلیس نثر میں ہیں لیکن عرب اس نثر کو کیا سمجھتے ہیں اس کا جواب سیدنا لبید رضی اللہ عنہ سے پوچھنا چاہئے۔ انہوں نے اسی نثر کی تلاوت کو پا کر شعر کہنا چھوڑ دیا تھا۔ سیدنا لبید نے قریباً نوے برس جاہلیت میں گزارے تھے اور اپنے وقت کے شعراء میں استاد کا درجہ رکھتے تھے۔ انہی کا ایک شعر سن کر فرزدق نے سجدہ کیا تھا اور کہا تھا کہ جس طرح لوگ قرآن میں سجدۂ تلاوت کرتے ہیں ایسے ہی میں جانتا ہوں کہ کونسا شعر سجدہ طلب ہے۔ لیکن انہی لبید کا یہ واقعہ ہے کہ جب حضرت فاروق اعظم امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں عامل کوفہ کو لکھا کہ لبید اور اغلب عجلی نے اسلام لانے کے بعد جو اشعار کہے ہوں وہ بارگاہ خلافت میں بھیج دئیے جائیں تو سیدنا لبید نے فرمایا تھا "اللہ تعالے نے سورہ بقرہ اور آل عمران نازل فرما کر مجھے شعر گوئی سے بے نیاز کر دیا ہے"۔

ادبی یادگار کے لحاظ سے ' جو نثر کے اسلوب میں شاندار شاعرانہ انداز لیے ہوئے ہے' اس میں عام ارتقائے ادب کی نسبت بعض خوبیاں تو نہایت ہی شاندار ہیں - مسلمان ہر دور میں متفقہ طور پر اس بات کا اعلان کرتے چلے آئے ہیں کہ کوئی کتاب نہ تو اس کے متن کا مقابلہ کر سکتی ہے اور نہ اس کے اسلوب کا (خود اس کتاب کا دعوے بھی یہی ہے) - مگر پرانے شعر و سخن کی طرح یہ کتاب بھی جتنا اپنے ادبی کمالات کی وجہ سے ممتاز ہے ' اتنا ہی اس کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کرنا بھی

رہا یہودی ماخذ سے قصص کا حصول تو یہ بداہۃ باطل ہے - قرآن یہود و نصاریٰ کو دین میں تحریف کرنے والا اور مقربان بارگاہ الٰہی کی جناب میں گستاخ و بے ادب بتاتا ہے - پھر وہ ان سے کیا اخذ کرتا ' البتہ وہ ان کے خیالات و عقائد و اعمال کی اصلاح فرماتا ہے - یہود نے کلام الٰہی میں تغیر و تبدل کیا اور اپنا تاریخی مواد فراموش کر دیا -

يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ وَنَسُوا حَظًّا مِمَّا ذُكِّرُوا بِهِ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلَىٰ خَائِنَةٍ مِنْهُمْ - (۵ : ۱۶)

انہوں نے کلمات کو ان کی جگہ سے ہٹا دیا (تاکہ غلط مطلب نکالیں) اور (عبرت و موعظت کے لیے جو چیزیں انہیں دی گئی تھیں) ان کا بڑا حصہ وہ بھول گئے اور آپ برابر ان کی خیانتوں پر مطلع ہوتے رہیں گے -

چنانچہ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ عہد جدید اور عہد قدیم کے ابواب اب جعلی قرار دیدئیے گئے ہیں چہ جائیکہ آیات - قرآن نے ان میں سے بہت سے ضروری امور پر متوجہ فرمایا ہے - قرآنی تحکیم کی تصدیق و توثیق مسلمان ہونے والے یہودی و نصرانی علماء سے بھی ہوئی ہے اور موجودہ زمانے کے ذرائع تحقیق و تنقید سے بھی - بعض باتیں آثار قدیمہ کے انکشافات سے سامنے آئی ہیں جن کی تفصیل موجب طوالت ہوگی - اہل علم واقف ہیں -

نا ممکن ہے ، اور اسلام کے راسخ الاعتقاد لوگ اس قسم کی ہر کوشش کو ناپسند بھی کرتے ہیں - ترجمے میں اس کی زبان کی دل کشی پھیکی پڑ جاتی ہے ، نحوی تراکیب کے حقیقی معانی ضائع ہو جاتے ہیں ، فصیح و بلیغ جملے بے ربط ہو کر رہ جاتے ہیں اور جو کچھ باقی رہ جاتا ہے وہ صرف چند بے جوڑ سے تصورات ہی نظر آتے ہیں جن میں نہ تو کوئی فنی خوبی باقی رہ جاتی ہے اور نہ کوئی زندگی - (قرآن پاک خود اس بات پر شاہد ہے کہ اسے کیوں عربی زبان میں نازل کیا گیا - وجہ یہ ہے کہ دنیا کی کوئی اور زبان ادائے محاسن ، اسلوب بیان اور جامعیت کے لحاظ سے اس قابل نہیں کہ وہ مطالب قرآنی کا بوجھ اٹھا سکے — م) -

عربی ادبیات کے ارتقاء پر جو اثر قرآن پاک کا پڑا وہ بے انداز

يَا أَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِّمَّا كُنتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوا عَن كَثِيرٍ

(۵ : ۱۵)

اے اہل کتاب ہمارا رسو[ل] تشریف لا چکا ہے - وہ بہت سـ[ی] ایسی باتیں وضاحت سے ارشـ[اد] فرماتا ہے جو تم نے کتاب مـ[یں] سے محو کر دی تھیں اور بہت [سی] (غیر ضروری) باتوں سے وہ درگـ[زر] بھی فرما دیتا ہے -

حضرت سلیمان علیہ السلام کا کفر ، حضرت داؤد علیہ السلام کا کو سجدہ کرنا ، حضرت لوط علیہ السلام کا شراب پینا ، اور ان کی بنات طاہ[رات] کا اسی سکر کی حالت میں ان سے نسل حاصل کرنے کا اقدام ، فرعون کا [غرق] ڈوب جانا ، حالانکہ اس کی نعش باہر آ گئی اور اب تک محفوظ ہے وغیرہ وغیـ[رہ] بیسیوں باتیں عہد عتیق و جدید میں ایسی مذکور ہیں کہ قرآن حکیم نے ان [کی] اصلاح فرمائی ہے اور حکم دیا ہے کہ یہود و نصاریٰ کی غلط بیانیوں سے مـ[تـ]ـاثر نہ ہوں اور ان کی روایات بیجا سے احتراز کریں -

ہے ۔ گو بیسیوں سال بعد تک عربی میں کوئی کتاب ہی نہ لکھی گئی اور شعراء پر بھی اس کا فوری اثر بہت کم ہوا لیکن یہ قرآن پاک کے گہرے مطالعہ ہی کا اثر تھا کہ عربی ادبیات کی اکثر شاخوں کی ابتداء ہوئی ۔ اس کے علاوہ عربی ادب کا معیار قرآن کی نسبت کافر شعراء نے زیادہ قائم کیا ہے[1] لیکن

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تُطِيعُوا فَرِيقًا مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ يَرُدُّوكُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كَافِرِينَ وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنْتُمْ تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ آيَاتُهُ وَفِيكُمْ رَسُولُهُ ۔

اے ایمان والو! اگر تم ان لوگوں کے کسی طبقے کا اتباع کروگے جنہیں کتاب دی گئی تھی تو وہ تمہیں ایمان کے بعد منکر بنا دیں گے اور تم منکر کیسے ہو سکتے ہو جبکہ تم پر اللہ کی آیات کی تلاوت کی جاتی ہے اور تم میں اللہ کا رسول موجود ہے ۔

ایسی صورت میں قرآنی قصص کا ماخذ یہود کے اساطیر کو کیسے قرار دیا جا سکتا ہے ؟ — م ۔

۱۔ جاہلیت کے لوگوں کو یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے جو لوگ گزر چکے انہیں کافر قرار دینے کے متعلق اختلاف ہے اور یہ ایک علیحدہ سوال ہے ۔ وہ لوگ اپنی دانست میں ملت ابراہیمی پر قائم تھے ۔ امتداد زمانہ سے بت پرستی کی قبیح رسم ان میں رائج ہو گئی ۔ لیکن پھر بھی قادر مطلق خدا کا تصور برابر قائم رہا اور یہ لوگ بتوں اور دیوتاؤں کو موثر بالذات نہیں کہتے تھے ۔ اسی لیے مصنف کا طعن بے جا ہے ۔ مسلمان جاہلیت کے ادبی ورثے کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ادب کی پرورش میں اس سے مدد لیتے ہیں ۔ اسی ادب نے تو یہ ثابت کیا کہ قرآن جیسی کتاب انسانی فکر و نطق سے بالا ہے — م ۔

قرآن چونکہ مسلمانوں کی الہامی کتاب اور دعائیہ کتاب تھی اور اسے روحانی فرحت کے حصول کے لیے پڑھا جاتا تھا ' نیز مسلمانوں کے ہر فرقہ کے نزدیک اسے احکام و قوانین کے استنباط کا اولین منبع سمجھا جاتا تھا — اس لیے تمام دنیائے اسلام میں عربی زبان کو ایک عام فہم زبان کا مرتبہ حاصل ہوگیا ۔ چنانچہ موجودہ باب میں جس دور کا تذکرہ کیا جا رہا ہے اس کا زیادہ حصہ قرآن پاک کے مطالعہ اور ایسے مواد کے جمع کرنے میں صرف ہوا جو تدریجی طور پر اس کی تشریح و توضیح میں مدد دے سکے ۔ اس قسم کے ادب کا خاص عربی ادب پر تو کچھ زیادہ اثر نہیں پڑا ' لیکن اس ادب کی بنیادیں ضرور قائم ہوگئیں جو آئندہ دور کے ابتدائی سالوں کے اچانک جذباتی طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں ۔

اس ارتقائے عظیم کے مختلف مدارج کی تحقیق کرنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان تاریخی واقعات کو مختصر طریق سے بیان کر دیا جائے جو اس کا باعث ہوئے ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے خلفائے راشدین کے عہد میں عربوں کو ایک ہی جھنڈے کے نیچے جمع ہوکر ایک ہی تکبیر بلند کرنے اور ایک ہی مرکزی نظام کے ماتحت اپنی نقل و حرکت کو محدود کرنے کا پہلی دفعہ موقع ملا ۔ وہ عرب سے نکل کھڑے ہوئے اور انہوں نے شام و عراق میں گھس کر وہاں کی غیر مطمئن رعایا کی مدد سے شہنشاہ ہرقل اور زوال

پذیر ساسانیان ایران کی طاقت کے پرخچے اڑا دئیے - اس کے بعد وهاں سے مسلسل حملوں اور یلغاروں کی صورت میں مصر، مشرق ایران ، شمالی افریقه کے ساحلی علاقوں کو فتح کر لیا اور ایک صدی کے اندر اندر ایک ایسی وسیع سلطنت کے مالک بن گئے جس کی حدود پیرینیز سے لے کر پامیر کی بلندیوں تک جا پہنچیں - اس نئی سلطنت کے نظام حکومت کی تشریح تو همارے حیطهٔ مضمون سے باهر هے لیکن افواج کی جو تقسیم جدید بعد میں هوئی اس کے نتائجُ مذهب اسلام اور اس کے ارتقائے ادب کے سلسلے میں البته بے حد اهم هیں - مدینه کا ابتدائی دینی نظام حکومت ایسے وسیع اور عظیم علاقے پر حکمرانی کرنے کے لیے ناکافی ثابت هوا ، اس لیے اس سلطنت کے دنیاوی دارالخلافه کو دمشق میں تبدیل کر دیا گیا ، جهاں بنو امیه حکمران هوگئے - بنو امیه مکه کا ایک خاندان تها - یه لوگ رسول اکرم صلی الله علیه و آله سلم کے قرابت دار بهی تهے، لیکن ان کے سیاسی تصورات توحید پرستوں کے فریق کے خیالات سے بالکل مختلف تهے - تاهم مدینه منوره دینی تعلیمات کا مرکز بنا رها ، اور اسی شهر میں اسلامی علوم و فنون کی بنیاد رکهی گئی (یعنی ان علوم کی جو قرآن پاک کے مطالعه سے متعلق تهے)[1]- اس کے بر عکس مکه معظمه جو فتوحات کی وجه سے مالا مال

۱- عهد مرتضوی میں کوفه دارالخلافت تها - اسے بهی مرکز علم هونے کا شرف حاصل هوگیا تها اور عهد اموی میں دمشق کو بهی - اسی طرح عهد عباسی میں بغداد کو ، بلکه نبی‌ؐ کا نور جهاں پهنچا وهی جگه جگمگا اٹهی -

هو چکا تھا اب بڑی اهمیت حاصل کر چکا تھا - یہ حج کا شہر بھی تھا جہاں خوش حالی کا دور دورہ ہوا گو بعض مومنین اسے پسند نہ کرتے تھے[1] - اس انقلاب سے وسط عرب کا علاقہ بے حد متاثر ہوا -

---

[1] وہ کون سے مومنین تھے جنہیں خوشحالی ناپسند تھی ؟ اللہ تو فرماتا ہے :

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللّٰهِ الَّتِي أَخْرَجَ
لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ
قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيٰمَةِ -

فرما دیجیے وہ کون ہے جو اللہ کی عطا کردہ زیب و زینت کی ان چیزوں کو حرام کر سکے جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں اور پاک و مرغوب غذائیں - فرما دیجیے یہ چیزیں ایمان والوں کے لیے ہیں اس دنیا میں اور خاص آن کے لیے ہیں آخرت میں -

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد مبارک میں بچہ پیدا ہوتے ہی اس کا وظیفہ بیت المال سے مقرر کر دیا جاتا تھا - یہ صورت حال ترقی کرتے کرتے امیر المومنین الولید کے عہد میں اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ تمام مملکت اسلامیہ کے ضعفاء اور فقراء بیت المال سے وظیفہ پاتے تھے اور جتنے نابینا اور مجذوم تھے وہ بھی' حتی کہ ان سب کے لیے بیت المال ہی کے خرچ پر خدام بھی مقرر تھے - تعلیم عام اور مفت تھی - ہر وہ شخص جو قرآن کریم حفظ کرتا تھا بیت المال سے وظیفہ پاتا تھا اور اس کے فرائض یہ تھے کہ نو مسلموں میں دین کی تبلیغ کرے - جگہ جگہ شفاخانے قائم تھے جہاں مریضوں کے علاج کے علاوہ قیام و طعام اور پرہیزی غذائیں بھی سرکاری خرچ پر ملتی تھیں - علماء وفقہاء کو وظائف ملتے تھے تاکہ علم کی اشاعت ہو اور وہ لوگ اسے ذریعہ معاش نہ بنائیں - تمام مملکت میں افراد سے سوال کی ممانعت تھی - جسے ضرورت ہو بیت المال میں درخواست دے - مملکت میں جتنے یتیم اور بیوائیں تھیں ان کی پرورش کا انتظام سرکاری تھا -

اس علاقے کا زبردست عنصر تو افواج قاہرہ میں شامل ہو گیا اور وہ لوگ پھر عرب میں کبھی واپس نہ آئے ۔ ان کی بہت بڑی تعداد عراق عجم میں آباد ہو گئی اور پھر وہاں سے وہ مشرق کی طرف پھیل گئے - کچھ لوگ جو مصر میں منتشر ہو گئے تھے ھسپانیہ تک جا پہنچے- گو انہوں نے بہت بڑی حد تک اپنی خانہ بدوش زندگی کی روایات کو برقرار رکھا ، پھر بھی ان میں سے بہت سے لوگوں نے آخرکار ان ممالک کے شہروں میں مستقل رھائش اختیار کر لی ۔ اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ان تمام قدیم شعراء کے جانشین زیادہ تر عراق و ایران ھی میں پیدا ھوئے اور ان میں سے شاذ ھی کوئی شخص عرب سے تعلق رکھتا تھا ۔

عرب فتوحات کا سب سے زیادہ اھم نتیجہ یہ ھوا کہ آھستہ آھستہ تمام مفتوح اقوام اسلامی برادری میں مدغم ھو گئیں ۔ وہ اپنے ساتھ اپنی نمایاں اور ممتاز تہذیبوں کا تجربہ اور طور طریقے بھی لائے اور اس طرح انہوں نے عرب ادبیات اور تصورات کو ایسے بلند معیار پر پہنچا دیا جو بیچارے عربوں کے حیطۂ امکان ھی سے باھر تھا (یعنی عرب جاھلیت ، کیونکہ اسلام نے عربی اور عجمی قومیت کو مٹا کر اسلامی قومیت کے تصور میں سب کو راسخ کر دیا تھا—م)۔ تاھم ھمارے موجودہ دور کے اختتام تک ان اثرات کا

اس عام خوشحالی میں اگر لوگ شان و شوکت سے زندگی بسر کرتے تھے اور مباح طریقوں سے حصول لذائذ کے درپے تھے تو اس پر کون معترض ھو سکتا ھے ؟ قرآن تو یہی زندگی عطا فرمانے آیا ھے اور دنیا نے یہ زندگی خلافت کے دور میں دیکھی- (السیوطی : تاریخ الخلفاء' بذیل مادہ الولید ' نیز طبری وغیرہ کی کتب تاریخ)۔

احساس بہت کم ہوا۔ چند مستثنیات کے سوا جو کچھ مطالعہ پہلی صدی ہجری میں ہوا وہ عربوں ہی نے کیا، گو جزوی طور پر اس کا باعث ان عجمی لوگوں کا اجتماع بھی تھا جو اسلامی برادری میں شامل ہوگئے تھے اور جن کی وجہ سے اسلامی علوم و فنون کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔

جس زمانے میں قرآن کریم کی تدوین ہوئی، عربی زبان ایک نہایت ہی نامکمل قسم کے خط میں لکھی جاتی تھی جسے وہ لوگ بالکل نہ پڑھ سکتے تھے جنھیں زبان پر پورا پورا عبور حاصل نہ ہو۔ اس وقت اس بات کی فوری ضرورت درپیش تھی کہ قرآن کریم کے متن کو تحریف سے بچایا جائے۔ اس کے لیے پہلے تو ایک مناسب اور موزوں خط کے قیام کی ضرورت پیش آئی اور دوسری جانب قواعد صرف و نحو کی تدوین بھی ضروری سمجھی گئی۔ چونکہ یہ ضرورت سب سے زیادہ ان صوبوں میں محسوس کی گئی جو پہلے ایران کے ماتحت تھے، اس لیے اس قسم کی مساعی کی ابتداء پہلے پہل عراق کے قلعہ بند شہروں ہی میں ہوئی[۱]۔ قرآن کریم کے مطالب سمجھنے کے لیے بھی یہ ضروری تھا کہ اس کی

۱۔ نحو کی باقاعدہ تدوین کا کام سیدنا علیؓ امیر المومنین کے سرکاری فرمان کے مطابق شروع ہوا۔ آپ نے قاضی ابوالاسود دؤلی کو نحو کے قواعد بتا کر حکم دیا کہ اسی کے مطابق قواعد مرتب کریں۔ چنانچہ قاضی ابوالاسود نے عربی قواعد کے کلیات کو کتاب کی شکل میں منضبط کیا۔ انہی کلیات کی بنیاد پر، جو ابتک محفوظ سماعی تھے اور سینہ بہ سینہ آ رہے تھے، بعد کے مسلمانوں نے صرف و نحو پر جامع کتابیں لکھیں اور اسے ایک مستقل علم بنا دیا۔

نحوی ترکیب اور اس کے الفاظ کا مطالعہ بڑے تفحص سے کیا جائے۔ معانی و مطالب کا صحیح مفہوم جاهلیت کے زمانہ کے شعراء کے کلام سے بطور سند پیش کیا جانے لگا، اس لیے ان کے کلام کو زبانی حفظ کرنے کی ضرورت پیش آئی ۔ اس طرح اصول، لغات اور لسانیات کے علوم معرض وجود میں آئے، جن کا انحصار نہ صرف قرآن پر بلکہ زمانۂ جاهلیت کی شاعری پر بھی تھا ۔ قرآن پاک کی آیات کا صحیح مفہوم ان اعمال و اقوال رسول پر موقوف سمجھا گیا، جن کا کچھ نہ کچھ تعلق مضامین قرآن یا متن قرآن سے ہوتا تھا ۔ زندگی اور معاشرت کے طور طریقے بھی اعمال پیغمبر سے اخذ کیے جاتے تھے ۔ چنانچہ اس طریقے سے اسلام کی ادبی سرگرمیوں کا مخصوص موضوع، یعنی علم حدیث، معرض وجود میں آیا ۔ قرآن اور احادیث کے بالالتزام مطالعہ سے دینیات اور فقہ کے مقلوب و نقیض مسائل کی بنیاد رکھی گئی ۔ اگرچہ مدینہ منورہ ابھی تک اس قسم کے علوم کا مرکز تھا لیکن اس بات کی بھی کافی شہادت ملتی ہے کہ عراق اور شام دونوں ملکوں میں ان علوم کی درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا ۔

اسلامی علوم و فنون کی دو شاخیں آگے جاکر مل گئیں اور ان کے ذریعہ ایک نئے علم یعنی علم تاریخ کی بنیاد قائم ہوئی اور اس طرح ان علوم کی حدود کہیں زیادہ وسیع ہوگئیں ۔ اس کے ساتھ ھی ساتھ لسانیات کے مطالعہ کے سلسلے میں، زمانۂ جاهلیت کے عرب کی تاریخ کی تحقیق و تدقیق کی بھی کچھ ضرورت محسوس ہوئی

اور قبائل کے حسب و نسب کے شجروں کی تحقیقات بھی لازمی سمجھی گئی - جوں جوں ان چیزوں کی مانگ زیادہ ہوئی ان کے لیے ضروری مواد بھی مہیا ہونے لگا - ایسے قصے جن سے عربوں کی قدیم تاریخ اور ابتداء کا پتہ چل سکے، قدیم روایات اور مبہم افسانوں میں سے گھڑ لیے گئے اور غالباً ان قصوں میں یہودی، نصرانی مآخذ کی بھرتی کر لینے کے علاوہ بہت سی ایجاد بندہ بھی کی گئی - اس قسم کی بہت سی تصانیف جو عربوں نے مرتب کیں دنیاوی ماحول میں بے حد مقبول ہوئیں، بالخصوص شاہی درباروں میں ان کا بڑا چرچا تھا - اس کے برعکس علم حدیث میں بہت سا تاریخی مواد بھی شامل ہوگیا جن میں غزوات نبی کا بہت زیادہ حصہ شامل تھا - علمائے دین کی مخالفت کے باوجود بہت سے طلباء اس قسم کی تاریخی احادیث کا علیحدہ مطالعہ کرنے لگ گئے اور اس دور کے خاتمے سے قبل، اس موضوع پر ابتدائی کتابیں قصے کہانی کی کتابوں کے مقابلہ میں زیادہ معتبر تھیں اور یہی وہ کتابیں تھیں جن میں سے بعد کے زمانے کا علم تاریخ منصۂ شہود پر آیا -

ان علمی سرگرمیوں کے ادبی باقیات کا سوال ہمیں نظر انداز کردینا چاہیے، کیونکہ اس منزل پر ساری تعلیم زیادہ تر زبانی ہوا کرتی تھی اور اس زمانے میں قرآن کریم کے سوا کسی اور چیز کو ضبط تحریر میں لانا ـ حد معیوب سمجھا جاتا تھا - یہ امتناع، دینی تعلیم کے حق میں بے حد مؤثر ثابت ہوا اور صرف دینی علوم ہی کی تعلیم سب سے زیادہ رائج ہوگئی - بایںہمہ

فی طور پر احادیث اور شعرو سخن کے چھوٹے چھوٹے مجموعے تیار ہوتے ہی رہے ۔ ان میں کم از کم ایک مجموعہ اب تک محفوظ بھی ہے ۔ جب بعد کی تاریخی تصانیف مین سارا مواد شامل کر لیا گیا تو اس دور کی تاریخی اور نیم تاریخی کتابوں کی اشاعت قدرتی طور پر بند ہوگئی ۔ اس بات کے امکانات بھی موجود ہیں کہ اس ابتدائی دور میں ارتقائے ادب میں ایک رکاوٹ یہ بھی پیش آئی ہو کہ اس وقت نثر نویسی کا فن ادبی واسطہ کے احاظ سے ابھی عالم طفولیت میں تھا ۔ قرآن کریم اپنے مخصوص طرز بیان اور دینی وجوہ کی بناء پر بطور نمونہ پیش نہ کیا جا سکتا تھا اور دوسرے ادب کی تاریخ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نثر نویسی کا قدرتی اسلوب طویل تجربوں کا نتیجہ ہے ۔

اس دور کے شعر و سخن پر غور کرتے وقت ہم اپنے آپ کو ایک بالکل مختلف ماحول میں پاتے ہیں ۔ اسلام کی دن دونی رات چوگنی ترقی نے پرانی قسم کی شاعری پر بہت برا اثر ڈالا ۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم کا رویہ بھی اس قسم کی شاعری کے سخت خلاف تھا، کیونکہ آپ کا مقصد ہی یہ تھا کہ کفر آمیز شاعری کی پشت پر جو مجلسی طاقت موجود ہے ' اسے بالکل تباہ کر دیا جائے ۔ گو یہ امر مسلمہ ہے کہ آپ کے دربار میں بھی حسان بن ثابت رض جیسے شاعر موجود تھے، جن کے اوسط درجے کے اشعار محض آپ ہی کے تعلق کی وجہ سے محفوظ رہ گئے ہیں اور ان کے کلام سے زیادہ اچھا کلام تلف ہو چکا ہے ۔ ابتدائی زمانے کے مسلمان

ور علمائے دین بھی نبی کریمؐ کے اس اصول پر قائم رہے - یہ بات بے حد تعجب خیز ہے کہ اسلام کی پیدائش اور اس کی توسیع کے زمانے میں شاعروں کی اس قوم میں کوئی شاعر ہی پیدا نہ ہوا اور اسلامی تحریک کا تذکرہ پرانی شاعری کی طرز پر کعب رضؓ کے قصیدے کے سوا اور کہیں نہیں ملتا - کعب مذکورہ بالا زہیر کے فرزند تھے جو اپنے زمانے کا بہت بڑا ناصح شاعر ہو گزرا ہے - صرف یہی نہیں، بلکہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ عرب کے بڑے بڑے شعرا بھی، جو عرب کے سرگرم شعراء میں شمار ہوتے تھے، بالکل خاموش ہو گئے - لبید رضؓ جن کے کلام میں وہ سارا مواد موجود ہے جسے قدیم عرب زندگی اور معاشرت کا بہترین نچوڑ کہا جا سکتا ہے اور جن کا قصیدہ معلقات میں بھی شامل ہے، سنہ ہجری کے شروع ہونے کے بعد تیس سال سے زیادہ عرصہ تک زندہ رہے، لیکن اسلام قبول کر لینے کے بعد انہوں نے کبھی کوئی شعر نہ کہا -

تاہم زیادہ تر عرصہ گزرنے نہ پایا تھا کہ وہ فطرت جو طبایع میں سرایت کر چکی تھی پھر ابھرنے لگی - اس دفعہ عرب میں نہیں بلکہ عراق میں قدیم شاعری، اپنی روایتی آب و تاب اور قدیم دستور کے مطابق، پھر ظاہر ہو گئی، البتہ اس کے لب و لہجہ اور ذوق و شوق میں نئے مذہب کی کچھ جھلک ضرور موجود تھی - علمائے دین نے اسے ممنوع قرار دیا، لیکن بنی امیہ کے شاہی دربار اور عرب امراء نے ایسے شعراء کی بڑی آؤ بھگت کی اور وہاں وہ اپنے مربیوں کی شان میں اس طرح قصائد پڑھنے لگ گئے، جس طرح

حیرہ اور غسان کے شاہی درباروں میں ان کے آبا واجداد قصیدہ خوانی کیا کرتے تھے، یعنی کبھی ان کے قبائل کی مدح سرائی کرتے اور کبھی ان کے حریفوں کی ہجو گوئی۔ اپنے فن کے تین ماہر جو اسلوب اور اصول فن کے لحاظ سے جاہلیت کے شعراء سے کم نہیں، اخطل، جریر، اور فرزدق تھے۔ یہ سب کے سب ایک دوسرے کے ہمعصر تھے۔ پہلا تو ایک نصرانی قبیلے کا فرد تھا اور اس لحاظ سے بڑی مستعدی کے ساتھ بنی امیہ کی ملازمت کرنے پر آمادہ ہو گیا کہ دین پرور گروہ کی مخالفت کرے۔ دوسرے اور تیسرے کو شہرت اس وجہ سے حاصل ہوئی کہ انہوں نے باہمی رقیبانہ مناقشت کے سلسلے میں اپنا اپنا زور کلام دکھایا جن کی وجہ سے ایک زمانہ تو ایسا گزرا کہ مشرقی صوبوں میں عرب لوگ دو علیحدہ علیحدہ گروہوں میں تقسیم ہو گئے لیکن قصیدہ گوئی کا رواج رو بہ انحطاط تھا۔ نئے حالات کے ماتحت پرانے دستور کی پابندی، جس سے صحرا کی فضا بھی بھر پور ہو چکی تھی، آخر کار اس کے لیے پھانسی کی رسی ثابت ہوئی۔ مشکل یہ آن پڑی کہ پرانی طرز کے قصیدے میں معمولی تبدیلی کا امکان بھی نہ تھا۔ یا تو اسے اپنی پوری اور مکمل صورت میں قائم رکھنا پڑتا تھا یا بالکل ہی نئی طرز اختیار کرنا پڑتی تھی۔ اموی دور کے اختتام کے قریب قصیدہ خوانی کا رواج شعر و سخن کا زندہ پرزہ ہونے کے لحاظ سے تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ اسے صرف ایک فرسودہ اور کہنہ دستور مشق کے طور پر لکھا پڑھا جاتا تھا۔ اس میں دقیانوسی خیالات اور

تصورات کا اظہار ہوتا تھا ' جو قدیم ترین زمانے کے ترانوں یا گیتوں سے اخذ کر لیے جاتے تھے - مثال کے طور پر ذوالرمہ کے کلام ہی کو لے لیجیے جسے خاتم الشعراء کے لقب سے تعبیر کرتے ہیں - ویسے تو قصیدہ کا وجود قائم رہا اور اب بھی موجود ہے لیکن اس کا وجود خالصۃً ماہرین لسانیات کی فضیلت مآبی کے لیے وقف ہے -

اس قسم کی شاعری سے آزادی حاصل کرنے کے سلسلے میں پہلا قدم مکہ کی اصلاح یافتہ فضا میں اٹھایا گیا - یہ ممکن ہے کہ اس قسم کی تحریک ایرانیوں کی جانب سے ہوئی ہو یا یونانی مغنیوں کی طرف سے ' جو یہاں کے امیر کبیر رئیسوں کی خدمت گزاری میں جوق جوق جمع ہوگئے تھے - غیر حالات کچھ بھی ہوں ' قصہ یہ ہوا کہ قصیدہ کے نسیب سے غزل نے خود مختار نظام کی حیثیت سے نشو و نما پائی - غزل گوئی کا شاندار استاد اور دور اموی کا مشہور ترین شاعر عمرو بن ابی ربیعہ (متوفی نواح سن ۷۲۰ء) مکہ کا ڈان جوان اور عرب اور ممالک مشرق کا اووڈ تھا - اس کے اشعار میں امرء القیس کے شہوانی جذبات اور بعد کے زمانے کے جوشیلے جذبات کی بجائے لطیف حسیات کی ترجمانی کی گئی ہے - اس کے کلام کی زبان نہایت سادہ اور سلیس ہے - اس نے خشک زاہدوں کی ہجو گوئی کی اور اس جرم کی پاداش میں اسے کئی مرتبہ جلا وطن ہونا پڑا لیکن اس کے ہمعصر اور بعد کی نسلیں ' دونوں اس کی پر کیف جوانی ' اس کے کلام کی تازگی اور شجاعت کے جذبات سے بہت

اثر اندوز ہوئیں :

۱ يَـا مَنْ لِقَلْبٍ مُتَيَّمٍ كَلِفٍ
يَهْذِيْ بِخَوْدٍ مَرِيْضَةِ النَّظَرِ
تَمْشِي الْهُوَيْنَا اِذَا مَشَتْ فُضُلاً
فَهْيَ كَمِثْلِ الْعُسْلُوْجِ فِي الشَّجَرِ
مَا زَالَ طَرْفِيْ يَحَارُ اِذْ بَرَزَتْ
حَتَّى الْتَقَيْنَا لَيْلاً عَلَى قَدَرِ

قصیدے کے دوسرے حصے بھی اسی طرح مست ترالوں، شکار کے گیتوں اور اسی قسم کے اشعار کی شکل اختیار کرکے ترق کر گئے - اس فن کے بہت سے ماہر شعراء میں سے یہاں دو کا ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے - مجنوں مایوس، جس کا عشق لیلی

۱- ترجمہ از W. G. Palgrave - لیکن یہ ترجمہ غلط ہے - اسے آزاد ترجمہ بھی نہیں کہا جا سکتا - اشعار کا واقعی مطلب یہ ہے :

" آہ وہ دل جو عشق میں رسوا ہوا اور محبت میں غرق ہے
'چشم بیمار' حسینہ سے گفتگو اس کا شغل ہے
وہ جو چلتی ہے تو سادہ لباس میں آہستہ خرامی سے
اور ایسی نازک ہے جیسے کسی درخت کی لچکیلی ٹہنی
جب وہ سامنے آئی تو میں حیرت سے تکتا رہ گیا
یہاں تک کہ مقررہ وقت پر، ہم ایک رات مل لیے۔"

بعد کے عاشقانہ شاعروں کا موضوع خاص بن گیا، اموی خلیفہ ولید ثانی جو زیادہ تر حیرہ کی پہلی روایات کے مطابق اپنے ساق ناموں کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ولید کی (مبینہ) اوباش زندگی سن ۷۴۳ء میں ایک بغاوت کی نذر ہوئی اور اس واقعہ کے بعد نہ صرف اس خاندان کا زوال شروع ہو گیا بلکہ اسلامی تاریخ اور عربی ادبیات کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

۵- عہد زرّیں

(سنہ ۷۵۰ء تا ۱۰۵۵ء)

فصل ۱ - (۷۵۰ء تا ۸۱۳ء)

جس نئے خاندان نے اسلامی دنیا کی عنان حکومت سن ۷۵۰ء میں سنبھالی وہ عباسی تھے - ان کے اس اعزاز و اقبال کی وجہ یہ تھی کہ توحید پرستوں اور موروثی حقدار عرب گروھوں کا آپس میں اتحاد ھو گیا اور انھیں ایرانیوں اور دوسری رعایا کی تائید بھی حاصل تھی اور کچھ نہیں تو کم از کم خود غرضی نے انھیں اس بات پر مجبور کیا کہ وہ دینی علوم و فنون کی سرپرستی کریں اور اس کے ساتھ ھی اپنی ایرانی اور آرامی رعایا کی استعداد علمی کی حوصلہ افزائی کریں - پوری تین صدیوں تک خلافت اور اس کے صوبائی درباروں کا متواتر یہی دستور رھا ، حتّٰی کہ ان مقامی ایرانی اور عرب خاندانوں کا بھی جنھوں نے عباسیوں کی بیخ کنی کر دی ، اب نیا دارالخلافہ بغداد علوم و فنون کا گہوارہ بن گیا - ایک عرب مورخ لکھتا ھے کہ یہ (بغداد) ایسی منڈی تھی جہاں علم و فن کا مال آتا تھا اور یہاں دانش و بینش کی ایسے تلاش ھوتی تھی جیسے ایک آدمی اپنے آوارہ اونٹوں کو تلاش کرتا ھے - اس

مال کا جو نرخ اس منڈی میں مقرر ہوتا تھا اسے ساری دنیا قبول کر لیتی تھی۔ علمی سرگرمیوں کے اچانک ذوق و شوق کا پودا جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، اس سے پہلے دور میں ہر جگہ ایک ہی وقت میں اپنی جڑیں پکڑ چکا تھا۔ ساری سلطنت کے ایک نظام حکومت اور ایک ہی زبان کی آغوش میں آ جانے کے باعث اور اس کے بعد مذہب اسلام کی دوسری رعایا میں توسیع ہو جانے کی وجہ سے بنی امیہ نے علم و فن کی ترقی کے ایسے مادی اسباب پیدا کر دیے تھے، جس کا فائدہ ان کے جانشینوں نے اٹھایا۔ وہ مواد جسے فطرت انسانی کا مطالعہ کرنے والی کوئی تجدیدی تحریک استعمال کرتی، پہلے ہی سے منظم ہو چکا تھا۔ نئی تہذیب کے شگوفے بھی پہلے ہی پھوٹ چکے تھے۔ لیکن عباسی تاجداروں نے اپنے تحمل اور اپنی سرپرستی سے اسے بہت زیادہ امداد دی اور اس کی شان و شوکت کو بڑی حد تک بڑھایا۔

اس زمانے سے ہم دیکھتے ہیں کہ پہلی رعایا بھی زندگی اور ادب کے ہر شعبے میں عربوں کے پہلو بہ پہلو عملی حصہ لینے لگی اور اپنے ساتھ اپنی تہذیب کی وہ ممتاز خصوصیات بھی لائی جس سے اسلامی ادب پوری طرح مالا مال ہو گیا۔ اسکندر اعظم کے زمانے سے مشرق بعید کے تمام مہذب ممالک یونانی تہذیب و تمدن سے گہرے طور پر اثر پذیر ہو چکے تھے۔ بعد کے عملی نتائج اور رد عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ یونانی تصورات کی ایک علیحدہ اور مخصوص علمی شاخ نکل آئی جس میں فلسفۂ اسکندری اور مشرق

مسیحی تفرقہ بازی کا اظہار ہونے لگا - چوتھی صدی کے یونانی فلسفہ دان اور ان کے شارح، نجومی، طبیب اور دوسرے سائنس دان حضرات کی تصانیف کا ترجمہ شامی زبان میں ہونے لگا اور ملک شام اور عراق کی مسیحی خانقاہوں کے مدارس میں ان علوم کی باقاعدہ درس و تدریس ہونے لگی - شمالی عراق میں ابھی تک ایک کافر قوم آباد تھی جنہیں صابئی کہتے تھے - انہوں نے اسلامی ادب اور علم و فن کی بڑی خدمت کی - مصر میں فلسفہ، طب اور علم ہیئت کے مدارس گو بہت بری طرح کمزور اور کم ہو چکے تھے، لیکن پھر بھی ان میں خاصی سرگرمی باقی تھی اور ان کی وجہ سے مسلمانوں کو آخری دو علموں میں ترقی کرنے کا بڑا موقعہ ملا - اس یونانی ماحول کی بدولت غناسطی (Gnostic) طور طریقوں کو بھی پنپنے کا موقعہ ملا جو مختلف مذاہب کے فلسفے اور دقیق مسائل کو وسیع پیمانے پر یکجا کرکے اپنا علیحدہ فلسفہ بنا لیتے ہیں - ان لوگوں کے عقائد میں ثنویت اور فیثاغورث کی تعلیمات کا اثر پایا جاتا ہے -

آرامی اور یونانی اقوام نے اسلامی علم و فن اور فلسفے کی مذکورہ بالا خدمت کی - ان کے مقابلے میں ایرانیوں کا حصہ کچھ زیادہ اہم نہ تھا - ساسانیوں کی سلطنت چونکہ یونانی تہذیب کی عام رو سے منقطع تھی اس لیے وہ اس کی جگہ بہت تھوڑا علمی مواد پیش کر سکی - یہ سچ ہے کہ بعد کے زمانے میں ایران میں ایک ادبی اور قومی تحریک ضرور شروع ہوئی جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ عربوں

کے مقابلے میں پرانی ایرانی تہذیب کو از سر نو پوری ترقی دیں اور اس بات کا دعوے کریں کہ اسلامی تہذیب میں جو چیز قابل قدر ہے وہ سب خالص ایرانی ماخذ سے حاصل کی گئی ہے لیکن ایران کا ملک اس زمانہ میں علماء اور امراء کے تشدد اور تعدی کے بوجھ سے کراہ رہا تھا اور اپنی حفاظت و صیانت کے لیے اسے ہمیشہ شمشیر بکف رہنا پڑتا تھا - اس لیے ایرانیوں کو ادبیات کی طرف متوجہ ہونے کا کافی موقعہ نہ ملا اور اگر اس ملک کے ادبی باقیات پر غور کیا جائے تو جو تھوڑا بہت کام اس سلسلے میں ہوا بھی ، تو وہ مذہبی اور فقہی قسم کا تھا یا عہد عتیق اور شاہی خاندانوں کے بانیوں کے کچھ روایتی افسانے تھے - البتہ پائے تخت کے قرب و جوار میں یونانی اثرات موجود تھے جن کی نشر و اشاعت نسطوریوں نے کی اور ان مساعی کے نتیجے میں جندی شاپور کا مدرسہ قائم ہوا جہاں یونانی فلسفہ اور سائنس کی تعلیم زیادہ تر نسطوری عیسائی دیا کرتے تھے - ان کے ساتھ ہی ہندی فلسفے اور سائنس کی کتابوں کے تراجم ہوئے اور ان کی تعلیم بھی دی گئی - بعض ایرانی عناصر جن میں زرتشتی اور مانوی دونوں دبستانوں کے لوگ شریک تھے ، انہوں نے دوسروں کے ساتھ مل کر ایک مخصوص قسم کا متحدہ فلسفہ قائم کیا - اس دبستان کی تعلیمات کا اثر عراق میں قدرتی طور پر زیادہ ہوا جہاں ابتدائی غناسطی فلسفے کے اعتقادات سے مختلط ہو کر اس فلسفے نے اسلامی تعلیمات پر بہت برا اثر ڈالا - اسلامی اقوام میں ایران کی ایک اور قوم نے زیادہ مضبوط ہندی فلسفے کو جاری کیا - یہ فلسفہ اور

بھی زیادہ مخلوط قسم کا تھا اور باختریہ اور سغدیانہ کے بدھ مت سے اس کا ملت سے قریبی تعلق تھا ۔ بہر حال عام طور پر مسلمہ نظریہ یہ ھے کہ اسلامی تہذیب اور مذھبی خیالات یا مذھبی ادبیات کی شاندار ترقی کا باعث ایرانی ھی تھے اور اس ادب سے وہ پہلو نمایاں ھوتے ھیں جو سامی خیالات کے مقابلہ میں آریائی رد عمل کا نتیجہ ھیں ۔ لیکن یہ نظریہ بعض مخصوص حالات کے پیش نظر ضرورت سے زیادہ عمومیت کے ساتھ پیش کیا گیا ھے ۔ ایران کے اندر اس زمانے میں بھی آریائی تہذیب و ثقافت کی نسلی نجابت بہت کم نظر آتی تھی (قب Massignon : *Lexique de la Mystique*)۔ ادبیات کی صنف میں ایران نے جو حصہ لیا ھے وہ ادبی سائنٹیفک یا فلسفے کی قسم کا نہ تھا بلکہ وھاں کے باشندوں کی قدرتی قابلیت و ذکاوت طبع ، ان کی قوت جاذبہ ، اور مذاق صنعتگری نے اسلامی محرکات کے تحت نہایت اعلیٰ قسم کی نکتہ رسی کا اظہار کیا ۔

اب یہ بات واضح ھو گئی ھوگی کہ کس طرح شاھی خاندان کی تبدیلی کی وجہ سے عربی ادب اچانک سنہری دور کی منزل تک پہنچ گیا ۔ اس زمانے تک تو اسلامی علم و فضل کی تعمیر صرف عربوں ھی نے ایک اصلی تجویز کی بنیاد پر کی تھی جس کے مآخذ پر قدیم تہذیب کے مراکز کا بلا واسطہ اثر تھا ۔ پہلے عباسی خلفاء کے ادب نواز دربار میں یہ ادب غیر ملکی دبستانوں کے مقابلے پر آ گیا ۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اھم بات یہ تھی کہ اس اسلامی فلسفے کا مطالعہ وہ لوگ کرنے لگے جو نسلاً بعد نسل یونانی فلسفے

کی مشرقی فروعات کے دلدادہ چلے آتے تھے ۔ ابتدآء اس کا نتیجہ اس سے مختلف نہ تھا جو یونانی ادبیات کے یورپ میں دوبارہ اجرا کی وجہ سے نشاۂ ثانیہ کی صورت میں نکلا تھا ، لیکن بعد میں علم و فن کی یہ دونوں ندیاں آپس میں ٹکرا گئیں اور ان میں سے ہر ایک حصول تفوق کے لئے مشتعل ہو کر متصادم ہونے لگی - اس تصادم کا آخری نتیجہ زیادہ عرصے تک مشتبہ نہ رہا کیونکہ اس جوش و خروش میں مخصوص اسلامی علوم و فنون کے طور طریقوں ، نظریوں اور اسلوب میں کچھ تبدیلیاں ضرور آگئیں ۔ عرب ، شام ، مصر اور ایران کے علماء کو جو اس وقت تک اپنے تنگ علاقائی ماحول میں مقید تھے ، نشر و اشاعت کی کھلی آزادی مل گئی اور بغداد اور دوسرے مقامات کے تعامل سے اسلامی ادبیات کا پودا نشو و نما پا کر بارور ہوا ۔ علم و فن کی ترقی کا جو کام بھی کسی جگہ ہوتا اس کی نشر و اشاعت اسلامی دنیا کے کونے کونے میں ہو جاتی تھی اور ہم دیکھتے ہیں کہ ہسپانیہ میں اساتذۂ مشرق نے مدارس قائم کئے اور ایران میں ان لوگوں نے درس تدریس کا سلسلہ جاری کیا جنھوں نے بغداد اور مصر میں تعلیم پائی تھی ۔

ان تمام غیر ملکی دبستانوں میں سے یونانی دبستان کا اثر بہت زیادہ اور اہم تھا ۔ عربی ادبیات کے ارتقا کی تفصیلات میں جانے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ یونانی اور یونانی قسم کے فلسفے کے کون سے ایسے تصورات تھے جنھوں نے اس ادب کی ترقی میں سب سے بڑا حصہ لیا ۔ مسلمانوں نے براہ راست یونانی ادب سے استفادہ نہیں کیا

(جیسا کہ یورپین لوگوں نے دور نشاۃ ثانیہ میں کیا تھا) بلکہ انہوں نے یہ علوم و فنون شامی زبان کے ترجوں کے ذریعہ حاصل کیے۔ سب سے زیادہ ہیجان بلا شک و شبہ پورفیرئیس (Porphyrius) کی تصنیف ایسا غوجی (Isagoge) اور ارسطو کی ارغنون (Organon) نے پیدا کیا۔ یہ کتاب عملی طور پر پوری کی پوری اپنا لی گئی اور اسلامی مدارس میں اب تک اس کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے بعد یونانی فلسفے کی باری آئی لیکن اس کی تعلیم کچھ نامکمل طریق ہی سے ہوتی رہی۔ اس کا ذکر بعد میں آئے گا۔ حکیم جالینوس کی یونانی طب اور ایجینہ کے پال (Paul of Aegina) کے اصول طب اور یونانی طبیعیات اور علم ریاضی وغیرہ اسلامی تعلیمی نصاب کے علوم و فنون میں بنیادی طور پر شامل کر لیے گئے۔ لیکن عرب لوگ کلی طور پر یونانی ادبیات سے واقف نہ ہوئے۔ وہ اس ادب کی ذہنی اور وجدانی صفات سے بالکل بے خبر رہے۔ انہیں صرف اس کے مادی حقائق اور نظریہ ہی سے سماعی مناسبت رہی۔ یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ آیا محض تنگ نظری ہی عربی ادبیات میں رچ گئی تھی جس کی وجہ سے عربوں نے متن کو سمجھنے اور اس کی روح سے اعراض کرنے کو مناسب سمجھا جس کے ذریعہ وہ یونانی ادب کے محاسن کو سمجھ سکتے بشرطیکہ انہیں یونانی زبان کا ذرا وسیع علم حاصل ہوتا۔ بہر حال یوں سمجھ لینا چاہیے کہ انہیں اس موقع سے مستفید نہ ہونے دیا گیا۔ ان کے ہاتھ پاؤں قدیم اصول و عقایدکی رسیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ ان کا دارومدار امراء اور بادشاہوں کی سر پرستی پر تھا اور وہ اپنے زمانۂ ماضی کے

احترام کے لیے مجبور تھے جس کی رو سے شاعر یا فلسفی کو اپنی شخصیت نسل کی سوروثی روایت کے مقابلے میں قربان کر دینی پڑتی ہے۔ اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ عربی ادبیات میں شاید ھی کوئی ایسی تصنیف ھو جو اپنے ماحول میں سر بلندی اختیار کرکے نبی لوع انسان کے علم ادب میں ایک معیاری شاھکار ھونے کا دعوے کر سکے (فاضل مصنف ابن خلدون، ابن رشد اور غزالی وغیرہ کی معرکہ آرا تصانیف سے دانستہ چشم پوشی کر رھا ہے)۔

اس دور کا کل زمانہ قدرتی طور پر چار حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں تو خلیفہ ھارون الرشید کے عہد تک کا زمانہ ہے جنہوں نے ۸۰۹ع میں وفات پائی۔ یہ زمانہ عربی ادبیات کے شاندار ارتقا کا زمانہ ہے۔ اس کے بعد المامون (م ۸۳۳ع) اور ان کے جانشینوں کا زمانہ ہے جو یونانی اثرات کے اوج و عروج کا دور ہے (یہ زمانہ ان علوم کی تحصیل کا تھا؟ تنقید کا زمانہ بعد میں آیا—م)۔ ۸۵۰ع سے ۹۵۰ع تک کے عرصے کے عربی ادب میں کٹر عقاید (یعنی صحیح اسلامی عقائد) کے ردعمل کا اثر غالب ہے۔ ان سب تحریکات کا مرکز بغداد تھا لیکن بعد کی صدی میں مرکزی انقلابات کے باعث بہت سے مقامی مراکز دعوے کرنے لگے کہ تفوق میں وہ دارالخلافہ کے حریف ھیں۔

یہی ایک قدرتی بات تھی کہ ادب کی فروعات جو سب سے پہلے نمایاں ھوئیں ان کا زیادہ قریبی تعلق اس مطالعہ پر مبنی تھا جس کی ابتدا بھی بنو امیہ کے عہد حکومت میں ھو چکی تھی۔ عملی طور پر ابتدائی زمانے کی تمام نثر کے اصلی مآخذ یا تو مطالعہ و تحقیق احادیث

پر مبنی تھے یا علم لسانیات پر۔ تاہم یہ اس اصطلاح کے تنگ حلقے میں محدود نہ تھے بلکہ اس ادب کی اساس وسیع تر سرگرمیوں پر قائم کی گئی تھی۔ ماہر لسانیات کے ماحول میں خاص طور پر ادبی نثر نے عربی زبان میں جو فروغ پایا وہ واضح موزوں اور صحیح تلفظ کے ساتھ تھا۔

اس میں شک نہیں کہ عربی لسانیات کا علم قرآن کریم ہی کے مطالعہ سے پیدا ہوا۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ اس علم کے اصول و قواعد کی صحیح تعیین کی گئی کیونکہ اس علم نے بصرہ میں جندی شاپور کے متحدہ دبستان کے ماتحت بالکل مختلف اصولوں کی بناء پر نشو و نما پائی تھی اور وہاں ارسطو کی منطق ہی زیادہ تر کار فرما رہی۔ یہ راز ابھی تک تاریکی ہی میں پنہاں ہے کہ دبستان بصرہ کی ابتداء کیسے ہوئی۔ بنو امیہ کے زمانے میں ہمیں ایک دو نام مبہم طریق پر ضرور ملتے ہیں لیکن ان کے سوا اس صدی کے آخر تک ہمیں قطعی طور پر کوئی تاریخی شہادت یا اعداد و شمار دستیاب نہیں ہوتے۔ سب سے پہلی باقاعدہ تصنیف جس شخص نے کی وہ الخلیل ہے (م ۷۹۱ ع) جو عمان کا رہنے والا ایک عرب تھا۔ قدیم شعراء کے کلام کے مطابق اس نے ایک نہایت پیچیدہ عروضی نظریہ اختراع کیا، جس کا بدل آج تک کسی نے پیش نہیں کیا۔ اس نے ایک لغت لکھنے کی کوشش بھی کی جو بعد کے زمانے کی مروجہ لغات عربیہ کے مختلف ابجدی طریقوں پر مبنی نہ تھی بلکہ اس میں الفاظ کی ترتیب لب و لہجہ اور آواز کی بناء پر قائم کی گئی تھی اور اس ترتیب کے متعلق یہ شبہ کیا جا سکتا

ہے کہ اس میں ہندی اثرات غالب تھے (اس زمانے میں عرب کا ہندوستان سے کیا ربط تھا ؟ ـــم)۔ اس کے ایرانی شاگرد سیبویہ (م نواح ۷۹۳ع) نے عربی لسانیات کی اپنے استاد سے بھی بڑھ کر خدمت کی۔ اپنے پیش رووں کی منتشر علمی تحقیقات نئے اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اس نے تمام نتائج کو ایک باقاعدہ اور منطقی اظہار خیال کے ذریعہ عربی صرف و نحو کی شکل میں پیش کیا۔ اس کی تصنیف سے (یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ اس تصنیف کا کوئی نام نہیں، محض الکتاب کہلاتی ہے)۔ اگرچہ اس میں بعد کے مصنفین نے کچھ اصلاح بھی کی صرف و نحو کے تمام مسائل ہمیشہ کے لئے حل ہو گئے اور یہ کتاب اب تک اس موضوع پر سند مانی جاتی ہے۔

اس سے کچھ پہلے، مگر یہ معلوم نہیں کہ کب اور کیونکر، کوفہ (عجف) میں بھی لسانیات کا ایک مقابلے کا دبستان قائم ہوا تھا۔ اس کی تعلیمات میں روایتی اصطلاحات پر کم زور دیا جاتا تھا اور صرف رائج الوقت فن لسانیات پر ہی بحث ہوا کرتی تھی۔ سیبویہ کی کتاب کی زبردست اسناد کو بعد کے زمانے میں بصرے کے دبستان کے اصولوں کے مطابق عام طور تسلیم کر لیا گیا ہے، لیکن کچھ عرصے تک ان دونوں دبستانوں میں علمی رقابت کا سلسلہ جاری رہا۔ لسانیات میں زیادہ کد و کاوش اسی صنف میں ہوتی رہی کہ ایک لغت کی تیاری کے لیے ضروری سواد جمع کیا جائے اور عربی زبان، شعر و سخن، اور ضرب الامثال کا قدیم ذخیرہ مرتب کیا جائے۔ اس

ابتدائی زمانے کے نحوی خشک مدرس نہ تھے کہ تنگ و تاریک حلقوں میں محدود رہتے، بلکہ اسلام کی جانب سے بنی نوع انسان کے بہترین خادم تھے۔ ان کی جو تصانیف بھی شائع ہوتی تھیں ان کا کوئی نہ کوئی عملی مقصد ضرور ہوتا تھا۔ ان کے لیے یہ ضروری تھا کہ سلطنت کے امراء کا جو جدید نظام مقرر ہو چکا تھا اس کے تحت تعلیم و تعلم کی مانگ کو پورا کریں۔ اس عہد کے نہایت مشہور و معروف علماء کو نوخیز شہزادوں کی تعلیم کا کام سپرد کر دیا جاتا تھا۔ ابوعبیدہ (م نواح ۸۲۵ ع) کی دو سو تصانیف میں مختلف علوم و فنون کے جمع کرنے کا مذاق ظاہر ہوتا ہے۔ ابو نواس نے اس عالم کو علم کی زنبیل کا لقب دیا ہے۔ اس کا عربوں کی تاریخ پر سیر حاصل علم، جو زمانۂ اسلام اور زمانۂ جاہلیت دونوں پر حاوی تھا، اتنا زیادہ تھا کہ بعد کے مورخین نے اسی کی تصالیف کو اپنا ماخذ بنایا۔ اس کے باوجود یہی ابوعبیدہ جو یہودی الاصل تھا ایران میں تحریک شعوبیہ کا سردار مانا گیا۔ یہ تحریک وہ قومی اور ادبی تحریک تھی جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے اور جو عربی علم ادب شرقیہ میں تقریباً دو صدیوں تک جاری رہی اور اس کے آثار دینی اور فقہی کتابوں میں بھی ملتے ہیں- شعوبی عام طور پر ایرانی لوگ تھے جنھوں نے عربوں کے مصنوعی دعاوی اور ان کی زبان پر حملے کیے، ان کے شعر و سخن کا مذاق اڑایا اور انھوں نے ایرانیوں کے لیے زندگی کے ہر شعبے میں نہ صرف مساوات کا حق طلب کیا بلکہ عربوں پر تمام ایرانی اور عجمی لوگوں کا تفوق ثابت کرنے کی کوشش کی۔ تاہم یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ عربوں

کے حامیوں میں بھی اتنے ہی ایرانی موجود تھے جتنے کہ ان کے مخالفین میں تھے اور اس حد تک سارا ایران عرب پسند ہو چکا تھا۔

اس امر کا سہرا بھی دبستان بصرہ کے سر پر ہے کہ پہلے پہل عربی زبان کے تراجم کا آغاز اسی جگہ سے ہوا۔ ان تراجم میں ایرانیوں کی رزمیہ داستانیں اور نیم تاریخی افسانے تھے جو اب معدوم ہو چکے ہیں۔ صرف ان کے بعض اقتباسات بعد کی تصانیف میں محفوظ ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستانی کہانیوں کی کتاب جسے حکیم بیدپائے نے تصنیف کیا تھا کا قدیم ترین عربی ترجمہ ' جو ہمیں میسر ہے ' کلیلہ دمنہ کے نام سے موسوم ہے۔ اس کا مترجم روزبہ ایک شخص تھا جو بعد میں ابن المقفع کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ شخص زرتشتی نژاد تھا اور مسلمان ہو گیا تھا۔ ۷۶۰ ع میں اسے ایک شیعہ مدعی سلطنت کا حامی کار ہونے کے الزام میں قتل کر دیا گیا تھا۔ اگرچہ یہ تالیف محض ایک ترجمے کی حیثیت رکھتی ہے لیکن اس کے اسلوب کو بےحد پسند کیا گیا۔ لیکن جہاں تک متن کی غیر یقینی حالت سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے ' وہ عرب کے روایتی ادب کے مقابلہ میں اپنے معیار سے گر جاتی ہے اور اس کی عام بندش دوسرے معمولی سے نقائص کے علاوہ کچھ ڈھیلی سی ہے۔

اس دور میں مطالعہ کی دوسری شاخ یعنی علم حدیث کو پورا پورا ادبی فروغ حاصل نہ ہوا لیکن اپنی مختلف شاخوں کی وجہ سے اس کی بھی نمایندگی ہوتی رہی۔ عباسیوں کا کٹر عقیدہ یہ تھا کہ نظام سلطنت کو (کم از کم ظاہری طور پر) شریعت الہیہ کے اصولوں

کے مطابق، یعنی علماء کی تشریح و توضیح کے مطابق، چلایا جائے نہ یہ کہ بنی امیہ کے خود مختارانہ قانونی طریقوں کی پیروی کی جائے۔ خلیفہ ہارون الرشید کی وفات سے قبل فقہ کے تین مدرسے معرض وجود میں آ چکے تھے۔ قانون سازی کے سلسلے میں بے شمار کتابیں لکھی گئیں جن کا مفصل تذکرہ اس مختصر سے خاکے میں نہیں ہو سکتا، لیکن ان میں سے دو کتابیں ایسی ہیں جن کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ زیادہ راسخ الاعتقاد علماء دبستان عراق کے خیالی اور غیر ملکی عناصر کی تاویلوں سے بد دل ہو چکے تھے۔ اس بد دلی کا اظہار مدینہ کے فاضل اجل مالک بن انس رح (م ۷۹۰ع) نے کیا۔ احادیث پر پورا پورا اعتماد کرتے ہوئے امام مالک بن انس نے ان احادیث رسول اللہ صلعم کو مرتب کیا جن کے مطابق وہ خود بھی بحیثیت قاضی فیصلے دیا کرتے تھے۔ اس کتاب میں اہالی مدینہ کے اقوال و اعمال کا حوالہ بھی دیا گیا تھا، کیونکہ مقبول عوام وہی قانون ہو سکتا تھا جو حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وضع کردہ مانا جائے۔ یہ کتاب تمام اسلامی دنیا میں الموطاء[1] کے نام سے مشہور و مقبول ہو گئی۔ دوسری کتاب ایک عدیم المثال تصنیف ہے جو ملکیت زمین کے متعلق ہے جو خلیفہ ہارون الرشید کے لیے ان کے قاضی القضاۃ امام ابو یوسف رض نے لکھی تھی۔ اس کتاب کے نام کے باوجود اس کتاب میں عملی نظام حکومت کا سارا آئین درج ہے یعنی حقوق آبپاشی سے لے کر فن حرب تک۔ یہ تصنیف ابتدائی اسلامی تاریخ کے ہر طالب علم کے مطالعہ کے لیے ایک لازمی شرح ہے۔

۱۔ مؤطا امام مالک کی تصنیف کی حیثیت سرکاری ہے اور اسے عالم اسلام کی سب سے پہلی باقاعدہ اور منضبط کتاب سمجھا جاتا ہے۔ اس کی تدوین کے لیے خلیفہ المنصور عباسی نے امام مالک کو حکم بھیجا تھا۔ فرمان کا متن یہ ہے:

یا ابا عبد اللہ لم یبق علی وجہ الارض اعلم منی و منک و انی قد اشغلتنی الخلافۃ فضع انت للناس کتابا ینتفعون فیہ تجنب فیہ من رخص ابن عباس و شدائد ابن عمر و وطئہ للناس توطئۃ قال مالک لقد علمنی التصنیف یومئذ و لذلک سمی کتابہ المؤطاء۔

اے ابو عبداللہ! آج زمین پر سوائے میرے اور آپ کے کوئی بڑا عالم نہیں۔ مجھے خلافت نے مشغول کر دیا ہے لہذا آپ لوگوں کے لیے ایک کتاب مرتب کیجیے جس سے وہ فائدہ اٹھائیں۔ اس میں حضرت ابن عباس کی نرمی اور حضرت ابن عمر کی سختی سے پرہیز کیجیے اور لوگوں کے لیے اسے خوب اچھی طرح روند ڈالیے (یعنی تحقیق کا کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھیے)۔ امام مالک فرماتے ھیں: امیر المومنین نے مجھے اس فرمان کے ذریعہ طریقہ تصنیف سکھادیا اور اسی لئے کتاب کا نام آپ نے مؤطا رکھا۔

جرجی زیدان: ضحاجہ النظرۃ فی مقدمات العرب۔ صفحہ ۳۰۲۔ طبع بیروت۔

عباسی دور کی یہ عظیم ترین کتاب آثار جسے حضرت امام شافعی رح نے کتاب اللہ کے بعد سب سے صحیح کتاب کہا ہے، اس میں نیز صحیح احادیث کی دوسری کتابوں میں اموی خلفا کے فتاوی اور ان کے فیصلوں کو بطور نظائر بیان کیا گیا ہے۔ ان اموی خلفاء اور امراء کی مرویات بھی ان کتابوں میں موجود ھیں۔ یہ سب کتابیں عباسی دور سے لے کر اب تک تمام عالم اسلام کا مرجع ھیں، یعنی علوم اسلامیہ کا ذخیرہ خلفائے راشدین اور ان کے بعد اموی خلفاء اور عباسی خلفاء کی ذاتی نگرانی میں مدون، محفوظ اور مروج ھوا۔ مصنف نے جگہ جگہ امویوں اور عباسیوں پر جو چوٹیں کی ھیں ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ کسی طرح یہ ثابت کر دیا جائے کہ اسلام کی تحریک کوئی عالمگیر زندہ و پائندہ اور فعال تحریک نہ تھی بلکہ خلفای اسلام نے محض سیاسی مصالح کی بنا پر اس کی سرپرستی کرکے توسیع و استحکام سلطنت کی فکر کی تھی۔

اسی دور کی کارگزاریوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ تاریخ کے مطالعہ کو علم حدیث کا ایک ضروری اور بالکل علیحدہ لازمی حصہ قرار دیا گیا - علم تاریخ میں سب سے پہلی تصنیف ابو اسحاق رح (۷۶۶ع) کی تھی جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح لکھے۔ اس کتاب کی ترتیب کی علمائے مدینہ نے ایسی سخت مخالفت کی کہ انہیں پہلے تو مصر میں بھاگ جانا پڑا تاکہ وہاں پناہ لیں اور اسکے بعد انہیں عراق میں آنا پڑا، جہاں خود خلیفہ نے ان کیلیے ایسے وسائل مہیا کر دئیے کہ وہ اپنی تصنیف کو مکمل کر سکیں - اصلی کتاب کا کوئی نسخہ اب تک دستیاب نہیں ہو سکا لیکن اسی کتاب کی ایک نئی ایڈیشن جو ابن ھشام رح (م ۸۳۴ع) نے تیار کی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے حالات کے متعلق ایک معیاری اور مستند کتاب سمجھی جاتی ہے - مورخ الواقدی (م ۸۲۳ع) نے اپنے رسالہ ''مغازی رسول'' میں ذرا مختلف پہلو اختیار کیا ہے- اس نے اپنا موضوع توسیع اسلام واسلامیان رکھا ہے - اس نے سن ھجری سے پہلے کے سارے زمانے کی روایات یا احادیث کو نظر انداز کر دیا اور ایک علیحدہ تصنیف میں (جواب چند اقتباسوں کے سوا معدوم ہو چکی ہے) اپنے بیان کو ان فتوحات پر لا کر ختم کر دیا جو خلفائے راشدین رض کے زمانے تک ہوئیں۔ اس سے زیادہ قدیم دبستان نے جو نیم تاریخی حیثیت رکھتا تھا، اور جس کی بنیاد قبائلی روایات پر قائم تھی، اپنا کام جاری رکھا - اس قسم کے متعدد مصنفوں کی تصانیف موجود ہیں جو بعد کی تالیفات میں

باعث نزغ ثابت ہوئیں کیونکہ وہ تاریخوار ترتیب کے لحاظ سے غیر معتبر ہیں ۔ ان کے مقابلے میں اسلامی تاریخ کے موضوع پر المدائنی (م نواح ۸۳۰ع) کے کئی رسائل موجود ہیں جن کے اقتباسات زمانۂ ما بعد کے مورخین نے نقل کیے ہیں ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صحیح معنوں میں مصور واقعات اور ایسا مورخ تھا جس نے اپنے پیش روؤں کی نسبت علم تاریخ کا زیادہ متانت اور ذمہ داری سے مطالعہ کیا ہے ۔

عباسی دور کے ابتدائی زمانہ میں سب سے زیادہ نمایاں ادبی ارتقاء یہ تھا کہ شعر و سخن میں ایک نئے اسلوب کی تخلیق ہوئی ' جو صنائع بدائع کے عجیب و غریب استعمال کی وجہ سے نہایت ممتاز ہو گیا ۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا یہ اسلوب بیان زیادہ سے زیادہ قیمتی اور نایاب ہوتا چلا گیا ۔ اس اسلوب کا بانی بشار بن برد (م ۷۸۳ع) نابینا شاعر تھا ۔ وہ ان وہبی شاعروں میں سے تھا جن کے کلام میں کسی کی محنت کارفرما نہیں ۔ اس کی ایک مشہور تشبیہ حسب ذیل ہے :

"میں یہ سمجھا کہ ان کے سروں پر جنگ کا گرد و غبار جم رہا ہے اور ہماری تلواریں ایک شعلہ بار تاروں بھری رات ہے جس نے تحت الثری تک کو بھر رکھا ہے"۔

شاہی دربار کی سخن نوازی اور عام مقبولیت کی وجہ سے اس نئے اسلوب کو ماہرین لسانیات کی مخالفت کے باوجود کھلم کھلا طریق سے تسلیم کر لیا گیا ۔ انہوں نے اس لغوی اصول پر عمل کرتے ہوئے

کہ قبل از اسلام کی عربی زبان ما بعد اسلام کی زبان سے اعلی اور افضل ہے اپنے اس عقیدے کو فنون لطیفہ کی شاخ قرار دے کر یہ اعلان کر دیا کہ قبل از اسلام زمانے کے شعر و سخن کو ناقابل مقابلہ تفوق حاصل ہے - یہ ایک ایسا فیصلہ تھا جس نے بلا شک و شبہ چھوٹے درجے کے شعراء پر برا اثر پیدا کیا - ابو نواس کی سخت تعریض و طنز کے باوجود پھر بھی دو صدیاں اسی حالت میں گزر گئیں تب کہیں جا کر ماہرین لسالیات کو مجبور ہو کر نئی قسم کی شاعری کے محاسن قبول کرنے پڑے - جدید مذاق شعر گوئی کو اس وجہ سے بھی کچھ تقویت پہنچ گئی کہ شعر و سخن کے میدان میں ایرانی بھی آدھمکے جنھوں نے یقیناً اس میں لطافت اور لوچ پیدا کر دیا جس کی اب تک عربی شاعری میں کمی تھی (البتہ یہ بات ضرور ہے کہ ان لوگوں کے کلام میں بعض اوقات کلبیت اور ھرزہ سرائی بھی پائی جاتی تھی) -

دوسری نسل میں نیم ایرانی ابی نواس شاھی دربار کے تمام شعراء میں سے سربلند و سرفراز نظر آتا ہے - ھمہ گیری ' معہود دھنی ' لطافت بیان اور زبان دانی کی مہارت کے اعتبار سے بہت کم شاعر ایسے ھیں جو اس کا مقابلہ کر سکیں اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اکثر اوقات ناموزوں طریق سے اس کا مقابلہ ھینے (Heine) سے کیا جاتا ہے - وہ اپنے ساقی ناموں میں تو اوج کمال پر پہنچ جاتا ہے لیکن اس کے قصیدے' غزلیات اور ھجویہ نظمیں اگرچہ نفس مضمون اور خیالات سے مالا مال ھیں ' لیکن مغربی مذاق کے

موافق نہیں، اور بہ اعتبار کمال سخن گوئی ذرا کم درجہ رکھتی ہیں۔
اس سے زیادہ من چلا تجربہ اس کے ہمعصر ابوالعتاهیه (م ۸۲۶ ع)
نے کیا جس کے رواں دواں اشعار، اپنے محاسن اور خوبصورتیوں
کو همراه لیے ہوئے، اپنی اخلاقی خوبیوں کے ساتھ مفکر زاهدوں
کے انداز میں پیش ہوتے ہیں - گو ابوالعتاهیه کا کلام، آب و تاب
اور بندش کے اعتبار سے، ابو نواس کے کلام کا مقابلہ نہیں کرتا،
لیکن اسے بھی وهی دوامی شہرت حاصل ہوئی جو شاهی دربار کے
اول الذکر اوباش شاعر کو نصیب ہوئی تھی - ابوالعتاهیه نے،
اس نیت سے کہ عوام الناس میں زیادہ سے زیادہ لوگ اس کے کلام
سے مستفید ہوں، ارادۃً شاعری کے تمام پرانے دستووں کو خیرباد
کہتے ہوئے، صرف عام لوگوں کی سادہ زبان هی کو استعمال کیا -
مقررہ روایات سے ایسی برگشتگی کی بناء پر اس طرز ادا کی کسی نے
تقلید نہ کی اور ابوالعتاهیه کے جانشین (جنہیں عربی زبان کی مذهبی
شاعری کا باپ کہنا چاهیے) ایک طرف تو بصرہ کے بازاروں میں
وعظ کرتے ہوئے دکھائی دینے لگے یا دوسری جانب عوامی شعراء
میں نظر آنے لگے جو معیاری ادب کی اس راہ سے کچھ زیادہ هی
زیادہ بھٹکتے چلے گئے جس میں ترصیع اور تصنع کا اثر غالب ہوتا
چلا گیا -

ابو نواس کے بعد اسی مرتبے کا شاعر پیدا ہونے میں کوئی
ڈیڑھ سو برس کا عرصہ لگا - اگر اس کتاب میں کچھ گنجائش
ہوتی تو ہمارے لیے یہ خوشگوار بات ہوتی کہ هم چند لطیف گو

شاعروں کا کوئی مرقع اور درمیانی عرصے کے دوسرے درجے کے شعراء کے لطائف و ظرائف اور چبھتی ہوئی ھجویں پیش کرتے۔ تاھم صرف دو شاعروں کا یہاں ذکر کر دیا جاتا ہے ۔ ملک شام کا شاعر ابو تمام (م ۸۴۵ع) تو پرانی روایات کی نمایندگی کرتا ہے ۔ وہ ایک قسمت آزما شاعر تھا جو شہر بشہر پھرتا رھتا تھا اور مختلف ولایات کے گورنروں کی قصیدہ خوانی کیا کرتا تھا ۔ اسی قسم کے ایک سفر میں اسے ایک دفعہ برفباری کے طوفان میں ایک امیر کبیر اور ادب نواز مربی کے مکان میں قیام کرنا پڑا اور اسنے اپنی فرصت کا وقت اپنے میزبان کے کتب خانہ کی مدد سے شعراء کے منتخب کلام کی ایک بیاض تیار کرنے میں گزارا ۔ یہی بیاض الحماسہ کے نام سے مشہور ہوئی جس سے ابو تمام کا نام زندہ جاوید ہو گیا ۔ (ص ۱۰۷) نئے اسلوب کی نمایندگی بد قسمت شہزادہ ابن المعتز نے کی ' جسے صرف ایک دن کی خلافت کے عوض ۹۰۸ع میں اپنی جان سے ھاتھ دھونے پڑے ۔ شاعر کی حیثیت سے اس کی شہرت کا دار و مدار عام غزلیات اور بہتوں میں سے ایک کامیاب بیانیہ نظم اور ایک چھوٹی سی رزمیہ نظم اپر ہے جس کا پہلا رکن تاکیدی اور دوسرا غیر تاکیدی ہے ۔ اس نظم میں اس نے اپنے عمزاد بھائی خلیفہ معتضد کے دور خلافت کی تعریف کی ہے۔ وہ ایک کتاب کا مصنف بھی تھا جو شعر و سخن کے متعلق ہے اور اس میں نئے اسلوب کے قوانین کی قطعی طور پر تعین کی ہے ۔

فصل ۲ (۸۱۳ء تا ۸۴۷ء)

المامون کے عہد میں عربی ادبیات کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ المامون خود ایک ایرانی ماں کا بیٹا تھا اور اس نے اپنی ابتدائی زندگی کا بہت سا حصہ ایران میں گزارا تھا اور ایرانی افواج کی مدد سے وہ تاج و تخت کا وارث ہوا تھا۔ اس کے عہد میں ایرانی اثرات بہت کچھ دربار خلافت پر حاوی تھے اور غالباً یہ انہی اثرات کا نتیجہ تھا کہ وہ بھی دبستان جندی شابور کے خیالات و مذاق کو پسند کرنے لگ گیا۔ اس نے یونانی کتابوں کے مطالعہ اور ان کے تراجم کی حوصلہ افزائی کی اور وہ خود بھی مذہبی اور فلسفی مباحث میں نمایاں حصہ لیا کرتا تھا۔ اس رویہ میں اس کا پہلا اور دوسرا جانشین بھی شامل حال رہا اور اس طرح متواتر پچیس سال تک سلطنت کے اطراف و اکناف میں یونانی اثرات کے اظہار خیالات کو پوری آزادی حاصل رہی۔ یونانی علوم و فنون کا مطالعہ عربوں کے مقابلہ میں عجمی مسلمانوں نے زیادہ تعداد میں کیا اور انہوں نے اسلامی ماحول میں فلسفہ و منطق کی صداقت کو کماحقہ ثابت کر کے شامل کر دیا اور اس طرح اس فلسفے کو وہ نیم مذہبی اہمیت بھی حاصل ہو گئی جو مشرقی ممالک میں اسے پہلے ہی سے حاصل تھی۔ چونکہ فلسفہ کا رائج الوقت دستور العمل نئی قسم کے افلاطونی فلسفے کے مطابق تھا اس لیے قرآن پاک کی سخت توحید پرستی اور فلسفی عقیدۂ وحدت وجود کے درمیانی

تعلقات کی تعریف و تشریح کرنے کیلیے اس فلسفے کو فوراً ہی زبردست اهمیت حاصل هو گئی -

تحقیق و تدقیق کے جذبہ کا ھلکا سا جوش اسلام کے سن هجری کے پہلے بیس تیس سالوں میں بھی ظاهر هوا تھا - ممکن ہے کہ یہ تحریک اس نصرانی اختلاف کا نتیجه هو جو ملک شام میں پیدا هوا تها - یہ تحریک حتمی طور پر ایک مسئله یعنی مسئله قدر (انسان کی آزادی) کے گرد مرکوز هو گئی - حالانکه اس کے خلاف مسئله جو راسخ الاعتقاد لوگوں کے اصول و عقائد کے مطابق تها تقدیر و مقدر کا تها- مسئلۂ قدر سے مراد انسانی اختیار کی حقیقت کو سمجھنا ہے - جوں جوں عجمی اثرات غالب آتے گئے یہ تحریک وسعت پاتی چلی گئی اور اس کے باعث دبستان معتزله (غیر جانب دار یا الگ هونے والے) قائم هو گیا جس میں دبستان قدر یہ بھی مدغم هو گیا - کٹر علمائے دین نے اس آسیب کو اتارنے کی کوشش کی - ترتولین (Tertullian) اور لاطینی پادریوں کی طرح ' انہیں ابتداء هی سے اس تحریک کے متعلق شکوک غالب تھے - چنانچه جلد هی هر قسم کے فلسفے کو محض کفر قرار دے دیا گیا لیکن یہ بات ان کے حیطه اختیار میں نه تھی که وه اس علم کے مطالعه کو روک سکیں یا اس پر کوئی ضبط قائم کر سکیں - با مذاق قسم کے لوگوں نے ' جن کی تربیت منطق ارسطو کے اصولوں کے مطابق هوئی تھی اور جو یونانی علوم و فنون کے عجائبات کے دلداده تھے' لا محاله اس مقدمے کو تسلیم کر لیا اور اس طرح ان کا بے پناه

جذبۂ تحقیق و شوق تدقیق جوش میں آ گیا لیکن جب تک اس قسم کا مطالعہ علمی تحقیق کے ذریعہ ہوتا رہا اور چھوٹے سے حلقے تک محدود رہا اس وقت تک خطرے کی کوئی بات نہیں ہوئی -

یہ صورت حالات بنیادی طور تبدیل ہو گئی جب المامون نے علی الاعلان معتزلہ کے الحاد پر اپنی تائیدی مہر ثبت کر دی اور کٹر عقائد کے لوگوں کے خلاف ایک تعزیری عدالت کا قیام عمل میں آ گیا - اس طرح قانون رائج الوقت کی تائید حاصل کر کے معتزلہ نے صائب رائے زنی کو بالائے طاق رکھدیا اور اس دبستان کے رہنماؤں نے آئے دن ایسے نظریوں کا اعلان کرنا شروع کر دیا جن میں سے ہر ایک پہلے سے زیادہ انقلاب آفرین ثابت ہونا تھا -

وہ لوگ قرآن کے مسائل حل کرنے کے لیے یونانی منطق کے اصولوں کو بڑے شوق سے استعمال کرنے لگے اور اس ذریعہ سے جو نتائج برآمد ہوتے تھے وہ حیرت انگیز طریق سے انوکھی قسم کے ہوتے تھے - ایک وسیع سمندر میں ہوتے ہوئے انہوں نے یونانی فلسفے کی آزاد خیالی کا اظہار کرنا شروع کر دیا- اس لیے وہ عام زندگی کے معیار سے بالکل نا آشنا رہ گئے کہ کہاں میں کیا کیا غالب قیاسات پیش آتے ہیں - اس کے عوض وہ حق کی تلاش میں وحشیانہ طریق سے سرگرداں رہتے تھے اور ان کے اوچھے ہتھیار صرف تعریفات، منطقی قیاسات اور صغری و کبری سے نتائج اخذ کرنے تک ہی محدود رہنے لگے (Development of Muslim Theology صفحہ ۱۴۰)[1] -

---

۱- معتزلہ کو ملحد یا کافر کسی نے نہیں کہا ' حتے کہ حضرت امام احمد

یہاں ہمارا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ ہم ایسے لوگوں کے نام

نے بھی نہیں ۔ یہ لوگ اپنے وقت کے مانند پایہ علماء تھے ۔ کوئی شخص معتزلی ہ
ہی نہیں سکتا جب تک علم و نظر میں اسکا مقام نہایت ارفع و اعلیٰ نہ ہو ۔ لوگو
نے قدماء کی اصطلاح نہ سمجھنے کی بناء پر انہیں فرقہ سمجھ لیا ہے حالانکہ یہ خلا
واقعہ ہے ۔ فقہی مسائل میں یہ لوگ عموماً حنفی تھے ویسے مالکی ' شافعی
حنبلی ' اور اهل حدیث لوگ بھی اصول میں معتزلی ملتے ھیں ۔ البتہ مسائل مابع
الطبیعیات میں ان کے تصورات پر فلسفہ غالب تھا ۔ ان کا وجود در اصل محض فلسف
کے مطالعے ہی پر مبنی نہیں تھا بلکہ حمایت اسلام میں غیر مسلموں کے سا
مناظروں میں جو مسائل پیدا ہوئے ان کی وجہ سے علماء کا یہ گروہ وجود میں آیا
ظاہر ہے کہ حضرت امام احمد جیسے علماء جنھوں نے ایک خاص ماحول اور مع
طرز فکر کے تحت پرورش پائی تھی وہ انہیں بنظر استحسان نہیں دیکھ سکتے تھے
احمدی یا حنبلی نقطۂ خیال یہ ہے کہ مسائل مابعد الطبیعیات میں بھی وہ
حدیں برقرار رہیں جو منقولات سے ثابت ھیں ۔ قرآن حکیم کی آیات متشابہات م
غور و خوض کرتے وقت اگر فکر کو بے لگام کر دیا گیا تو اس کا نتیج
مہلک ہوگا ۔

معتزلہ ہر چیز کو عقلی حیثیت سے دیکھتے تھے ۔ ہمارے زمانے م
سر سید احمد خان اور علمائے دیوبند کے نظریات و تصورات میں جو تصادم ہ
ایسا ہی تصادم معتزلہ اور امام احمد کے مابین ہوا تھا ۔ اس تصادم ہی کا
مبارک نتیجہ تھا کہ جیسے ہمارے زمانے میں علامۂ اقبال رحمہ اللہ کا فلسفہ وج
میں آیا ایسے ہی اس زمانے میں دنیا کے سب سے بڑے معتزلی حضرت ام
ابوالحسن الاشعری رض نمودار ہوئے اور انہوں نے کتاب و سنت کی روشنی م
فلسفے پر تنقید کرنے اور جو بات عقل اسلامی کے موافق ہو اسے بدلائل ثاب
کرنے کے لیے علم الکلام کو باقاعدہ مدون کیا -

حضرت امام احمد اور انکے نقطۂ خیال کے لوگ اس علم الکلام کے ب
مخالف ہوئے لیکن عالم اسلام نے وہ اصول تحقیق قبول کر لیا جسکے تحت علم الکا
مدون کیا گیا تھا - معتزلہ اور علم الکلام میں یہی ربط ہے کہ اگر معتزلہ
ہوتے تو علم الکلام بھی وجود میں نہ آتا ۔

خلیفہ المامون چونکہ خود بڑے عالم' فقیہ' محدث' ادیب اور شاعر تھے ا
انہوں نے فلسفے کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا اس لیے وہ بعض امور میں معتزلہ

یا ان کی تصانیف کا ذکر کریں ۔ کٹر علماء نے اس امر کی خاص احتیاط کی کہ ان لوگوں کا نام و نشان تک بھی باقی نہ رہے (مصنف

ہمنوا ہوگئے کیونکہ معتزلہ ہی تھے جو اپنی بے پناہ قوت استدلال سے فلسفیوں اور غیر مذاہب کے لوگوں پر قرآن کریم کی حجت پوری کر کے انہیں مسکت جواب دیتے تھے ۔ معتزلہ کے علم کی گہرائی اور وسعت فکر مسلم ہے ۔ خود حضرت امام ابوالحسن الاشعری نے چالیس برس تک اسی طرز فکر کی تبلیغ کی ۔ آپکی اصلاح کا سبب کسی دوسرے خیال کے علمبردار کا استدلال نہیں تھا بلکہ آپ کو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے رویا میں یہ حکم دیا گیا کہ آپ سنت کی اشاعت کے درپے ہوں اور اس طرح اللہ نے آپ کا سینہ کھول دیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج قاطبہ تمام عالم اسلام کے علماء یا تو اشعری ہیں یا ماتریدی ۔

رہے عام مسلمان تو ان میں اس جھگڑے سے کوئی تعلق نہیں تھا کیونکہ وہ پہلے ہی سے حقائق اسلامیہ پر ایمان رکھتے تھے ۔ انہیں نہ نئے طرز فکر سے کوئی بیر تھا نہ قدیم سے ۔ مگر یہ تصادم خواص علماء تک محدود تھا باقی دشمنان دین اور جاہل مصنفوں نے جو افسانے تراشے ہیں اور اس واقعے کو سیاسی اہمیت دینی چاہی ہے اسکی تکذیب واقعات سے ہوتی ہے ۔ سب مسلمان ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتے تھے اور آپس کے ازدواجی تعلقات میں بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا ۔ خلیفہ کا معتزلہ کی حمایت کرنا بھی نظام سیاسی میں کوئی اختلال پیدا نہ کر سکا ۔ مسلمان اس حقیقت کو خوب سمجھتے ہیں کہ فکر و نظر کا وہ اختلاف جو عملی زندگی پر اثر انداز نہ ہو نہ موجب تکفیر ہے اور نہ وجہ تفسیق ۔ یہی وجہ ہے کہ جب چند علماء پر خلافت کی طرف سے سختی کی گئی تو اس سختی کو مسلمانوں نے بدعت سے تعبیر کیا اور اس بدعت کے مقابلے کے لیے امام احمد سینہ سپر ہوگئے ۔

یہ خیال بالکل لغو ہے کہ امام احمد خلق قرآن یا نفی رویت باری تعالے کا عقیدہ رکھنے والوں کو کافر کہتے یا مبتدع کہتے یا سمجھتے تھے ۔ انہوں نے بدعت مسائل کو جبر کیساتھ منوانے کو کہا ہے نہ کہ ان کے ماننے کو ۔ اگر خود یہ عقیدہ ان کے نزدیک کفر ہوتا تو وہ خلیفہ کی بیعت توڑ دیتے اور ان کا یہ رویہ نہ ہوتا کہ جو کوڑا ان کی پیٹھ پر پڑے وہ کہدیں میں نے اللہ کے لیے معاف کیا اور خلیفہ کو جب مخاطب کریں تو امیرالمومنین کہہ کر ان کے جھنڈے کے نیچے جنگ کو جہاد سے تعبیر کریں اور جو فتوحات ہوئیں ان پر اللہ کا شکر کریں — م ۔

گا یہ قول باطل ہے' معتزلہ کے بارے میں پوری معلومات امام ابوالحسن اشعری کی کتاب مقالات الاسلامیین میں محفوظ ہیں اور ان کے ائمہ کے احوال بھی۔ معتزلہ کی کتابیں بھی امت میں رائج و مقبول ہیں مثلاً تفسیر زمخشری۔م) ۔ عربی ادبیات میں ان کی اہمیت صرف اسی قدر باقی رہ گئی ہے کہ انہیں کیسا رسوخ حاصل تھا اور انہوں نے کس قسم کی مخالفت کا طوفان کھڑا کر دیا تھا۔ جس صرح عقائد معتزلیہ نے زیادہ دیدہ دلیری کے ساتھ راسخ الاعتقادی پر حملے کرنے شروع کئے اس کے مقابلے میں مسلمانوں نے بھی بڑی سختی کے ساتھ اپنی حفاظت و مدافعت کی۔ تعزیری عدالت نے اور بھی زیادہ تلخی اور بدمزگی پیدا کر دی۔ انہوں نے ہر اس چیز کو جائز قبول کرنے سے انکار کر دیا جس میں سے قابل نفرت الحاد کا شائبہ بھی نظر آتا ہو۔ یہاں تک کہ اس قسم کے بحث مباحثہ کو بھی ناجائز قرار دے دیا۔ وہ محض قران اور حدیث پر حصر کرنے لگے اور ہر سوال کا جواب بلا کیف دینے لگے یعنی یہ نہ پوچھو کہ کیوں ایسا ہے۔ ان کے سردار اور بغداد کے عوام الناس کے محبوب ترین عالم امام احمد حنبل (م ۸۵۵ ع) تھے جو اپنے زمانے کے بہترین محدث تھے۔

تاہم ان شدید اختلافات سے قطع نظر کرتے ہوئے یہ بات بھی قابل اطمینان ہے کہ ایک چھوٹا سا حلقہ ایسے لوگوں کا بھی موجود تھا جو اپنی شخصیت سے ایسے ہی بے نیاز تھے جیسے کہ

ن کا کام - یہ لوگ عربی بولنے والے ممالک کے لیے یونانی علوم و فنون اور فلسفہ کے تراجم میں مشغول رہے - ترجمے کا کام کچھ ابتدائی زمانے ہی سے شروع ہوا تھا لیکن یہ کام المامون کے دربار ہی میں ہوتا رہا جس نے اس مقصد کے لیے ایک کتب خانہ اور رصدگاہ قائم کر دی تھی - چنانچہ یہ کام اپنے اوج کمال پر پہنچا - ابتدائی زمانے میں ترجمہ کا کام بڑے پیمانے پر بعلبک کے قسطا بن لوقا (۸۳۰ع) نے کیا جس نے نہ صرف ارسطو اور بہت سے بعد کے مصنفین کی کتابوں کے ترجمے کیے ' بلکہ اس نے خود بھی علم ریاضی' علم ہئیت اور دوسرے مضامین پر مبسوط کتابیں لکھیں - اس کی شہرت پر حنین بن اسحاق (م۸۷۳ع) کی ناموری غالب آگئی - اس نے یونانی زبان کا مطالعہ اناطولیہ میں کیا تھا - چنانچہ اس نے افلاطون اور جالینوس کی کتابوں کا ترجمہ کیا اور کٹر مسلمانوں کے رد عمل کے زمانے میں بخت یشوع کے نصرانی خاندان کی جگہ (جو نسلاً بعد نسل طبیب شاہی کے عہدے پر متمکن چلے آتے تھے) طبیب شاہی کا عہدہ حاصل کیا - بعض زمانوں میں تو ترجمہ کرنے کا شوق حد اعتدال و تمیز سے بھی آگے نکل جاتا تھا - پلوٹینس (Plotinus) کے مضامین کا مجموعہ دینیات ارسطو (Theology of Aristotle) کے نام سے شائع ہوا - اس قسم کے تراجم کے انتساب کی صحت پر کبھی اعتراض نہ ہوتا تھا اور اس لیے اس قسم کے مواد نے فلسفیات پر ایک اور بوجھ ڈال کر اسے اور بھی بھاری بھر کم بنا دیا حالانکہ مسلمان ناحق اس کی تعلیم میں

تطابق پیدا کرنے کی کوشش میں منہمک تھے ۔ الکندی (م نواح ۸۵۰ع) ایک ایسا شخص ہے جس نے یونانی علوم کی تحصیل کے بعد عرب فلسفہ میں نام پیدا کیا ۔ چونکہ وہ خالص عربی النسل تھا اس لئے اس کا لقب فلسفئي عرب ھی مشہور ھو گیا ۔ اس کی تصنیف اس کے آرامی معاصر کی تصانیف سے ذرا مخالف تھی ' فرق صرف یہ تھا کہ اس نے یونانی فنون (سائنس) کے تمام پہلووں پر بحث کی تھی ۔ اسے یہ فخر بھی حاصل ہے کہ اس نے کم از کم ۲۶۵ رسالے مختلف موضوعات ' مثلاً موسیقی ' علم ھیئت ' طب وغیرہ ' پر لکھنے کے علاوہ افلاطونی اور ارسطوی دبستانوں میں موافقت پیدا کرنے کی کوشش بھی کی ۔ عربی علم ریاضی کی ابتدائی تاریخ میں الخوارزمی کا نام سب سے پیش پیش نظر آتا ہے ۔ المامون کی حوصلہ افزائی سے اس نے علم ریاضی اور علم ھیئت کے متعلق نہ صرف یونانی کتابوں کا مطالعہ کیا بلکہ ان ھندی تصانیف سے بھی بہرہ اندوز ھوا جن کا ترجمہ چند سال قبل عربی زبان میں ھو چکا تھا ۔ ھندی اعداد کو استعمال کرکے اس نے طریقۂ شمار میں انقلاب پیدا کر دیا اور یورپ نے اس کے عربی جبر و مقابلہ کے لاطینی ترجمے کے ذریعے کسور اعشاریہ (عربی اعداد) کا علم حاصل کیا ۔ یہ اعداد اس کے نام (Algorism) ھی پر قرون وسطی میں مشہور ہے ۔ بعینہ اسی طرح اس کے ھمعصر الفرغانی (Alfraganus) اور الکندی کے شاگرد ابومشعر (Ablumaser م ۸۸۵ع) کی تصانیف کو بھی اس زمانے میں

برابر کی شہرت حاصل رہی ۔

گو اس دور میں علم تاریخ نے بہت کم ترقی کی، لیکن انتظامی ضروریات کی وجہ سے علم جغرافیہ کی پہلی تصانیف بھی معرض وجود میں آگئیں ۔ یونانی زمانے کی طرح رسل و رسائل (ڈاک) کا انتظام بھی اسلامی زمانے میں سرکاری ھی تھا ۔ ایسا معلوم ھوتا ھے کہ عربوں نے رومن اور ایرانی عہد کے انتظام ھی کو قائم رکھا بلکہ اصلاحی نظام تسمیہ بھی اسی زمانے کا تھا ۔ عباسیوں کو مرکزی تنظیم کا خاص شوق تھا۔ اس لیے انہوں نے ذرائع رسل و رسائل کو برقرار رکھنے میں خاص توجہ دی اور اس لیے پہلے نئے دارالخلافہ سامرا (یہ لفظ سرمن راری کا مخفف ھے۔م) کے پوسٹ ماسٹر ابن خورداذبہ نے ۸۴۴ء میں ڈاک کی سڑکوں کی پہلی فہرست مرتب کی ۔ ایک ایک صوبہ کو علیحدہ لیکر وہ اپنی ڈاک کی چوکیوں اور فاصلہ مابین کی فہرست دیتا ھے اور آخر میں اس مالیہ کا خلاصہ لکھ دیتا ھے جو ھر ضلع سے واجب ھوتا ھے ۔

اگر عربی ادبیات کا نہیں تو از کم اپنے زمانے کا سب سے زیادہ زندہ دل مصنف ایک حبشی غلام کا بیٹا عمر بن بحر تھا جو الجاحظ (بھینگا : وہ شخص جس کی آنکھ باھر کو نکلی ھو۔ مراد ابھری ھوئی آنکھ نہیں جو حسن ھے بلکہ بیماری کے سبب پوری آنکھ باھر آجاتی ھے اور خلقی صورت اختیار کر لیتی ھے) کے نام سے مشہور تھا۔ وہ ۸۶۹ء میں نوے برس سے زیادہ عمر پا کر فوت ھوا ۔ مبدء فیاض سے اسے حیرت انگیز قوت جاذبہ ودیعت ھوئی

تھی جس کی بدولت اس نے بڑی غربت کی حالت سے ترقی کی۔ اپنے وطن مالوف بصرہ میں لسانیات اور دینیات کی تعلیم مشہور و معروف معتزلی استاد النظام سے پائی اور اس کے بعد بڑے شوق و انہماک کے ساتھ یونانی فلسفہ اور سائنس میں دلچسپی لینے لگا۔ اس طرز کا آدمی کبھی اپنی خود مختاری کو ترک کرنے کے لیے تیار نہ ہو سکتا تھا۔ اس نے ایک عہدے پر مقرر ہونے کے تین دن بعد ہی استعفی دیدیا اور علم دینیات کے لیے بھی اس نے اپنا ایک علیحدہ مدرسہ قائم کر لیا۔ گو معتزلی اور غیر معتزلی سب اس کی عزت و توقیر کیا کرتے تھے اور تمام ایسے علماء اس کی قدر کرتے تھے جو انسان کی پہچان اور امور کا جائزہ لینے کی اہلیت رکھتے تھے یہاں تک کہ خلیفہ المتوکل علی اللہ جیسے کٹر مذہبی شخص نے بھی اسے اپنے بیٹوں کا اتالیق مقرر کر دیا۔ اس کی تصانیف میں غیر محتاط یاوہ گوئی زیادہ ہے جو کبھی سنجیدہ کبھی لاابالی پن، کبھی مبالغہ آمیزی اور کبھی محض فضول گوئی کے نمونے پیش کرتی ہے۔ بے شمار رسائل کا مصنف ہونے کے علاوہ ان تھک پڑھنے والا آدمی تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ کتب فروشوں کی دکانیں اس غرض سے کرایہ پر لیا کرتا کہ وہ راتوں بیٹھ کر ان کتابوں کا مطالعہ کرے۔

اس کی تصانیف میں سے لسانیات و خطابت پر ایک بڑی کتاب اور دینیات کے رسالوں کے علاوہ چند ایک مقالوں کا ایک مجموعہ کتاب الحیوان ہم تک پہنچے ہیں۔ رسالوں کے نام ہی

اس بات پر شاهد هیں که وه بڑا روشن دماغ آدمی تھا مثلاً فی فخرالسودان علی البیضان (سیاه فاموں کی فوقیت سفید فاموں پر) فی مناقب الترک (ترکوں کے گن)' فی مدح التجار و ذم عمل السلطان (سوداگروں کی تعریف اور سرکاری ملازمت کی برائی)' فی تفضیل النطق علی الصمت (کلام کی خاموشی پر ترجیح) وغیره وغیره - "کتاب الحیوان" اس کا بہترین علمی شاهکار هے جو سات جلدوں میں هے - لیکن اس میں علم حیوانات کی معلومات بہت کم هیں - ایک طول طویل تمہید کے بعد جس میں دوسری باتوں کے علاوه ایک حصه کتابوں کی تعریف اور فن تحریر کی ابتداء کے لیے بھی وقف هے' پہلی اور دوسری جلد میں تو صرف کتوں کا بیان درج هے - اس کتاب نے نفس مضمون کو ایک مناظرے کی صورت دی هے' یعنی ایک مرغی والے اور ایک کتوں کے مالک کے درمیان مناظره هوتا هے اور کتوں کی اچھی یا بری صفات پر احادیث' منظوم کلام، ضرب الامثال' واقعات یہاں تک که قرآنی آیات تک کا حواله دے کر سیر حاصل تبصره کیا هے - عام توهمات کا ذکر بھی کیا هے' که کس طرح کتے کو جنات کی سواری مانا جاتا هے اور شگون لینے میں کتے کی کیا حیثیت هے - نیز اس امر پر بھی بحث هے که اگر کوئی شخص کتے کے کاٹنے سے دیوانه هو جائے تو اس کا علاج بادشاهوں اور امراء کے خون سے کیونکر کیا جاتا هے - باقی جلدوں میں نہایت مختصر مگر مدلل طریق سے ان تمام جانوروں اور حشرات الارض کا ذکر هے جن

کا علم قدیم عربوں کو حاصل تھا ۔ بعد کے زمانے میں الجاحظ کے طریقوں کی تقلید ، بہت سے مضمون نویسی کا سرقہ کرنے والوں نے کی ، چنانچہ ایک اسی قسم کے جاحظ نما کی ایک تصنیف ''کتاب المحاسن والاضد ادوالعجائب والغرائب'' کے نام سے ہے جس میں کئی جسمانی اور اخلاق اوصاف کا ذکر درج ہے ۔

فصل ۳ ۔ (۸٤۷ء سی ۹٤۵ء تک)

دور ما قبل کا خاتمہ خلیفہ المتوکل کی تخت نشینی (۸۴۷ع تا ۸٦۱ع) کے موقع پر ہوا اور عباسیوں کی طاقت و اقتدار کا خاتمہ بھی ایک ہی صدی کے اندر اندر ہو گیا یعنی اس کے قیام و دوام کا کام محض خارجی یا خود ساختہ مدافعین کے ہاتھ میں آ گیا ۔ تمام اسلامی خاندانوں کی طرح اس خاندان نے بھی اپنے ابتدائی اور سرگرم زمانے میں سائنس اور ادب کے تمام طلباء کی کھلی اور غیر محدود سر پرستی کی اور جب اس کا زوال شروع ہوا تو اسے اس بات کی سخت ضرورت پیش آئی کہ وہ علمائے دین سے ، جو بے پناہ رسوخ اور طاقت کے حامل تھے، کچھ سمجھوتہ کر لیں ۔ ان کی تائید کے لیے گراں بہا قیمت ادا کرنے کی ضرورت تھی ۔ گو بعد کے زمانے میں وہ اس قابل بھی ہو گئے کہ ہر قسم کی مخالفت کو سختی سے دبا دیں ، لیکن اسلامیوں میں تحقیق و تدقیق کا شوق اور سرگرمی اور لوگوں کی قدرتی ذکاوت کا مظاہرہ ان کی سختی کے مقابلہ میں ابھی تک کہیں زیادہ طاقت ور تھا ۔ المتوکل سے جو کچھ بھی بن آیا اس نے کیا، اس نے قانون رائج

الوقت کے اختیارات راسخ الاعتقاد لوگوں کو دے دئیے ۔ اس نے بغداد کے مشہور و معروف صوفی محاسبی کی زبان بندی کر دی ۔ شیعوں کو جلا وطن کر دیا اور یہود و نصاریٰ کے خلاف ایسے دیوانی ضوابط جاری کیے جن کی رو سے افراد کے مصارف ' حکومت کی مصلحتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ' محدود کر دئیے گئے ۔ عوام الناس نے اس کی مساعی کی تائید کی اور ہر شاعر یا مصنف جو معمولی سی خود اختیاری کے اظہار کرنے کی جرات کرتا ' اسے معتزلہ قرار دے کر اتنی مار دی جاتی تھی کہ وہ مر جائے۔[۱]

۱۔ خلافت عباسیہ کے زوال کے اسباب کا جو تجزیہ مصنف نے کیا ہے اس سے ہمیں اختلاف ہے ۔ اسب مسلمہ پر زوال اس وقت تک نہیں آ سکتا جب تک وہ دین کی رسی مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہتی ہے ۔ تیرہ سو برس کا یہ مشاھدہ ہے جس کی تکذیب کا امکان نہیں ۔ مسلمان جب کبھی سختی کے ساتھ دین پر قائم ہوئے انہوں نے ترقی کی اور دوسری قومیں اس وقت تک ترقی نہ کر سکیں جب تک انہوں نے اپنی روایتی دین کو خیر باد کہہ کر اپنے معاشرے کی اصلاح ' تصورات اسلامیہ کے تحت نہ کر لی ۔

در اصل علم کی تحصیل عام کرنا اور فکر کا دائرہ وسیع کر دینا اپنی جگہ ایک فعل مستحسن ہے لیکن علوم میں نافع اور غیر نافع کی تمیز نہ کرنا یا فکر کو بے قید کر دینا کسی طرح مفید نہیں ۔ کتاب و سنت نے جو حدود قائم کیے ہیں انہی کے اندر رہ کر کام کرنا موجب فلاح ہے ۔

عباسیوں کا زوال ان کی سیاسی غلطیوں کی بنا پر ہوا اور ایسے امور اختیار کرنے پر جن کے نتیجے میں مرکز کمزور اور اس کے تحت جغرافیائی علاقے طاقتور ہو گئے اور ان علاقوں نے نسلی اور لسانی بنیاد پر اپنی زندگی کی تعمیر شروع کر دی — م ۔

رہے معتزلی تصورات تو وہ صرف علماء تک محدود تھے ' عوام میں ہرگز اور کبھی رائج نہیں ہوئے۔ غیر مسلموں سے مناظروں کے نتیجے میں یہ تصورات پیدا ہوئے تھے ؟ لہذا ان کا باقی رہنا یا فنا ہو جانا مسلم معاشرے کے لئے کچھ اہمیت

باینہمہ معتزلی اعتقادات اس وقت تک ہوا ہی بنے رہے جب

نہیں رکھتا ۔ اس لیے مصنف کا یہ خیال درست نہیں کہ خلیفہ متوکل علی اللہ نے سنت کی طرف رجوع کرکے اور معاشرے کی زمام کار راسخ العقیدہ علمائے سنت کے ہاتھ میں دے کر اپنی حکومت کی بنیادیں کمزور کر لیں ۔

مسلمان متبع سنت ہوں یا اپنے تصورات میں معتزلہ کی طرح عقل کی رہنماؤ میں اپنے خیالات استوار کریں، اس سے نہ تو نفس دین پر کوئی حرف آتا ہے اور نہ امت مسلمہ کے داخلی امور میں اس سے کوئی کمزوری لا حق ہونے کا امکان ہے ۔ کمزوری آتی ہے تشتت و افتراق سے اور اس سے کہ ایک نظام سیاسی میں ذیلی متوازی نظام قائم کیے جائیں ۔ امام احمد حنبل اور ان کے ہمنواوں نے معتزلہ کے خلاف جو محاذ فکری قائم کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان دونوں قسم کے خیالات کے تصادم سے اشعری اور ماتریدی تصور حیات وجود میں آیا اور یہ وہ طرز فکر ہے جو تمام عالم اسلام میں رائج ہو گیا ۔

امت کے عروج و زوال میں نہ ایک خیال کو کوئی دخل ہے نہ دوسرے کو ــم ۔

۱ـ مصنف نے محدثین کا طریقۂ کار سمجھا نہیں ۔ وہ مسند احمد رض سے لے کر صحاح ستہ کی تدوین تک ارتقائی کڑیاں تلاش کر رہا ہے ' حالانکہ واقعہ یہ نہیں امام احمد رض کا مجموعۂ احادیث' جو "مسند احمد" کہلاتا ہے اس کی ترتیب اسنا کے اعتبار سے ہے اور اس کا مقصد مسائل کا استخراج نہیں تھا بلکہ احادیث کو سندوں کے اعتبار سے حفظ کرنا اور مرویات کے اختلاف لفظی کو محفوظ کرنا تھا

اس وقت تک فقہ کے تمام مدراس اپنا کام مکمل کر چکے تھے ۔ لہذا محدثین اب اس طرف متوجہ ہوئے کہ جن احادیث سے فقہائے اسلام نے مسائل کا استخراج کیا ہے انہیں فقہی ابواب کے تحت اسی طرح مرتب کر دیں جس طرح حضرت امام مالک رض نے احادیث نبویہ کے علاوہ آثار صحابہ و تابعین کو مؤطا شریف میں مدون کرکے بعد کے لوگوں کے لیے منہاج مقرر کر دیا تھا ۔

صحاح کی پیروی میں دوسرے بزرگوں نے بھی وہ احادیث جمع کر دیں جو انہیں پہنچی تھیں ۔ اگرچہ سنداً و متناً وہ مجروح تھیں ۔ اس طرح احادیث کا وہ تمام مواد محفوظ ہو گیا جو کسی طرح اهل علم میں بار پا گیا تھا ۔ اس مجموعے کے باہر جو کچھ ہے وہ چاہے کتنی ہی شاندار سند سے بیان کیا جائے قابل اعتنا نہیں ۔

تک کہ راسخ الاعتقاد اور کٹر لوگ اپنی اس ضد پر اڑے رہے کہ معقول بات کو بھی ماننا روا نہیں حتے کہ علمائے دین نے محسوس کیا کہ کامیابی کا راز اسی میں ہے کہ معتزلی استدلال کو اس کے مصنفین ہی کے خلاف استعمال کریں اور اسی قسم کا ایک دبستان بیک وقت مصر، بغداد اور سمرقند میں پیدا ہو گیا جس نے بحث و مناظرہ کے بل پر معتزلہ کا خاتمہ کر دیا۔ اس دبستان کا پورا پورا فائدہ (امام ابوالحسن رض) الا شعری (م ۹۳۳ ع) نے اٹھایا جو بغداد میں اس تحریک کے بانی مبانی تھے اور جنھوں نے خود بھی معتزلی حلقوں ہی میں تعلیم پائی تھی۔ نرم قسم کے معتزلیوں نے اس دبستان کے علماء کی صف میں بائیں بازو کی حیثیت اختیار کر لی اور وہ لوگ جو انتہا پسند تھے انہیں ایک نئی سرگرمی دکھانے کا موقع مل گیا جو شیعت کے مترادف تھی۔ اشعری دبستان کو بھی کڑی آزمائش کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ حنبلیوں نے ہر قسم کے بحث مباحثے کی مخالفت جاری رکھی۔ اس طرح اشعریوں کو بھی اسلام میں کٹر مسلمانوں کا مستقل دبستان بننے میں پوری ڈیڑھ صدی کا عرصہ گزر گیا۔

راسخ الاعتقاد فریق نے ابھی معتزلہ کی بساط الٹی ہی تھی کہ انہیں ایک نئی تحریک کے سلسلے میں، جس کا بہت قریبی تعلق ان کی اپنی ہی تحریک سے تھا، نئے خطرات نظر آنے لگے۔ اسلام کے ابتدائی زمانے ہی سے کئی مومنین اپنی زاہدانہ ریاضت و عبادت کے لیے مشہور ہو چکے تھے۔ ان متقدمین کا دستور العمل یہ تھا کہ وہ قرآن کریم کی بار بار تلاوت میں مشغول رہتے تا آنکہ ہر آیت قرآنی کی باطنی وضاحت

بالکل حقیقت بن کر ان کے ذہن میں سما جایا کرتی - پہلی صدی کے بہترین زہاد اور متصوفین میں سے (حضرت) حسن بصری رض (م ۷۲۸ع) تھے - اپنی عدیم المثال دینداری اور استقامت کے علاوہ آپ کو فصاحت و بلاغت میں بھی ید طولی حاصل تھا اور آپ کے مواعظ حسنہ ہم تک محفوظ حالت میں پہنچے ہیں - آپ کی یاد ' بعد کے زمانے کے چند (بد بخت) لفظ پرستوں کے حملوں کے سوا ' اب تک سچے مسلمانوں کے دلوں میں تازہ ہے - دوسری صدی میں یہ (خشک) زہد پرستی زیادہ زور پکڑ گئی اورگو یہ جماعت اسلام و شرع اسلام کے دائرے ہی کے اندر رہی لیکن اسے ترقی ضرور ہوئی اور اس وجہ سے کئی امتیازی اشغال و اذکار کا رواج شروع ہو گیا - چنانچہ ہم بصرے کے بازاروں میں واعظین کی تبلیغ اور حجرہ نشینی کی حالت میں چلہ کشی وغیرہ کا حال سنتے ہیں- (اس زمانے میں اس قسم کے لوگوں کے لیے صوفیوں کی اصطلاح کا اطلاق ہونے لگ گیا تھا) - چنانچہ یہ لوگ قدریوں' شیعوں اور خود کٹر مسلمانوں میں عام ہو گئے - یہ بات بھی ناگزیر تھی کہ ابتدائی اسلامی تصوف چند غیر اسلامی عناصر کو اپنے اندر جذب نہ کرے - یہ عناصر گو صحیح معنوں میں قرآنی عناصر نہ تھے لیکن ان کا تعلق قران سے مربوط کیا جا سکتا تھا-(فاضل مصنف کا خیال صحیح نہیں ہے - اسلامی تصوف غیر مذاہب کے عناصر سے پاک ہے—م) اس کی بدیہی مثال یہ ہے کہ ''خوف خدا'' کی جگہ حب الٰہی کے متصوفانہ جذبے نے لے لی اور اس خیال کا اظہار انتہائی خوبی کے ساتھ اسلامی شاعرہ (حضرت) رابعہ بصری (م ۸۰۱ع) نے اپنے

اشعار میں کیا ہے۔ جذبات کے اس اظہار کے متعلق یہ کہنا کہ یہ اظہار خیال آرامی تصوف سے مبرا ہے بہت مشکل ہے۔ (فاضل مصنف اس نکتے کو نظر انداز کر گیا ہے کہ حضرت رابعہ بصری رحمۃ اللہ علیہا نہ تو ماہر لسانیات تھیں اور نہ آرامی یا یونانی فلسفے سے انہیں کوئی مس تھا اور اس کا یہ دعوے بھی صحیح نہیں کہ اسلامی تصوف ابتداءً محض خشیت الٰہی پر مبنی تھا اور اس میں محبت کا احساس کار فرما نہ تھا—مترجم) ۔

اس زمانے تک صوفیوں کے طریقے اور مقاصد میں کوئی ایسی بات پیدا نہیں ہوئی تھی جو اسلام کے عام اصول و عقاید کے منافی ہو ' لیکن جب تیسری صدی میں عشق الٰہی نے ایک وجدانی صورت اختیار کر لی اور تصوراتی اور حواسی طریق کے بت اختراع کر لیے گئے ' قرآن پاک کی تفسیریں مخفی اصولوں کے تحت صوفیانہ طریق سے ہونے لگیں جو اس کے ظاہری معانی سے بڑی حد تک مختلف تھیں' اور صوفی ان تمام مذہبی فرائض سے بھی آزادی حاصل کرنے کے خواہاں نظر آئے جو تمام مسلمانوں پر بطور فرض عائد ہوتے ہیں — غرضیکہ ایسا وقت بھی آ گیا کہ وہ لوگ جو داخل سلسلہ نہ تھے دہشت زدہ ہوکر یہ سننے لگے کہ معبود حقیقی کا ذکر بھی صیغۂ واحد متکلم میں ہونے لگا ہے ' تو علمائے دین کو اس بات کا احساس ہوگیا کہ انہیں ایک اور جہاد کے لیے مسلح ہونا پڑے گا۔ اب تک یہ ساری باتیں غالباً صرف چند ایک بلند خیال لوگوں کے دل و دماغ تک محدود تھیں لیکن اگلی صدی میں تو پہلے زمانے کے سے حلقہ ہائے ذکر سے

آگے بڑھ کر بعض حلقوں میں وجد و حال کی کیفیات پیدا کرنے کی کوششیں ہونے لگیں اور ان کیفیات کو محویت اور مراقبوں وغیرہ کے ذریعہ ابھارا جانے لگا (حالت استغراق، مقام و حیرت وغیرہ)۔ صوفیائے کرام کی زیادہ تعداد اپنے اعمال و عقائد کے لحاظ سے اپنے اسلامی بھائیوں سے متفق اور متحد الخیال تھی اور انہی کی مجالس میں پہلے پہل معتزلی عقائد کی تردید ان کے اپنی ہی دلائل کے ذریعہ سے ہوئی۔ تاہم تصوف کا رجحان یہی تھا کہ علمائے دین اور متصوفین کے درمیان اختلاف کی خلیج کو زیادہ وسیع کیا جائے اور جب ان کے اصول و عقائد نے ایک پیچیدہ اور متفقہ طور پر رقیبانہ یا مخالفانہ پہلو اختیار کر لیا تو علمائے دین کو یہ احساس پیدا ہوا کہ اب اس پر ضرب کاری لگانے کا وقت آ گیا ہے۔ اس جہاد میں سب سے نمایاں شخصیت الحلاج کی ہے جو متذکرہ صدر تحریک تصوف کا سرتاج سمجھا جاتا ہے۔ (یہ نظریہ صحیح نہیں کیونکہ حلاج کے فلسفۂ تصوف پر تمام صوفی ہرگز متفق نہ تھے بلکہ اصحاب الطریقہ اور ان کے متبع سب اس کے خلاف تھے—م)۔ اس کی زندگی، عقائد اور محفوظ ملفوظات کا مطالعہ مسگنن (Massignon) نے اپنے کئی رسالوں میں کیا ہے۔ اس نے بہت بڑی حد تک حلاج کی اساسی راسخ الاعتقادی کو اس کے اس مفروضہ عقیدۂ وحدت وجود کے مقابلہ میں ثابت کر دیا ہے جس کا الزام اس پر عائد کیا گیا تھا۔ لیکن بات اصل میں یہ تھی کہ اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کی وجہ سے حکومت بغداد اس سے خائف تھی اور چند غیر محتاط جملوں کے ادا کرنے کی بناء پر علمائے دین کی ایک

مجلس نے اسے مجرم قرار دیا اور ۹۲۱ء میں اسے بڑی بے رحمی کے ساتھ قتل کرا دیا۔ (مصنف کا یہ خیال بالکل لغو ہے۔کیا جنید و شبلی سے بھی زیادہ مقبولیت حلاج کو حاصل تھی ؟ اگر کسی کی مقبولیت سے حکومت خائف ہوتی تو ان دو بزرگوں سے ہوتی جو حلاج کے ہم عصر تھے اور تمام امت میں اس وقت بھی محترم تھے اور آج بھی ہیں—م)۔ اس کی موت کے بعد تصوف کی نشو و نما دو طریقوں سے ہوتی رہی۔ ایک طریقہ یا دبستان تو یہ تھا کہ متصوفانہ زندگی کو شریعت کے مطابق رکھا جائے (اشعری) ۔ اس طریقے کے بہترین مقتداء جو غزالی سے پہلے ہو گزرے ہیں (ص ۸۵) (امام) القشیری رض (م ۱۰۷۴ع) ہیں جو ایک مقبول عوام رسالے کے مصنف بھی ہیں ۔ دوسرا گروہ وہ تھا جس کا رجحان روز بروز زیادہ سے زیادہ وحدت وجود یعنی ہمہ اوست یا قلندری (مذہبی قوانین سے مبرا) عقائد کی طرف بڑھتا چلا گیا۔گو اس قسم کے عقائد نے سر زمین عرب کی نسبت ایران میں زیادہ گہری جڑیں پکڑ لیں لیکن ہم اس کا ذکر بعد میں عربی ادبیات کے سلسلے میں کریں گے ۔ (واقعہ بھی یوں ہی ہے ۔ مجوسی ملاحدہ نے تصوف کے پردے میں بھی دعوت محمدیہ کو شکست دینے کے لیے بڑا مؤثر انداز اختیار کیا تھا ۔ جس کی قلعی علمائے ربانیین نے کھول دی—م) ۔

ان مذہبی اختلافات کا مفصل تبصرہ دو اسباب کی بناء پرضروری ہے ۔ اگر مذہبی ادبیات کا تمام ذکر سرے سے حذف ہی کر دیا جائے تو عربی ادبیات کی ترقی کی تصویر بالکل مسخ ہو کر رہ جاتی

ہے ، کیونکہ اس ادب کا زیادہ وسیع حصہ تو مذہبی قسم ہی کا ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ یہی اختلافات اس دور کے کل ادب کا صحیح پس منظر پیش کرتے ہیں کیونکہ ہر مشہور و معروف مصنف کا ان اختلافات سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور رہا ہے اور اس کی تصانیف میں اس کے رجحانات کا عکس پڑتا ہے ۔ تاہم ہمیں اس بات کی ضرورت نہیں کہ ہم مذہبی تحریکات کا ذکر دوبارہ کریں ۔ البتہ ان تحریکات کا ذکر ضروری ہوگا جو بعد کے ان مصنفین سے متعلق ہیں جو ادبیات اور دینیات دونوں میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

راسخ الاعتقاد مسلمانوں کی سب سے زیادہ اہم ادبی تحریک جو ان کے رد عمل سے متعلق ہے احادیث کو صحت کے ساتھ جمع کرنے کی تحریک ہے ۔ گو مالک بن انس رض (ص ۰ م) اور کثر علمائے دین نے یہ اصول قائم کر دیا تھا کہ قوانین مملکت کی بنیاد احادیث پر قائم ہونی چاہیے ، لیکن محدثین کی بہت بڑی تعداد استنباط احکام کی بجائے ان کا مطالعہ مذہبی ماخذ کے طور پر کیا کرتی تھی اور کوئی محدث قضاء کے عہدے کے قابل نہ سمجھا جاتا تھا جب تک وہ اصول فقہ کا مطالعہ نہ کر لے ۔ اس نقص کو دور کرنے کے لیے علم حدیث کو پیش کرنے کا ایک نیا طریقہ وضع کیا گیا ۔ پرانے زمانے کی تالیفات میں امام احمد بن حنبل رض کی تصنیف ''مسند'' (ص ۵ م) سب سے زیادہ اہم ہے ۔ احادیث کو بلا لحاظ موضوع و مضمون حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اس صحابی کے نام کے تحت اکٹھا کر دیا جاتا تھا جس کو بطور راوی سند مانا جاتا تھا ۔ نئے

طریقے میں احادیث کو مضمون وار مرتب کیا گیا۔ اس طریق کے ذریعہ یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ حدیث کے مطالعہ ہی سے خود بخود فقہ کی عملی تعلیم حاصل ہو جاتی ہے۔[1]

۱۔ مصنف محدثین کا طریقۂ کار سمجھا نہیں۔ وہ مسند احمد رض سے لیکر صحاح ستہ کی تدوین تک ارتقائی کڑیاں تلاش کر رہا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ نہیں۔ امام احمد رضی اللہ عنہ کا مجموعۂ احادیث جو مسند احمد کہلاتا ہے[1] اس کی ترتیب اسناد کے اعتبار سے ہے اور اس کا مقصد مسائل کا استخراج نہیں تھا بلکہ احادیث کو سندوں کے اعتبار سے حفظ کرنا اور مرویات کے اختلاف لفظی کو محفوظ کرنا تھا۔

اس وقت تک فقہ کے تمام مدارس اپنا کام مکمل کر چکے تھے۔ لہذا محدثین اب اس طرف متوجہ ہوئے کہ جن احادیث سے فقہائے اسلام نے مسائل کا استخراج کیا ہے انہیں فقہی ابواب کے تحت اسی طرح مرتب کر دیں جس حضرت امام مالک رض نے احادیث نبویہ کے علاوہ آثار صحابہ و تابعین کو مؤطا شریف میں مدون کرکے لوگوں کے لیے منہاج مقرر کر دیا تھا۔

صحاح کی پیروی میں دوسرے بزرگوں نے بھی وہ احادیث جمع کر دیں جو انہیں پہنچی تھیں۔ اگرچہ سنداً و متناً وہ مجروح تھیں۔ اس طرح احادیث کا وہ تمام مواد محفوظ ہوگیا جو کسی طرح اہل علم میں بار پا گیا تھا۔ اس مجموعے کے باہر جو کچھ ہے وہ چاہے کتنی ہی شاندار سند سے بیان کیا جائے قابل اعتنا نہیں۔

اس عظیم الشان کام کے بعد وقت آیا کہ ان احادیث پر تنقید کرکے جہاں تک ممکن ہو ایک اور مجموعہ مرتب کیا جائے جو ہر طرح قابل اعتبار ہو۔ یہ کام ابھی باقی ہے۔ زمانے کی سیاسی کروٹوں نے مسلمانوں کو ایسا مجموعہ مرتب کرنے کا موقعہ ہی نہیں دیا۔ اس لیے انہوں نے صحیح بخاری اور اس کے بعد صحیح مسلم کو سب سے زیادہ صحیح مجموعہ قرار دکر اسی کی اشاعت و ترویج کو اپنا شعار بنا لیا لیکن تحقیق کی جو لگن متقدمین لگ گئے تھے وہ بہر حال قائم رہی۔ چنانچہ صحاح کی جو شرحیں علمائے کبار نے لکھی ہیں ان میں یہ تنقیدی مواد ہمیں برابر ملتا ہے۔

گویا اب اگر حالات مساعد ہوں تو امت کے پاس اتنا مواد موجود ہے اور ایسی معیاری کتابیں بھی ہیں کہ ان کی مدد سے نہایت شاندار اور نہایت اعلی پایہ کا مجموعہ احادیث مرتب ہو سکتا ہے — م۔

نئی طرز کے مجموعوں میں جو مجموعہ البخاریؒ (م ۸۷۰ء)
نے تیار کیا گو اس میں سوانح، اخلاق، طب، نیز خالص فقہی
مسائل کے متعلق سب ہی قسم کی حدیثیں موجود ہیں لیکن اس
تالیف کا مقصد یہ تھا کہ یہ کتاب فقہ کے ایک مکمل ضابطے
کے طور پر استعمال ہو سکے۔ ہر باب کے عنوان میں ان احادیث
کے فقہی استعمال کے متعلق ایک پیش لفظ شامل ہے جن میں اس
باب کی کل احادیث کے فقہی استعمال پر بحث کی گئی ہے۔ بعض
صورتوں میں ہر باب کے علیحدہ علیحدہ عنوان بھی قائم کئے ہیں
جن میں ضمنی حدیثیں شامل نہیں جن سے مصنف کے نفسی رجحانات
کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے برعکس اسی زمانے کا ایک اور مجموعہ جو
مسلمؒ (م ۸۷۵ء) نے مرتب دیا۔ ہر حدیث کے موضوع کو پڑھنے
والے کی مرضی پر چھوڑ دیتا ہے اور اس کا مقصد صرف یہی ہے کہ
تمام صحیح احادیث کا مجموعہ پیش کر دیا جائے۔

یہ کوشش کافی زمانہ گزر جانے کے بعد شروع ہوئی۔
ارتقائے حدیث کی کہانی نہایت ہی عجیب و غریب ہے۔ چونکہ
متقدمین کے مسائل بے حد پیچیدہ تھے اس لیے دینی حلقوں میں ہمیشہ
اسی بات کی جستجو جاری رہی کہ جب کوئی نیا مسئلہ سامنے آئے
تو معلوم کریں کہ نبی کریم کا عمل کیا رہا۔ اس طرح علماء اپنا
فیصلہ ان احادیث کی بناء پر صادر کرتے تھے جو خود نبی کریم
کی جانب سے ان تک پہنچی تھیں۔ اس قسم کے فیصلے مختلف فرقوں اور
گروہوں کے اختلافی خیالات کے تحت صادر ہوا کرتے تھے اور اس

لیے اکثر ایک دوسرے سے بالکل مخالف ہو جاتے تھے - طلباء کو ان کے درمیان امتیازی حدود قائم کرنے کی ضرورت پیش آئی اس لیے انہوں نے پہلے پہل تو اسناد کے سلسلے کو مضبوط کیا جس کے ذریعہ ہر حدیث کی تائید ہونے لگی - چنانچہ یہ دستور قرار پایا کہ ہر حدیث کی صحت اس وقت معتبر ہو جب معتبر یا ثقہ بزرگ اس طرح اسناد کر لے کہ اس نے فلاں حدیث فلاں بزرگ سے سنی تھی جس نے اس حدیث کو کسی پہلے زمانہ کے بزرگ سے حاصل کیا تھا و علی ھذالقیاس یہ سلسلہ اس صحابی رسول تک جا پہنچتا تھا، جو یہی حدیث بیان کیا کرتا تھا یا یہ کہ اس نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم) کو ایسا عمل کرتے دیکھا - اسناد کا سلسلہ بھی اتنی ھی آسانی سے گھڑ لیا جا سکتا تھا جتنی آسانی سے کوئی حدیث وضع کر لی جاتی تھی - تا ھم اسی طریق سے کوئی دو صدیوں تک متواتر اسلام کا ھر لمحہ اسی کوشش میں گزرا کہ مخصوص نظریوں کی تائید میں مختلف احادیث حضرت رسول اکرم سے منسوب کی جائیں - (فاضل مصنف مبالغہ آمیزی سے کام لے رہا ہے - ایسے یہ معلوم نہیں کہ اس زمانے کے لوگ بیباک راستباز تھے اور حق بات کے اظہار میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے - ایسے بد بخت لوگ بہت کم تھے جنہوں نے کسی خاص فائدے یا مقصد کو مد نظر رکھتے ہوئے احادیث وضع کی ہوں - گو یہ بات صحیح ہے کہ ایسے لوگ بھی موجود تھے لیکن انہیں اس نقطۂ نظر سے لوگ ثقہ نہ مانتے اور ایسے دجالوں کذابوں کے نام اور ان کے احوال رجال

کی کتابوں میں محفوظ ھیں ــ م) مثال کے طور پر جب شیعوں نے حق خلافت کا مستحق علوی خاندان کو سمجھا تو کٹر قسم کے لوگوں نے مقابلے میں یہ حدیث پیش کر دی کہ ھم انبیاء کے گروہ کا کوئی وارث نہیں ھوتا (نحن معشرالانبیاء لا نرث ولا نورث)[1] جب طبقہ زہاد نے ترک دنیا وغیرہ کے متعلق احادیث منسوب کیں تو فقہاء اور تاجر پیشہ اور کاروباری مسلمانوں نے اس کا ایسی احادیث سے جواب دیا جن کی رو سے دنیاوی امور کی جانب توجہ دینا لازمی قرار دیا گیا تھا (یہ احادیث اپنی جگہ ھیں اور حدیث ما سبق سے کسی طرح معارض نہیں ھے ــ م) -

اسی طرح شاھی درباریوں کے عیش و نشاط کے سلسلے میں یہ اختلاف تاریخ میں بھی جا پہنچا - مورخین کا ایک دبستان جن کا

۱- مصنف نے یہ حدیث بے محل بیان کی ھے - صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے میں خلافت کی وراثت کا کوئی سوال نہیں تھا - آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بحیثیت امام جو جائداد بمد "فے" حاصل ھوئی تھی اس سے آپ کے گھر کے اخراجات چلتے تھے اور جو رقم باقی رہ جاتی تھی اسے آپ بیت المال کو واپس فرما دیتے تھے - آپ کی وفات کے بعد حضرت عباس رض اور حضرت فاطمہ رض نے اس کی تقسیم کا مطالبہ کیا تھا - اس پر حضرت صدیق اکبر رض نے یہ حدیث نبوی بیان کی تھی جس سے مستفاد یہ تھا کہ حضور کی وراثت تقسیم نہیں ھوگی بلکہ جس طرح آپ کے زمانے میں آپ کے اھل بیت پر خرچ ھوتی تھی اسی طرح ھوتی رھیگی - چنانچہ اس پر اتفاق ھو گیا - اس کی تولیت اول حضرت صدیق رض کے ھاتھ میں رھی پھر حضرت فاروق اعظم رض کے عہد میں وہ خود متولی ھوئے انہوں نے انہیں شرائط پر اسکی تولیت حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کو دے دی اور پھر جب ان میں اختلاف ھوا تو دوبارہ اسے اپنی تولیت میں لے لیا - مال غنیمت اور فے کے بارے میں فقہاء کا کچھ اختلاف ھے جس پر بحث کا یہاں موقعہ نہیں مگر یہ حقیقت ھے اور قول محکم کہ اس حدیث کا خلافت سے کوئی تعلق کسی زمانے میں کبھی نہیں سمجھا گیا ــ م -

سرداُر واقدی (ص ۱۴) ہے اس فکر میں مبتلا رہا کہ کسی طرح رسول اکرم صلی اللہ و آلہ و سلم کی نہایت سادہ زندگی کی یاد محو ہو جائے۔ وہ آئندہ زمانے کے مورخین کی تصانیف کو مشکوک اور مبہم کرنے میں کامیاب ہوگیا جن میں وہ لکھتے ہیں کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم اور ان کے اصحاب ان تمام مسرتوں سے بہرہ اندوز ہوتے تھے جو ان کے حیطۂ اختیار میں تھیں (واقدی کو تمام محدثین نے نا قابل اعتبار گردانا ہے۔ اس کی حیثیت داستان گو کی ہے اور اس کی کسی بات پر کسی مسئلے کی بناء نہیں رکھی جاتی۔ قب : السیوطی : اللا لی المصموعہ فی الا حادیث الموضوعہ۔۔م)۔

ان حالات کے باعث یہ امر ناگزیر ہوگیا کہ احادیث کے متعلق کوئی ایسا مکمل مواد جمع کیا جائے جسے ہر لحاظ سے معتبر اور صحیح مانا جا سکے۔ تمام محدثین جو اس وقت صرف اسناد ہی کے معیار کو (بظاہر) درست مانتے تھے آخرکار اس بات پر متفق ہوگئے کہ ترسیل احادیث کے لیے اسناد کے صرف چند سلسلے ہی ایسے ہیں جنہیں صحیح اور مستند مانا جاسکتا ہے۔ چنانچہ انہی اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بخاریؒ اور مسلمؒ دونوں نے لاکھوں احادیث کے مجموعے میں سے اپنی احادیث کا انتخاب کرکے انہیں صحیح کی اصطلاح سے منسوب کیا۔ ان کے اس فیصلے کو قبول کر لیا گیا اور ان دونوں صحیح احادیث کے مجموعوں کو قرآن پاک سے دوسرے درجے پر بعد کی اسلامی تاریخ میں معتبر

اور صحیح مانا جاتا ہے، یہ صرف اسلیے کہ انہوں نے ہمیشہ کے لیے اس بحث کو ختم کر دیا کہ کونسی حدیث معتبر ہے اور کونسی وضعی بلکہ اس لیے کہ انہوں نے اس تمام مواد کو یکجا جمع کرکے رکھ دیا جس کو راسخ الاعتقاد طبقہ پہلے ھی سے درست اور صحیح تسلیم کر چکا تھا۔ ان دو کتابوں کے ساتھ بعد میں چار اور کتابوں کا اضافہ ھوا جن کو ملا کر اسلامی احادیث کا مکمل مجموعہ صحاح ستہ کے نام سے مشہور ہے - شیعہ حضرات بھی بہت بڑی حد تک دو کتابوں کو صحیح مانتے ھیں لیکن ان کے علاوہ ان کے پاس اپنا معیاری مجموعہ بھی موجود ہے۔ احادیث جمع کرنے کا کام کئی صدیوں تک جاری رھا لیکن بعد کی تالیفات میں سے صرف چند ایک ھی ایسی ھیں جنہیں عربی ادبیات میں کوئی خاص اھمیت حاصل ہے -

اس سارے دور میں بصرہ اور کوفہ کے لسانیاتی دبستانوں کی حریفانہ سرگرمیاں جاری رھیں لیکن اب جدید دبستان بغداد کے مقابلے میں ان کی شہرت ماند پڑنے لگ گئی - اس دبستان کے بانی ابن قتیبہؒ (م ۸۸۰) کی تصانیف سے اس دبستان کے مقاصد کی بخوبی وضاحت ھوتی ہے۔ ان کی سب سے بڑی تصنیف ایک مبسوط ادبی قاموس ہے یعنی عیون الاخبار، دیکھیں معجم المطبوعات جو دس جلدوں پر مشتمل ہے - اس سے بعد اتنی بیشمار تصانیف اس کتاب کی عام ترتیب کے مماثل ھیں کہ یہ کتاب ھمارے لیے عربی ادبیات کی ضمن میں ایک طبعزاد مقالے کی حیثیت رکھتی ہے - ھر جلد میں

ایک مخصوص موضوع پر بحث کی ہے مثلاً شاہی و بادشاہی، جنگ، اتحاد و امن، زہد و ورع وغیر ذالک اور ہر عنوان کے تحت احادیث کلام شعراء اور ادبی اور تاریخی حوالے دئیے ہیں۔ مصنف اپنے نفس مضمون میں ایک قسم کا آزادانہ مسلک اختیار کرتا ہے۔ کہیں ایک مضمون کو اختصار کے ساتھ بیان کر جاتا ہے اور کہیں اس پر آزادانہ نظر ثانی کرکے اسے بہت زیادہ موثر کر دیتا ہے۔ صاحب استعداد اور قابل لوگوں کی نظر میں اس کا نتیجہ نہ صرف خوشگوار بلکہ دلچسپ ہو جاتا ہے۔ البتہ اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مذاق میں تقلید (؟) موجود ہے۔ اس تصنیف سے کم درجے کی تصانیف میں سے اس کی کتاب المعارف ہے، جو عربوں اور ایرانیوں کی قدیم روایات کے متعلق ہے، جس میں اسلامی تاریخ کے چیدہ چیدہ لوگوں کے مختصر سوانح حیات درج ہیں۔ دوسری کتاب "کتاب الشعر و الشعراء" (طبقات الشعراء) ہے۔ اس کتاب کی تمہید میں زمانۂ جاہلیت اور زمانۂ اسلام کے کل شاعروں کے مختصر سوانح اور ان کے کلام کا چیدہ انتخاب درج ہے۔ وہ عربی لسانیات کے سلسلے میں پہلا شخص ہے جس نے زمانۂ جاہلیت کی شاعری کے متعلق اس نظریہ کی تردید کی کہ اس زمانے کے شعراء کا کلام عدیم النظیر ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

"میں نے نہ تو قدیم زمانے کے شاعر کو محض اس کی قدامت کی وجہ سے ترجیح دی ہے اور نہ موجودہ زمانے کے شاعر پر اس کے دور حاضرہ کے خیالات کے باعث ملامت کی ہے بلکہ میں نے ایک

آنکھ سے ان دونوں کا موازنہ کیا ہے اور ہر ایک کے متعلق ان کے مراتب کے مطابق اظہار خیال کیا ہے . . . . خدائے پاک نے علم و فضل اور شعر و سخن اور بلاغت و فصاحت کے حلقے کو کسی خاص زمانے کے لیے محدود نہیں کیا اور نہ کسی ایک قوم کے لوگوں کو اس لحاظ سے دوسروں لوگوں سے ممتاز و سرفراز فرمایا ہے، بلکہ اس نعمت عظمی کا اپنے ہر زمانے کے بندوں کو برابر کا حصہ دار کر دیا ہے۔ وہ ہر قدیم چیز کی ہر نئے زمانے میں تجدید کرتا ہے اور ہر عزت کی ابتداء نودولتی سے ہے۔"[۱]

اس کی دوسری بہت سی تصانیف میں سے دو کتابیں قابل ذکر ہیں ۔ ایک تو اسلوب بیان کے متعلق ہے جو اس نے کاتبوں (Secretaries) کے فائدے کے لیے لکھی اور علم حدیث میں ایک کتاب تاویل مختلف الحدیث تصنیف کی ۔ ان میں سے کوئی کتاب بھی عالمانہ مقصد کو مد نظر رکھ کر نہیں لکھی گئی ۔ ان تصانیف کا مقصد صرف یہ تھا کہ سرکاری عہدہ داروں اور کتاب بیں حضرات کی خاطر ان تمام موضوعات کو مہیا کر دیا جائے جو ادب کے تحت شمار ہوتے ہیں اور یہ اصطلاح فرانسیسی اصطلاح Belles Letters (خالص ادبی تصانیف) کے لگ بھگ ہے ۔

اسی زمانے علم تاریخ کے با اصول مطالعہ کے ضمن میں جو ترقی ہوئی وہ بھی خاص طور پر دلچسپ ہے ۔ علم تاریخ کا خام مواد ابتدائی رسالوں کی شکل میں پہلے ہی سے موجود تھا ۔ اب باقی

۱۔ کتاب الشعر ص ۷ ؟

کام صرف یہ رہ گیا تھا کہ انہیں ترتیب دے کر یکجا اکٹھا کرکے مکمل کتابوں کی صورت میں منتقل کر دیا جائے۔ علم تاریخ کے موضوع پر سب سے پہلی اہم کتاب بلاذری (م ۸۸۲ء) نے فتوحات کے موضوع پر فتوح البلدان کے نام سے لکھی۔ اس کتاب میں ہر ولایت کی فتوحات کا ذکر ترتیب وار درج ہے اور عام طور پر ان میں اختلافی روایات کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ یہ کتاب منہاج تحقیق کے اعتبار سے انتخابی قسم کی ہے۔ البتہ یہ ایک بحث طلب مسئلہ ہے کہ آیا یہ ایک قدرتی اقدام تھا جو تاریخ نویسی کے سلسلے میں کیا گیا یا یہ طریق عمل خارجی اثرات کا نتیجہ تھا۔ اسی زمانے میں یعقوبی (م ۸۹۱ء) نے انہی اصولوں پر کاربند ہو کر تاریخ عالم پر سالوار ترتیب میں ایک کتاب لکھی جس میں شیعی نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھا اور اس کے علاوہ تاریخی جغرافیہ کے موضوع پر بھی ایک کتاب تصنیف کی، جو عربی ادبیات میں اپنی قسم کی پہلی کتاب تھی۔

بلا شبہ یہ دونوں کتابیں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بے حد قابل قدر ہیں لیکن طبریؒ (م ۹۲۳ء) کی ضخیم تاریخ ان سے کہیں زیادہ سبقت لے گئی۔ آخری چند صدیوں کے اسلامی علم و فضل کی مخصوص حالت یہ ہے کہ گو قرون وسطیٰ کے کتب خانوں میں اکثر اوقات اس کتاب کی بیس بیس جلدیں بھی محفوظ رہیں لیکن اس بات کا سہرا پچھلی صدی کے یورپین علماء ہی کے سر رہا کہ انہوں نے چند منتشر مخطوطات کو جمع کرکے اس لاجواب تصنیف

کو عربی ادبیات میں دوبارہ شامل کیا۔ طبری کی تصنیف میں ان کے اپنے زمانے کے مہذب علم و فضل کی بہترین شان ظاہر ہوتی ہے۔ وہ ۸۳۹ ع میں طبرستان کے شہر آمل میں پیدا ہوئے تھے۔ وہی میں تعلیم پائی اور امام ابن حنبل رض کی موت سے صرف چند دن بعد ہی بغداد پہنچے۔ پھر بصرہ، کوفہ اور ملک شام کے مختلف شہروں اور فسطاط (قاہرہ قدیم) کے کئی اساتذہ کی شاگردی کا فخر حاصل کیا۔ اس کے بعد وہ بغداد میں آ کر آباد ہو گئے۔ چالیس سال کے متواتر مطالعہ کے بعد انہوں نے ابتدائی اسلام کے تمام علوم از قسم لسانیات دینیات اور تاریخ، میں ایسی تکمیل کی، جس کی مثال نہ تو اس سے پہلے ملتی ہے اور نہ بعد میں۔ اس کے بعد مزید چالس سال انہوں نے درس تدریس اور تصنیف و تالیف کے کاموں میں صرف کیے۔ وہ لازمی طور پر ایک مانے ہوئے محدث تھے۔ مزید براں بے حد خود مختار، انہوں نے علم فقہ کا ایک علیحدہ دبستان قائم کیا۔ (جو بمشکل تمام ان کی زندگی کے ساتھ ہی بہہ سکا)۔ انہوں نے اپنے آپ کو انہی دو بڑے کاموں کے لیے وقف کر دیا۔

ان کے مطالعہ کا بہترین موضوع وحی ہی رہا، جس کے متعلق ان کا دوسرا تصور تھا، یعنی اللہ کے تحریری کلام کو تو وہ قرآن پاک میں پاتے تھے اور مشیت ایزدی کا اظہار تاریخ میں۔ چنانچہ یکے بعد دیگرے ان کی دو تصنیفیں یعنی تفسیر قرآن اور تاریخ عالم، معرض وجود میں آئیں۔ موخرالذکر تصنیف کی بنیاد بھی دینی اصولوں پر ہی قائم کی گئی۔ اس سے بعد کے زمانے میں

بھی دونوں کتابیں علوم قرآن و تاریخ کی اساس قرار پائیں۔ علم تاریخ مسلمہ طور پر دونوں میں کمزور ہے اور اس کی تدوین کے لقائص مصنف کی[۲] ضعیف العمری کی وجہ سے قابل در گذر ہیں تاہم اس تاریخ کو تفسیر قرآن کے مقابلہ میں زیادہ تیزی کے ساتھ ایک مستند حیثیت حاصل ہوگئی' کیونکہ تفسیر کے مقابلہ میں یہ زیادہ مکمل تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اول تو مقابلہ میں کوئی برابر کا مصنف موجود نہ تھا ' دوسرے اس کا مواد قرآن کی تفسیر کے مشابہ نہ تھا کہ وہ دو مخالف فریقوں کے درمیان وجہ اختلاف بن سکتا۔ لیکن تمام غیر جنبہ دار لوگوں کے فیصلے کے مطابق نہ تو پہلے زمانے میں کوئی ایسی تصیف مکمل ہوئی اور نہ بعد میں' جو مواد کی فراوانی' جامعیت' ٹھوس علم[۱] اور اجتہاد کے اعتبار سے طبری کی تفسیر کا مقابلہ کر سکے۔ چنانچہ اسلام کی مشرقی دنیا کے راسخ العقیدہ مکتبہ میں یا اصول مطالعہ کے سلسلے میں یہ کتاب سند تسلیم ہونے لگی۔

(Zotsch fur Deutsche Norgenland : O. Loib Gesell)

ff ۵۸۹ 'XXX'

طبری کی تاریخ میں بلاذری کے انتخابی طریق تحقیق سے انحراف کرتے ہوئے سالوں اور صدیوں کی ترتیب کے مطابق ہر واقعہ کا سالوار ذکر درج ہے۔ یہ بیان مسلسل نہیں ہے بلکہ ہر واقعہ کا ذکر جس طرح مختلف اسناد کے ذریعہ آیا ہے اسی ترتیب سے اسے درج کر دیا گیا ہے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ایک ہی کتاب میں عربوں کی تمام تاریخی روایات کو ابتدائی قبائلی ماخذ اور

مدائینی کی زیادہ تنقیدی تصنیف ، دونوں سے جمع کر کے یکجا
کر دیا جائے جس طرح اس سے پہلے انہوں نے ان تمام احادیث کو
جو قرآن سے متعلق تھیں جمع کیا تھا۔ لیکن اس کتاب میں وہ
شاذ ہی کوئی تنقید کرتے ہیں یا کوئی خاص ترجیح ظاہر کرتے
ہیں۔ چنانچہ یہ کتاب کچھ بے ربط سی معلوم ہوتی ہے اور بعض
صورتوں میں تو تشنۂ تکمیل بھی نظر آتی ہے۔ مثلاً فتوحات ہسپانیا
کا ذکر صرف چھ سطروں ہی میں ختم کر دیا ہے۔ لیکن یہ امر
قابل لحاظ ہے کہ صرف طبری کی تاریخ کی اشاعت کے بعد ہی سے
یہ بات ممکن ہو سکی ہے کہ تاریخ اسلام کے ابتدائی حصے زیادہ
وضاحت اور یقین کے ساتھ واضح ہوں۔ زمانۂ جاہلیت کی تاریخ
کے متعلق وہ عام طور پر عربی اور ایرانی مآخذ ہی استعمال کرتے
ہیں۔ (اصل بات یہ ہے کہ طبری مورخ نہیں ہیں بلکہ تاریخی
روایات کے جامع ہیں۔ اسی لیے انہوں نے سندیں دی ہیں اور
تنقید نہیں کی —م)۔

اس کے مقابلہ میں طبری کے جانشین مسعودی (م ۹۵٦ء)
نے جو طریق عمل اختیار کیا وہ بالکل ہی مختلف ہے۔ اس نے
اپنی ابتدائی زندگی میں علوم دین کی جگہ فلسفے اور سائنس کا مطالعہ
کیا اور کئی سال تک متواتر مشرق میں وہ بحری اور بری سفر
کرتا رہا۔ دوسری قوموں کے لوگوں سے میل جول ہو جانے کی
وجہ سے ، نیز اس باعث سے بھی کہ اس نے اپنی ابتدائی زندگی میں
اچھی تعلیم پائی تھی ، اسے علم تاریخ ، جغرافیہ ، فلسفہ ، مسلمانو

کے مذاہب ، اور ان کے پڑوسیوں اور ان کے پیش رووں کے طور طریقوں کے متعلق ، ایک مبسوط قاموس مرتب کرنے کے لیے ضروری مواد مل گیا ۔ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ اس کی تیس جلدوں کی کتاب میں سے ہم تک صرف ایک جلد پہنچی ہے اور وہ بھی دوسری جلدوں کی نسبت کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتی ۔ صرف ایک جلد ایسی ہے جو اس کی مکمل تصنیف کا اختصار ہے ۔ ایک دوسرا اختصار جو مروج الذہب کے نام سے شائع ہوا کوئی چھ سو صفحات کی کتاب ہے ، جس سے ہمارے اس نقصان عظیم کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے ۔ مصنف کا بے ترتیب اسلوب بیان جس کے ذریعہ وہ بیسیوں قسم کے موضوعات مثلاً تاریخ ، موالید ، علم تاریخ ، جغرافیہ ، علم النسل ، مذہب ، طب اور نہ معلوم کیا کیا سب پر بحث کرتا ہے ۔ اس کی وسعت نظر اور بیشمار واقعات اور حوادث کا بیان کچھ ایسا ہے کہ وہ مطالعہ کرنے والے کو متواتر محو حیرت بنائے رکھتا ہے اور یہ دلچسپی برابر قائم رہتی ہے ۔ گو عجیب و غریب واقعات کی تفاصیل کے متعلق وہ ہمیشہ اپنی بڑی تصنیف کے حوالے دیتا ہے ، لیکن اس خلاصے میں بہت سا قیمتی تاریخی مواد محفوظ ہے ۔ اپنی موت سے کچھ عرصہ پہلے اس نے فسطاط میں اپنی تصانیف کا تفصیلی اشاریہ مع ضمیمہ و تصحیح وغیرہ مرتب کیا اور اس کتاب کا نام اس نے کتاب الرسائل والا ستذکار رکھا ۔ اس زمانے سے لے کر ، زمانۂ ما بعد تک مسلمانوں کے مطالعہ میں ، علم تاریخ کی تحصیل کو بھی ایک مستحکم مقام حاصل ہو گیا اور یہ

مقام ہمارے زمانے تک بر قرار رہا ہے - اس علم کو اسلامی ادبیات
کی ہر زبان میں ایک مخصوص اہمیت حاصل ہے - اس زمانے میں
علم جغرافیہ کے متعلق نہایت وسیع اور مختلف النوع معلومات کا
اضافہ ہوا - دوسرے علوم کے مطالعہ کی طرح، علم جغرافیہ کے
مطالعہ کا ذوق یونانی تصانیف کی وجہ سے پیدا ہوا تھا - (یہ درست
ہوگا لیکن فاضل مصنف شاید اس نقطۂ نظر کو فراموش کر گیا ہے
کہ یہ ذوق بھی احکام قرآنی کے ماتحت پیدا ہوا - سیروا فی لارض—م).
اس سلسلے میں الکندی کے استفادہ کے لیے بطلیموس کی تصانیف کے
تراجم ہوئے - ادبیات کی ہر صنف میں زمانے کی ذہنی ذکاوت طبع
کے آثار رطب و یابس ہر پہلو میں بڑی فراوانی اور شان کے ساتھ
نمایاں ہیں - سڑکوں کے موضوع پر ابن خورداذبہ (ص ۷۰) کی
طرز پر بیسیوں کتابیں موجود ہیں - جغرافیے کے موضوع پر ریاضی
اور پیمائش کی کتابیں ممالک کے نقشے اور جہازرانوں کے استعمال
کے لیے تقویمیں، عجائب و غرائب عالم کے مفصل حالات، مسافروں
کی رہنمائی کے لیے ضروری کتابیں غرضیکہ ہر قسم کے علم و فن کی
تصانیف موجود ہیں - یہ سب کتابیں اپنی اپنی جگہ بے حد قابل
قدر اور دلچسپ ہیں - لیکن جغرافیہ دانوں کے تذکرے تو ان سب
سے زیادہ دلچسپ ہیں - یعقوبی کا ذکر پہلے آ چکا ہے - دسویں صدی
عیسوی میں اس کی پیروی، کئی ایک ان تھک اور مستقل مزاج
سیاحوں نے کی، جنھوں نے تمام اسلامی دنیا کی ایک سرے سے لے
کر دوسرے سرے تک سیر کی اور اپنے ذاتی مشاہدے کی بنا

وہ ہمارے لیے مختلف ولایات کا مفصل تذکرہ ضبط تحریر میں لا کر چھوڑ گئے - ان میں دو شخص عظیم الشان شخصیت کے مالک تھے یعنی ابن حوقل جس نے ۹۷۷ع میں ایک پہلے مصنف الاصطخری کی ایک تصنیف کو جو ۹۵۱ع میں لکھی گئی تھی زیادہ وسیع کیا۔ المقدسی جس کی تصنیف پہلے پہل ۹۸۵ع میں شائع ہوئی اور ۹۸۸ع میں اس پر نظرثانی کی گئی ' ان دونوں کتابوں میں صحت بیان کو خاص طور پر ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے - تاہم مقدسی' نہ صرف اسلوب بیان کے اعتبار سے' ابن حوقل پرگونہ سبقت لے گیا ہے ' بلکہ اس نے کسی حد تک ہمارے موجودہ زمانہ کے با اصول جغرافیہ نویسی کی طرح بھی ڈالی ہے ' کیونکہ اس نے اپنے بیان میں ان لوگوں کے مختلف رسم و رواج ' اوضاع و اطوار ' عقائد اور اچھی یا بری صفات کا بھی ذکر کیا ہے جن کے ملکوں میں اسے سیروسیاحت کرنے کا اتفاق ہوا -

ہمیں کسی حد تک ان سفیروں کی بھی سرگرمیوں کا پتہ چلتا ہے جو غیر ممالک میں گئے مثلاً وہ سفارت جو ملک روس میں ابن فضلان کے ماتحت ۹۲۱ع میں بھیجی گئی یا وہ سفارت جو ہسپانوی یہودی ابن یعقوب کی قیادت میں آٹو اعظم کے دربار میں۔ سیر و سیاحت کے متعلق تمام کتابیں بے حد مقبول ہوئیں - عرب ہمیشہ سے جہاں گشت لوگ شمار ہوتے ہیں- فریضہ حج بیت اللہ کی وجہ سے ان کے اس شوق کی اور بھی حوصلہ افزائی ہوئی اور اس وجہ سے غیر ممالک کے عجائبات کا مطالعہ کرنے کا شوق ا

ہی بڑھ گیا - سیاحوں کی ابتدائی سرگذشتیں جو انھوں نے ہندوستان ،
فریقہ اور ملک چین کے متعلق لکھی ہیں ہمارے پاس موجود ہیں ۔
ن کے ذریعے ایک سلسلۂ تاریخ ۸۵۱ع میں بندرگاہ سیراف میں
رتب ہوا (بظاہر یہ تاریخیں سیاحوں کے زبانی بیانات کے مطابق
رتب ہوئی ہوں گی) - ان کے ساتھ ایک تکملہ بھی شامل ہے جو
۹۱۰ سے شروع ہوتا ہے ۔ اس تاریخ کی قدیم مقبولیت کا عکس
عد کے زمانے کے مغرب میں ظاہر ہوا ، جہاں یہی سب سے پہلی
یر سائنٹیفک کتاب ہے جس کا ترجمہ ایک یورپین زبان میں ہوا ۔
عجائب و غرائب عالم کا ذکر اس سے بعد کی کتاب ''عجائبات ہند''
یں زیادہ ہے ، جو ۹۵۰ میں رام ہرمز کے ایک ایرانی جہازران
نے لکھی تھی - اسی موضوع کے قریب قریب جغرافیہ اور روائتی
تاریخ کا ایک خلاصہ '' خلاصۃ العجائب '' کے نام سے بھی ہے ، جس
یں خاص طور پر ملک مصر کا ذکر زیادہ ہے ۔ اس کا نفس مضمون
زیادہ تر مسعودی کی کتاب سے ماخوذ ہے ۔

اسی دور میں قرون وسطیٰ کا سب سے بڑا طبیب رازی بھی
پیدا ہوا جو یورپ میں Rhazes کے نام سے مشہور ہے - اس کی
زندگی کا زیادہ حصہ ایران میں گزرا لیکن کچھ عرصے تک وہ بغداد
کے سب سے بڑے شفاخانے کا طبیب اعلیٰ بھی رہا - اس کی متعدد
تصانیف ہم تک پہنچی ہیں ، جو عربی زبان میں بھی ہیں اور ان کا
لاطینی ترجمہ بھی ہے ۔ ان میں اس کی معرکہ آرا تصنیف ''الحاوی''
بھی شامل ہے جو اس کی وفات کے بعد دستیاب ہوئی - اس کے

علاوہ متعدد ضمیمے اور بے شمار رسالے بھی ہیں جن میں سے زیادہ شاندار وہ رسالہ ہے جو چیچک کے مرض پر لکھا ہے۔ اس کی تصنیف کا نہایت دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس نے مختلف قسم کے مریضوں کے متعلق اپنا تجزیہ طبی بھی لکھا ہے جس کے ذریعے بعد کے مصنفین کو مثالیں پیش کرنے کے لئے ایک بیش بہا خزانہ مل گیا (اس کی مثال پروفیسر ای۔جی۔ براون کی تصنیف Arabian Medicines ص ۵۱ تا ۵۳ میں ملے گی۔ یہ مواد بھی اسی کتاب سے ماخوذ ہے)۔

فصل۔ ۴۔ (۹۴۵ء سے ۱۰۵۵ء تک)

بغداد میں ترکوں کی غیر منظم حکومت کوئی ایک صدی تک رہی جسے ایرانی خاندان بویہ نے ختم کیا۔ اس خاندان نے ۹۴۵ء میں شیعہ ہونے کے باوجود، ترکوں کی جگہ، خلافت کی حفاظت کی ذمہ داری لی۔ شیعہ مذہب ہونے کی وجہ سے انھیں راسخ الاعتقاد سنی مذہب کے لوگوں سے بہت تھوڑی ہمدردی تھی اور اس لیے ان کے علاقوں میں عراق، رے اور فارس کی تین ولایتوں میں جہاں ان کا اقتدار قائم ہوا ایسے رجحانات کو، جنھیں راسخ العقیدہ اہل سنت والجماعت نے بہت کچھ دبا رکھا تھا، از سر نو آزادی عمل حاصل ہو گئی اور یوں بغداد کی مرکزی کمزوری اور جدید طاقتور مملکتیں جو عباسیوں کی سلطنت عظیم کے تقسیم ہو جانے پر معرض وجود میں آ گئیں، عربی ادبیات کی مرکزی

حیثیت کو کمزور کرنے میں بہت کچھ اثرانداز ہوئیں ۔

(الف) دربار سیف الدولہ ۔ چند سالوں تک تو عربی ادبیات کی ترقی کا رخ شمالی شام میں حلب کے مقام پر مرتکز رہا ، جہاں شیعوں کا ایک چھوٹا سا خاندان حکمران تھا ۔ سیف الدولہ (۹۴۴ع تا ۹۶۷ع) کے دربار میں ایسے صاحب کمال لوگوں کا مجمع رہتا تھا جس کی مثال ہمہ گیر ادبی سرگرمیوں کے اعتبار سے شاید ہی کہیں ملے ۔ اس کی سخاوت اور دریا دلی کی وجہ سے بڑے بڑے مشہور روزگار علماء و فضلاء اس کے دربار میں کشاں کشاں چلے آئے اور ان کی وجہ سے اس کے نام کو دوامی شہرت نصیب ہوئی ۔

خالص عرب ممالک میں ادبیات کی تجدید کے ساتھ ساتھ شعر و سخن کے چشمے بھی اچانک ابل پڑتے ہیں اور اس لیے حلب بھی ان حالات سے مستثنے نہ رہا ۔ سیف الدولہ کا درباری شاعر المتنبی تھا (م ۹۶۵) ۔ یہ لقب جس کے معنی ”مدعی پیغمبری“ ہے اس کی ابتدائی زندگی کے ایک واقعہ کی وجہ سے مشہور ہو گیا ہے جب وہ قید سے بھاگ نکلا تھا ۔ اس شخص کو بعض مقامی نقادوں کے نزدیک عربی زبان کا سب سے بڑا شاعر مانا جاتا ہے ۔ کم از کم سب سے بڑا آخری شاعر تو ضرور تھا ۔ اس کی شاعری کے متعلق یوروپین نقطہ نظر کو پروفیسر براکلمن نے مختصراً ان الفاظ میں پیش کیا ہے :

”متنبی نے درحقیقت سب سے بڑا کام یہ کیا کہ شعر و سخن

کی تخم ریزی، جو قصیدے کی پرانی طرز کے تحت ہو چکی تھی، اور جس کی آبپاشی بنو امیہ کے زمانے کے مشہور و معروف شعراء نے اپنی روانی طبع کے ذریعہ کی، اس کو نہ صرف بار آور کر کے بلکہ پھل پھول سے لاد دے۔ اس نے اس فن کو اوج کمال پر پہنچا دیا اور اکثر اوقات ایسے انتہائی پھیکے پن تک بھی لے گیا۔ شعرائے بغداد کی صنعتگری اور ایرانی ذکاوت کی آبداری سے وہ عملی طور پر بالکل متاثر نہ ہوا۔ گو ان لوگوں کو کئی پہلوؤں سے اپنے عجمی ہونے کا کھلا احساس تھا، اسے بھی خالص عرب ہونے پر پورا ناز تھا اور اس اعتبار سے وہ عجمیوں کے غلبے کو خود اپنی ہتک سمجھتا تھا۔ اس معروضی قدر شناسی سے، جس کے لیے اس کا فن یقیناً مستحق ہے، یہ مراد ہرگز نہیں لی جا سکتی کہ وہ ہمارے موضوعی احساس پر بھی اثر انداز ہو۔ گو پرانی شاعری میں اس کے اسلوب بیان یا عام رنگ سے نا آشنا ہونے کے باوجود، ہم اشعار کی پاکیزگی کی تعریف کرنے کو تیار ہیں، لیکن متنبی کے کلام کی یہ صورت معلوم ہوتی ہے کہ اس نے ہر چیز میں غلو اور مبالغہ کر کے اسے حد اعتدال سے کہیں زیادہ بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے۔ اس کے کلام میں ان تصورات اور استعاروں کا کہیں نشان تک بھی نہیں ملتا جن کی اس شاعر کے قدرتی ماحول میں فراوانی تھی، بلکہ وہ دور از کار اور زیادہ تر کچھ اوٹ پٹانگ سے معلوم ہوتے ہیں یعنی آدھا تیتر آدھا بٹیر"۔

باینہمہ انہی محاسن کو عرب نقادوں نے بہت بڑی حد تک

سراہا ہے اور اس وجہ سے اس کی شاعری کو ایسی مقبولیت حاصل ہوئی جو آج تک قائم ہے - عام مقبولیت کے اعتبار سے وہ اپنے معاصر ابو فراس (م ۹۶۸ع) کے کلام پر بالکل چھا گیا ہے - ابو فراس سیف الد ولہ کا ایک بھتیجا تھا ' جس کا کلام اسی نقاد کی رائے کے مطابق اس کے اپنے ہی کارناموں یا سرگذست کا منظم روزنامچہ ہے اور فن شاعری کے محاسن کے لحاظ سے اسلوب بیان میں متنبی کے مقابلے میں کہیں پیچھے ہے اور اس کے اصلی جذبات کا بدل نہیں ہو سکتا -

بہر حال اگلی نسل میں عربی نثر کے ارتقاء کے سلسلے میں ایک فوری اقدام کیا گیا - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی زمانے میں سجع کو خاص ادب و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا کیونکہ اسی صنعت کا استعمال قران پاک کے متن میں ہے - اسی وجہ سے ناپاک یا نجس مقاصد کے لیے اس کا استعمال ممنوع سمجھا جاتا تھا - کم ازکم دو صدیوں تک جامع مسجدوں میں شاہی خطبہ سجع ہی میں پڑھا جاتا رہا - اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ دوسری صدی ہجری میں اسی قسم کے خطبے عام طور پر بازاروں میں وعظ کرنے والے خطیب پڑھا کرتے تھے - سیف الدولہ کے درباری واعظ ابن نباتہ (م ۹۸۴ع) نے اپنے تمام وعظ سجع ہی میں لکھے - ان مواعظ کو اس کے بیٹے نے جمع کیا - اسلوب بیان اور نفس مضمون کے اعتبار سے ان کو بڑی وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے - بنی امیہ کے دور حکومت میں شاہی خط و کتابت بھی اسی

قسم کی طرز تحریر میں ہوا کرتی تھی اور اس قسم کے کئی قدیم مخطوطات فصاحت و بلاغت کے نمونے کے طور پر نشر بھی کیے گئے ۔ اس قسم کا ندرتی اور مزین اسلوب بیان، مستقل طور پر، عام ادبیات سے الگ تھلگ نہ رکھا جا سکتا تھا اور جونہی مقالات اور مضمون نویسی کو ادبیات کی ایک مستقل صنف تسلیم کر لیا گیا، یہ امر ناگزیر ہو گیا (بالخصوص ماہرین لسانیات کے حلقوں میں)، کہ عبارت میں رنگینی، دانائی، اور چمک پیدا کرنے کے لیے سجع کا استعمال کیوں نہ کیا جائے ۔ اس مقصد کے لیے سجع کے استعمال کا زمانہ ان رسائل مخطوطات کے جمع کرنے کی تاریخ سے شروع ہوتا ہے جو ابوبکر الخوارزمی (م ۱۰۰۲ ع) نے معاصر اصحاب کو لکھے تھے ۔ خوارزمی کی ادبی زندگی حلب میں شروع ہوئی ۔ یہ اسلوب، جنگل کی آگ کی طرح، تمام مشرقی ولایات میں پھیل گیا اور اس کی سرگرم پیچیدگیوں نے اس سرعت کے ساتھ ترقی کی، کہ الخوارزمی بھی اپنی موت سے قبل ہی اس میدان میں مات کھا گیا ۔ (نوٹ—عرصہ دراز تک یہ دستور قائم رہا کہ کتابوں کے دیباچے سجع میں لکھے جاتے تھے اور اس صنعت کا زیادہ وسیع استعمال جاحظ اور مقدسی نے کیا، لیکن ۹۸۵ کے بعد موخرالذکر لکھتا ہے کہ اس کے زمانے میں ادباء منظوم کلام کے مقابلے میں نثر کو زیادہ پسند کرتے ہیں، لیکن سوقیانہ مذاق والے لوگ مقفے اور مسجع عبارت پسند کرتے ہیں ۔ دسویں صدی میں سجع کے ارتقاء کی تمثیلات کے

لیے قب Mez : Die Renaissance des Islams، ۲۳۱ تا ۳۰۸) -
اس ممتاز ماحول کے پس منظر میں، مسلمانوں کا ایک بہت بڑا مفکر بھی رھتا تھا، جس کی طرف اس وقت کے لوگوں نے بہت کم التفات کیا - اس کا نام الفارابی (م ۹۵۰ ع) ھے، یہ شخص وسط ایشیاء کی ترکی نسل سے تھا - طب اور موسیقی پر اس کی تصانیف، معیاری کتابیں سمجھی جانے لگیں، لیکن اس کا نام زیادہ تر اس لیے اب تک زندہ ھے کہ اس نے عرب فلسفہ کی بڑی خدمت کی - اس کی بڑی کوشش یہی تھی کہ ارسطو اور افلاطون کے فلسفے میں ہم آھنگی پیدا کر دے (جن اصولوں کے زیادہ تر جدید افلاطونی دبستان فلسفہ کے پیرو قائل ھیں) لیکن وہ اسلامی عقاید کا سختی سے پابند رھا اور اسی کد و کاوش میں مصروف رھا کہ یونانی فلسفہ کو اسلامی اصول و عقاید کے مطابق بنائے - اس کی سب سے زیادہ دلچسپ تصنیف "جمہوریہ" کا اسلامی نظریہ ھے جس میں مذھب اور حکومت دونوں کو یکجا کر دیا گیا ھے -

شام کا دبستان سیف الدولہ کی وفات کے بعد ھی ختم ھو گیا، لیکن ایک دیرپا شخصیت کا ذکر ضروری ھے، جو اس دبستان کے باقیات سے تعلق رکھتا تھا - ابوالعلاء المعری (۹۷۳/۱۰۵۷) کے عربی ادبیات میں ایک تنہا اور اچانک وجود پیکر خیالی کی طرح نظرآتا ھے، گو عنفوان شباب ھی میں وہ بصارت سے محروم ھو چکا تھا - اس نے حلب میں تعلیم حاصل کی اور کچھ عرصے

تک بغداد میں بھی رہ کر قسمت آزمائی کی۔ لیکن آخر میں وہ اپنے وطن مالوف چلا گیا۔ اس کا پہلا کلام اس زمانے کی مصنوعی شاعری سے قدرے مختلف ہے اور اس کے دیوان کا نام "سقط الزند" ہے۔ اس کے بعد کے زمانے کے کلام میں جو "اللزومیات" کے نام سے شائع ہوا، قافیوں کی پیچیدگی اور الفاظ کی مطابقت نمایاں ہے، جیسا کہ دیوان کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ اس کلام کی وجہ سے اس کا نام نہ صرف شعرائے کبار میں مشہور ہوتا ہے، بلکہ وہ بڑے اعلیٰ درجہ کا انسان شناس بھی فطرت انسانی کا ماہر اور محقق نظر آتا ہے، گو اس کا فلسفہ قنوطی قسم کا ہے۔

پروفیسر نکلسن لکھتے ہیں کہ "وہ عقل و فکر کی رہنمائی میں انسانوں اور دوسری چیزوں کا آزادی کے ساتھ جائزہ لیتا ہے جو اس زمانے کے حکمرانوں اور بڑے بڑے امراء کے نزدیک ضرور قابل شرم ہوگا۔ انسانی الحیہ میں اس کے غور و فکر میں بداخلاقی، ریاکاری اور توہمات کی زندگی سے شدید نفرت ٹپکی پڑتی ہے اس نے برائی اور جہالت کو بالکل برہنہ کرکے رکھ دیا ہے، تاکہ اس کے ذریعہ نیکی اور دانائی کی تلاش ہو سکے۔ اس کے کلام میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانے کی معاشرت کو خوف و انعام کی فکر سے آزاد ہوکر بیان کیا گیا ہے اور اس میں زیادہ مزے کی بات یہ ہے، کہ شاعر بایں کمال خود بھی شکوک و شبہات کی قیود میں مبتلا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اسے اپنے ضمیر کی آواز پر پورا بھروسہ ہے، کہ اس سے اس کی تمام مشکلات

حل هو جائیں گی اور اسے وہ روشنی حاصل ہو گی جس کی تمنا سب کو ہونی چاہیے ۔ تاہم 'لزوم' کا بہت زیادہ حصہ ایک ہی انداز کا ہے ۔ بہت سا کلام بے لطف اور مغلق ہے اور ہمارے ذوق سے بہت زیادہ اونچا ۔ اسے پڑھکر ہم میں تعریف اور ناپسندی کے جذبات اکٹھے پیدا ہوتے ہیں ۔ اس سے جوش پیدا ہوتا ہے، تکان ہو جاتی ہے، حیرت و استعجاب پیدا کرتا ہے اور پھر ناگوار بھی معلوم ہونے لگ جاتا ہے ۔ جب یہ سب کچھ ہو لیتا ہے تو یہ کلام اپنی یکتائی اور غیرفانی حالت کو قائم رکھتا ہے کیونکہ اس کے ذریعہ ایک غیر معمولی انسان کی شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے :

"'کیا مسلمان کیا عیسائی کیا یہودی اور کیا گبر سب گنہگار ہیں لیکن دو قسم کے آدمی عالم گیر انسانیت کے فرقے کے بانی ہیں، ایک تو وہ ذہین آدمی، جو لا مذہب ہو اور ایک وہ مذہبی آدمی جو ذہین نہ ہو'' (Eastern Poetry and Prose A.R. Nicholson ص-۱۱)

اس کے مسلم معاصر، گو اس کا درس سننے کے لئے جوق جوق آیا کرتے تھے، اس کی شخصیت کو پوری طرح نہ سمجھ سکے اور اس کے جانشینوں کو اس کی 'لزومیات' میں ایسا مواد نظر آیا جو مسلمان ہونے کی حیثیت میں ان کو ناگوار گزرا ۔ انہیں ابوالعلاء کا فلسفہ لاادریت جس سے عام مذہبی لاتعلقی ظاہر ہوتی تھی، پسند نہ آیا اور حسن پسندوں کو یہ بات ناگوا

تھی کہ اس میں عربی شاعری کے روایتی اصولوں اور قاعدوں کو ملحوظ نہ رکھا گیا تھا۔ بہر حال عام طور پر وہ "سقط الزند" کو "لزومیات" کے مقابلہ میں بہتر سمجھتے ہیں۔ موجودہ زمانے کے یورپی نقاد بعض اوقات حد سے زیادہ مبالغہ آمیزی سے کام لیتے ہوئے اس سے ایسی ترقی یافتہ فلسفہ کو منسوب کرتے ہیں جس سے وہ غالباً خود بھی معاذ اللہ معاذ اللہ کہتے ہوئے کوسوں دور بھاگتا۔ ابوالعلاء نثر نویس کی حیثیت سے کچھ زیادہ کامیاب نہ رہا۔ اس مصنف کی تصانیف میں اس کی کتاب "رسائل" بہت زیادہ اہم ہے۔ اس کے ایک حصے کا مجموعہ، مصنف نے خود مرتب کیا ہے اور اب تک محفوظ ہے۔ یہ رسائل نہایت شاندار مقفی نثر میں لکھے ہوئے ہیں اور ان میں تلمیحات اور خوش اسلوبی کی مثالوں کی کثرت ہے۔ اس قسم کی تمام تصانیف ہمارے مذاق کے مطابق کچھ مصنوعی اور مغلق سی معلوم ہوتی ہیں۔

(ب) عراق اور خاندان بویہہ کا دور حکومت: اگرچہ خالص عرب عناصر سیف الدولہ کے قائم کردہ بغداد کے ادبی حلقوں اور مشرق میں ابھی تک کار فرما تھے، لیکن بڑھتے ہوئے ایرانی مذاق کے سامنے، تدریجی طور پر یہ عناصر رو بہ انحطاط ہو کر خارج ہو رہے تھے۔ اس دور میں دو باتیں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ان غیر معروف ہستیوں کی بجائے جن کے ہاتھ میں خلافت بغداد کی باگ ڈور تھی، یا بویہہ حکمرانوں کی جگہ، جو محض کندہ ناتراش تھے ادبیات کی سرپرستی اور

حفاظت کا بار چند مشہور روزگار اور بے حد امیر کبیر ایرانی وزراء کے کندھوں پر پڑا، جنھوں نے علم و فن کی ہر شاخ کی بڑی دریا دلی اور سخاوت سے مدد کی ۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور صاحب ابن عباد (۹۰ - ۹۳۸ع) ہے جس کے گرد اس دور کے تمام شاعر، مصنف اور سائنس داں جمع رہتے تھے ۔ لیکن یہ لوگ خود بھی دوسرے درجے کے ادیب یا فاضل تھے ۔ اس لیے یہ محض اتفاق کی بات ہے کہ انہیں عربی بھی اسی درجے کا ملا ۔ وزیر ابن العمید (م ۹۷۱ع) کے پاس اس کا محافظ کتب خانہ، مسکویہہ، البتہ اعلے درجے کا مورخ تھا اور اس نے اخلاقیات پر بھی ایک نہایت دلچسپ کتاب لکھی ہے ۔ مسکویہہ کی مدت سے کھوئی ہوئی کتاب ''تجارب الامم'' ہے، جو طبری کے بعد سب سے پہلی عام تاریخ کی کتاب ہے ۔ یہ کتاب ذکاوت طبع اور قوت فیصلہ کا بہترین نمونہ ہے ۔ قصیدوں اور مدحوں کے عین درمیان، بھولا بسرا ابوحیان التوحیدی (م بعد ۱۰۰۹ع) بھی اپنی نغمہ سرائی کیے بغیر نہیں رہتا ۔ عربی نثر نویسی کے اعتبار سے وہ جاحظ کا ہم پلہ ہے اور بقول یعقوب امام الفصحاء ہے، جو فراست، علم، خوش اسلوبی اور جوش بیان میں اپنی نظیر نہیں رکھتا ۔ وہ اپنی تصنیف ''کتاب الوزیرین'' میں ابن العمید اور صاحب کا ایسا بھیانک نقشہ پیش کرتا ہے، کہ یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ جس کسی کے قبضے میں اس کی کتاب ہوگی بس یہ سمجھو کہ اس پر مصیبت آئی ۔

اس دور کا عام دستور یہ تھا کہ قافیہ سنجی اور لطف و تفریح کا مظاہرہ، بڑی شان سے کیا جائے ۔ یہی وہ زمانہ تھا جب الف لیلہ و لیلہ کے پہلے مسودے مرتب ہوئے اور ان میں وہ افسانے شامل کیے گئے جو ہندی اور ایرانی زبانوں سے ترجمہ کیے گئے تھے اور اسی مقصد کو مد نظر رکھتے ہوئے علماء و فضلاء نے لکھاریوں کو کتابوں کو کرید کرید کر تلاش کیا تاکہ لطائف اور عالمانہ مقالات کی جگہ وہ انھیں عربی ادب میں شامل کریں ۔ اس میں شک نہیں کہ نئی قسم کا مقالہ قاضی التنوخی (۳۸۴/۹۹۴ء) کے مقالوں ''الفرج بعد الشدہ'' اور ''جامع التواریخ'' کے وقت سے، برابر بے حد مقبول و محبوب ادب، مسلم ہوتا چلا آیا ہے اور اس طرز پر بے شمار مقالے لکھے گئے ان میں سے ''المستطرف'، مصنفہ الابشیہی (۱۳۸۸/۱۴۴۶ء) کو نفس مضمون اور اسلوب بیان کے لحاظ سے، بہترین مقالہ قرار دیا جا سکتا ہے، جو فی زمانہ بھی مسلمہ طور پر مشہور ہے ۔

دوسری خصوصیت، کتب خانوں اور علمی درسگاہوں کا قیام ہے، جو اسلامی دنیا کے تمام بڑے بڑے شہروں میں عمل میں آیا ۔ کیا بادشاہ اور کیا وزیر، ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی خاطر، ممتی اور قابل قدر تصانیف کے اصلی نسخے یا ان کی نقلیں جمع کرنے لگے ۔ انھوں نے مدارس قائم کیے جو نہ صرف ہر قسم کے نووارد کے لیے کھلے رہتے تھے، بلکہ زیادہ تر اسی سلسلے میں، انھیں اتنی زیادہ مالی امداد دے دی جاتی تھی،

جو طلباء اور اساتذہ کے تمام اخراجات کی کفیل ہو سکے - طلباء اور اساتذہ کی جماعت میں، متعدد عورتیں بھی نظر آتی ہیں - ان اداروں کی تفاصیل کا مطالعہ کرنے سے حیرت ہوتی ہے - ایک معمولی سے مدرسے میں جو ۹۹۰ع میں بغداد میں قائم ہوا، کوئی دس ہزار چار سو کتابیں موجود تھیں - قاہرہ میں العزیز کے بڑے کتب خانہ میں کم از کم ایک لاکھ چوبیس ہزار کتابیں تھیں اور قرطبہ میں الحکم کا کتب خانہ تو اس سے بھی زیادہ بڑا تھا - غالباً یہ کسی بڑے کتب خانہ کی فہرست ہی ہوگی جو الفہرست کے نام سے ہم تک پہنچی ہے، جسے ابن الندیم نے ۹۸۸ع میں بغداد میں مرتب کیا تھا - یہ ایک نہایت ہی قابل قدر کتاب ہے - اس کا افتتاح تو مختلف زمانوں اور مختلف زبانوں اور مختلف رسم الخط کی کتابوں سے ہوتا ہے، جس میں ان مقدس کتابوں کا بھی ذکر ہے جنہیں اہل اسلام تسلیم کرتے ہیں - اس کے بعد عربی ادبیات کے مختلف فروعات پر سات مقالے ہیں، مثلاً لسانیات، تاریخ دینیات فقہ، فلسفہ، روایات اور جادو وغیرہ پر - آخر میں دو مقالے دوسرے مذاہب اور الکیمیاء کے متعلق ہیں - ہر باب میں مصنف ان تمام کتابوں کو شمار کرتا ہے جو اس موضوع کے متعلق اس وقت تک علم میں آئیں - اس کے ساتھ ساتھ اس نے ان کتابوں کے مصنفین کے مختصر سوانح اور بہت سا دوسرا قیمتی مواد بھی شامل کر دیا ہے جو مشرق قریب کی تمدنی تاریخ سے متعلق ہے - فہرست کے

مطالعہ سے ہمیں ظاہر ہوتا ہے کہ عربی ادبیات کی حدود کس قدر وسیع تھیں اور اسلام کی پہلی تین صدیوں میں کتنا ذخیرہ جمع ہوچکا تھا اور اس میں سے کس قدر قلیل حصہ ہم تک پہنچا ہے۔ بہت سے مصنف تو ایسے ہو گزرے ہیں، جن کی تصانیف کے چند اجزاء ہی ہمیں دستیاب ہو سکے ہیں اور بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہو گئی جن کے ناموں سے بھی ہم آشنا نہ ہو سکتے، اگرچہ کتاب محفوظ نہ رہ جاتی۔

دور بویہہ کا باقی ماندہ ادب زیادہ تر دینیات سے متعلق ہے۔ البتہ اس اصطلاح کے ماتحت ماید الماوردی (۱۰۵۸ع) کی ''کتاب الاحکام السلطانیہ'' نہ آ سکتی اگر اس میں توحید پرستوں کی صحیح طرز حکومت کا بیان نہ ہوتا۔ یہ رعایت اسے اس وجہ سے حاصل ہوئی، ورنہ اس زمانے کے علماء تو اسی قسم کی تصانیف کو ناجائز اور بدعت ہی سمجھتے تھے۔ شیعوں نے البتہ اس دور میں اپنی کھلم کھلا سرگرمی کا اظہار کیا اور شیعہ مذہب کی کتابوں کی جو فہرست محمد الطوسی (م ۱۰۶۷ع) نے مرتب کی وہ اس لیے دلچسپ ہے کہ اس سے ان کتابوں کا پتہ چلتا ہے جو اس زمانے میں رائج تھیں اور جن کو بلا شک و شبہ کثر اهل سنت نے ارادتاً ایسا دبایا کہ وہ اب نابود ہیں۔ اس زمانے سے کچھ پہلے شیعوں کے زیدی فرقے نے یمن میں اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی تھی، جو آج کے دن تک قائم ہے۔ دنیا کے اس دور افتادہ گوشے میں انہوں نے بے اندازہ ادب پیدا کیا، جس کی باقیات کا مطالعہ صرف اب

یورپ میں شروع ہوا ہے اور دینی مسائل میں ان کے غالب اختلاف اور تعصب کے باوجود علم و فن کی یہ کتابیں کچھ کم قدر و قیمت یا دلچسپی کی حامل نہیں ہیں۔ شیعوں کے علم و ادب کی کتابوں میں سے زیادہ دلچسپی ان جعلی تصانیف میں لی جاتی ہے جنہیں رسول اکرم (صلی اللہ علیہ و علی آلہ و سلم) کے داماد حضرت علی (علیہ السلام) کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ لیکن اصل میں انہیں آپ کی اولاد میں سے دو شرفاء نے لکھا ہے، جو بھائی بھائی تھے اور جن کا نام المرتضی (۹۶۶ تا ۱۰۴۴ع) اور الرضی (۹۷۰ تا ۱۰۱۵ع) تھا۔ ان میں سے موخرالذکر اپنے زمانے کا مشہور شاعر بھی تھا۔ ان جعلی کتابوں میں ایک دیوان اور ایک کتاب ''نہج البلاغہ'' کے نام سے مشہور ہیں۔ ''نہج البلاغہ'' میں حضرت علی (علیہ السلام) کے مکتوبات و مواعظ حسنہ جمع کیے ہیں۔ یہ کتاب خاص طور پر خوش گوار اور مزین سجع میں تحریر ہے۔ یہ نہ صرف شیعہ حلقوں میں مشہور و معروف کتاب ہے (جو اسے اپنے امام کی مستند یادگار مانتے ہیں) بلکہ اہل سنت بھی اسے شوق سے پڑھتے ہیں۔ اسی طرح مواعظ حسنہ کی ایک اور کتاب کو حضرت علی (علیہ السلام) کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کا نام ''قصید زینب'' ہے، جو پہلے زمانے کا جعل ہے اور ابتدائی عباسی دور کے ایک چھوٹے درجے کے شاعر کا کلام ہے۔

یہ شیعہ زیادہ تر سب سے بڑے شیعہ فرقے اثنا عشریہ یا امامیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ تاہم ایک اور تحریک کے لیے بھی

شیعہ نام ہی تجویز کیا گیا جو اپنے مقاصد اور وسعت کے لحاظ سے زیادہ تر ایک فلسفیانہ تحریک تھی۔ اس تحریک سے سیاسی ماحول میں "فاطمی" خاندان (ص ۲۰۳) نکلا اور اس کی انتہائی شاخ کی صورت میں ملک شام اور ایران کی وہ خفیہ انجمن پیدا ہوئی جو حشیشین کے نام سے مشہور ہے۔ "فاطمی" تحریک کی کتابوں کی حفاظت غالباً بڑی سختی سے کی جاتی تھی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تمام مواد ان کے نمائندوں کے ساتھ ہی ختم بھی ہوگیا۔ لیکن یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ ایک تصنیف "اخوان الصفاء" ایک درسی کتاب تھی جو مریدوں کو سلسلہ "فاطمیہ" میں داخل کرنے سے پہلے پڑھائی جاتی تھی۔ یہ اکاون رسالے بصرہ کے مصنفین کے ایک گروہ نے ۱۰۰۰ء سے پہلے لکھے تھے۔ گویا یہ سائنس اور فلسفے کے مخزن کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں دسویں صدی کے مہذب مسلمانوں کے خیالات کا خلاصہ درج ہے۔ اس زمانے میں راسخ العقیدہ جماعت نے عام فلسفہ سے اسی قسم کا اتحاد پیدا کر لیا جس قسم کا رابطہ قرون وسطیٰ میں یورپ نے پیدا کیا تھا، شرط صرف یہ قائم رکھی گئی کہ فلسفے کے اصول کو اس کے منطقی نتائج تک نہ پہنچایا جائے۔ اخوان الصفاء کے رسائل میں ان حدود کو ملحوظ رکھا گیا اور یوں ان کی تحریروں کو عام طور پر تسلیم کیا جانے لگا۔ اس طرح یہ کتابیں تمام اسلامی ممالک میں پڑھی پڑھائی جانے لگیں۔ یعنی اصلی متن اور اقتباسات اور تراجم کی صورت میں بھی ان کا مطالعہ کیا جانے لگا۔ یہ رسائل علم ریاضی سے شروع

ہوتے ہیں (شمارہ ۱ تا ۶)، تمہید، فلسفہ و منطق (۷ تا ۱۳)، پھر عام علوم کے مضامین پر (شمارہ ۱۴ تا ۲۱) اور اس کے بعد نسلیات (شمارہ ۲۲ تا ۳۰) ہیں۔ اس درجہ تک تعلیمات کا سلسلہ محض دبستان ارسطو کے مطابق قائم رکھا گیا ہے۔ اس سلسلے کے بعد کا حصہ "روح عالم" (شمارہ ۳۱ تا ۴۰) بالکل صراحت کے ساتھ جدید افلاطونی فلسفہ ہے۔ آخری رسائل علوم دین سے متعلق ہیں جو حسب توقع معتزلہ کے مذاق کے مطابق لکھے گئے ہیں۔

(ح) مشرقی ایران ۔ اگرچہ مشرق میں ایرانی خاندانوں کی تمنا یہی رہی کہ فارسی زبان کو از سر نو ادبی زبان قرار دیا جائے، لیکن عربی زبان اب بھی درباری حلقوں اور سرکاری خط و کتاب میں استعمال ہوتی تھی، اور عربی شعراء اور مصنفین کو بہت جلد شاہانہ سرپرستی حاصل ہو جاتی تھی۔ مشرق درباروں میں نہایت شاندار دربار بخارا کے سامانی بادشاہوں کا تھا، لیکن خوارزم کا نہایت مال دار تجارتی مرکز خوارزم (خیوا) خاص طور پر علم و فضل کے ذوق و شوق کے لیے مشہور تھا۔ اس زمانے میں بھی دریائے جیحون کی ولایات، موجودہ زمانے کی طرح، دینی علوم کے مطالعہ اور حدیث و فقہ کی کتابوں کی تالیف و تدوین کے لیے مشہور تھیں۔ اس قسم کی کتابوں میں ان کتابوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو خراسان میں لکھی گئیں اور جن میں بخاری اور مسلم دونوں شامل ہیں۔

اصل صوبہ خراسان کا پائے تخت نیشا پور تھا۔ اس دور کے دو نہایت فاضل ادیب، الہمذانی (۹۶۹/۱۰۰۸ ع) اور الثعالبی

اسی شہر سے تعلق رکھتے تھے۔ اول الذکر عام (۳۸۰ / ۱۰۰۸ء) طور پر بدیع الزماں کے نام سے مشہور ہے۔ وہ بارہ برس کی عمر میں اپنے اساتذہ سے علم و فن کی پوری پوری تکمیل کر کے، ہمدان سے روانہ ہوا اور اس وقت سے لے کر مرتے دم تک برابر ایک شاہی دربار سے دوسرے میں گھومتا پھرتا رہا۔ اس کی موت ہرات میں واقع ہوئی۔ اس کے متعلق الثعالبی نے اپنے ایک بیان میں جو کچھ لکھا ہے، وہ نہ صرف بجائے خود ایک دلچسپ چیز ہے بلکہ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں فضلاء و ادباء کی تفریحات کس قسم کی ہوتی تھیں۔ اس بیان کے اقتباس سے ہمیں اس کی تصنیف "مقامات" کی کامیابی کا اندازہ بھی بخوبی ہوسکے گا و هو هذا :

"وہ حیرت و استعجاب کا ماہر اور اختراع کا استاد تھا۔ اسے اس بات میں مہارت تامہ حاصل تھی کہ جو نظم اس نے صرف ایک بار سن رکھی ہو، اس کے پچاس اشعار کسی دقت کے بغیر روانی کے ساتھ سنا دیے۔ وہ ایسی کتاب کے جو اس نے پہلے نہ کبھی دیکھی نہ سنی صرف چار پانچ صفحے ہی سرسری طور پر پڑھ کر اپنے حافظے سے اس کے مطالب کو بعینہ اسی مطابقت کے ساتھ دھرا دیا کرتا تھا۔ اگر اس سے کبھی یہ کہا جاتا کہ وہ کسی طبعزاد موضوع یا کسی دور از کار مضمون پر کوئی نظم یا مقالہ لکھے تو وہ وہیں بیٹھے بیٹھے اس کام کی تکمیل بوجوہ احسن کر دیا کرتا تھا۔ وہ اکثر

اوقات کسی بتائے ہوئے موضوع پر کتاب لکھنے بیٹھ جاتا اور پھر یہ کمال دکھاتا تھا کہ اسے آخر سے شروع کرتا اور آغاز پر آکر ختم کرتا۔ لیکن اس کے باوجود وہ تصنیف ایسی پر مغز اور خوبصورت ہوتی جیسی کہ کوئی اور کتاب۔ وہ کسی منتخب قصیدے کو کسی عالمانہ رسالے کے ساتھ مزین کر دیا کرتا تھا۔ دونوں اس کے اپنے ھی طبعزاد ہوتے تھے اور وہ اس ترتیب سے پڑھے جا سکتے تھے کہ نظم میں سے نثر اور نثر سے نظم پیدا ہو جائے۔ اسے کئی قافیے یکجا دے دئیے جاتے تھے اور وہ ان پر نہایت با اسلوب شعر کہہ دیتا تھا۔ اسی طرح تمام مشکل اور پیچیدہ مضامین پر وہ نثر و نظم لکھ سکتا تھا اور بجلی سے زیادہ تیزی کے ساتھ انہیں فی البدیہہ دھرا سکتا تھا۔ وہ فارسی زبان کے فخریہ شعروں کا ترجمہ پوری تیزی اور لطافت کے ساتھ عربی زبان میں کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ بے شمار اور انگنت کمالات ذھنی کا مالک تھا، جن سے عقل دنگ رہ جاتی تھی''۔

ادبیات میں ہمذانی کے مرتبہ کا اندازہ اس کے حیرت انگیز رسایل کی اختراع پسندی کی نسبت، زیادہ تر اسکی کتاب ''مقامات'' سے ہوتا ھے، جس کو اس نے ادبی لحاظ سے نہایت ھی مکمل اسلوب میں پیش کیا ھے۔ اس اسلوب کا وہ خالق ھے اور اس کا یہ انداز ساری کی ساری کتاب میں پوری یکسانیت کے ساتھ اول سے آخر تک پایا جاتا ھے۔

(۱۰۲۸/۹۶۱ ع) اسی شہر سے تعلق رکھتے تھے۔ اول الذکر عام طور پر بدیع الزمان کے نام سے مشہور ہے۔ وہ بارہ برس کی عمر میں اپنے اساتذہ سے علم و فن کی پوری تکمیل کر کے، ہمذان سے روانہ ہوا اور اس وقت سے لے کر مرتے دم تک برابر ایک شاہی دربار سے دوسرے میں گھومتا پھرتا رہا۔ اس کی موت ہرات میں واقع ہوئی۔ اس کے متعلق الثعالبی نے اپنے ایک بیان میں جو کچھ کہا ہے، وہ نہ صرف بجائے خود ایک دلچسپ چیز ہے بلکہ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں فضلاء و ادباء کی تفریحات کس قسم کی ہوتی تھیں۔ اس بیان کے اقتباس سے ہمیں اس کی تصنیف ''مقامات'' کی کامیابی کا اندازہ بھی بخوبی ہو سکے گا و ہو ھذا:

''وہ حیرت و استعجاب کا ماہر اور اختراع کا استاد تھا۔ اسے اس بات میں مہارت تامہ حاصل تھی کہ جو نظم اس نے صرف ایک بار سن رکھی ہو، اس کے پچاس اشعار کسی دقت کے بغیر روانی کے ساتھ سنا دے۔ وہ ایسی کتاب کے جو اس نے پہلے نہ کبھی دیکھی نہ سنی صرف چار پانچ صفحے ہی سرسری طور پر پڑھ کر اپنے حافظے سے اس کے مطالب کو بعینہ اسی مطابقت کے ساتھ دھرا دیا کرتا تھا۔ اگر اس سے کبھی یہ کہا جاتا کہ وہ کسی طبعزاد موضوع یا کسی دور از کار مضمون پر کوئی نظم یا مقالہ لکھے تو وہ وہیں بیٹھے بیٹھے اس کام کی تکمیل بوجوہ احسن کر دیا کرتا تھا۔ وہ اکثر

اوقات کسی بتائے ہوئے موضوع پر کتاب لکھنے بیٹھ جاتا اور پھر
یہ کمال دکھاتا تھا کہ اسے آخر سے شروع کرتا اور آغاز پر
آکر ختم کرتا۔ لیکن اس کے باوجود وہ تصنیف ایسی پر مغز
اور خوبصورت ہوتی جیسی کہ کوئی اور کتاب۔ وہ کسی
منتخب قصیدے کو کسی عالمانہ رسالے کے ساتھ مزین کر دیا
کرتا تھا۔ دونوں اس کے اپنے ہی طبعزاد ہوتے تھے اور وہ اس
ترتیب سے پڑھے جا سکتے تھے کہ نظم میں سے نثر اور نثر
سے نظم پیدا ہو جائے۔ اسے کئی قافیے یکجا دے دئیے جاتے
تھے اور وہ ان پر نہایت با اسلوب شعر کہہ دیتا تھا۔ اسی طرح
تمام مشکل اور پیچیدہ مضامین پر وہ نثر و نظم لکھ سکتا تھا
اور بجلی سے زیادہ تیزی کے ساتھ انہیں فی البدیہہ دھرا سکتا
تھا۔ وہ فارسی زبان کے فخریہ شعروں کا ترجمہ پوری تیزی
اور لطافت کے ساتھ عربی زبان میں کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ
وہ بے شمار اور انگنت کمالات ذہنی کا مالک تھا' جن سے عقل
دنگ رہ جاتی تھی''۔

ادبیات میں ہمذانی کے مرتبہ کا اندازہ اس کے حیرت انگیز
ایل کی اختراع پسندی کی نسبت' زیادہ تر اسکی کتاب ''مقامات'' سے
.تا ہے' جس کو اس نے ادبی لحاظ سے نہایت ہی مکمل اسلوب
، پیش کیا ہے۔ اس اسلوب کا وہ خالق ہے اور اس کا یہ انداز
.ی کی ساری کتاب میں پوری یکسانیت کے ساتھ اول سے آخر
ـ پایا جاتا ہے۔

چینیری (Chenery) لکھتا ہے ''کہ میرے خیال میں وہ ایک بے باک، بذلہ سنج، بدیہہ گو تھا، جو ایک مقام سے دوسرے مقام پر سفر کرتا رہتا تھا اور اس کی بسر اوقات ان با مذاق اور سخی لوگوں کے عطیات پر منحصر تھی جو وہ اپنے ذہنی محاسن کے اظہار کے ذریعہ حاصل کیا کرتا تھا۔ وہ گویا ایک قسم کا راوی تھا جو متواتر دوسرے لوگوں سے ملتا رہتا، انہیں اپنی سرگذشت سناتا اور ان کے سامنے اپنا شاندار کلام پڑھتا ''مقامات'' ایک قسم کا تمثیلی افسانہ ہے جس کے بیان کرنے میں مصنف کا یہ مقصد معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے شعر و سخن، فصاحت و بلاغت اور اپنے علم و فضل کا ظاہرہ کرے اور اسی مقصد کے پیش نظر اس نے متواتر یہی کوشش جاری رکھی کہ نفس مضمون کے مقابلہ میں اسلوب بیان کو ترجیح دے''۔

ہمدانی نے اپنی تصنیف ''مقامات'' میں بڑا کام یہ کیا ہے کہ اس کے متن کو سجع کے محاسن اور بدیہہ گوئی کی خوبیوں سے آراستہ و پیراستہ کرکے ایک پرانے زمانے کے افسانے کو نظم و نثر کی صورت میں پیش کیا ہے (اس نمونے کا ادب یورپین ادبیات میں Aucassin اور Nicolette میں ملتا ہے) اور اپنی ذکاوت طبع کے بل بوتے پر اپنے فن کی اداکاری، اس مقبول افسانے کے ایک زیرک آوارہ گرد کی زبانی کرائی ہے۔ اس کے افسانے کا ہیرو ابوالفتح اسکندریہ کا رہنے والا ہے۔ وہ فن خطابت کے تمام ہنروں سے واقف ہے۔ زبان پر اسے پورا عبور حاصل ہے جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ خود

همذانی کو جملہ علوم و فنون پر پورا کمال حاصل تھا ۔ اس کی شہرت تمام اسلامی دنیا میں پھیل گئی تھی ۔ اس طرز کے کئی نقال بھی پیدا ہو گئے ' جو کم و بیش اپنی کوشش میں کامیاب ہوئے۔ لیکن ''مقامہ'' کو وہ آمد و روانی پھر کبھی نصیب نہ ہوئی جو اپنے اصطلاحی محاسن کی وجہ سے ' اسے اپنے قابل مصنف کے قلم کے ذریعہ حاصل ہو چکی تھی ۔ موجودہ زمانے کا ایک نقاد لکھتا ہے کہ سامی ادبیات میں ''مقامہ'' کو ادبی معیار کے لحاظ سے پورا پورا اوج کمال حاصل ہے ۔

ان خوبیوں کی تہہ میں اسی بڑھتی ہوئی روانی کی منازل موجود ہیں جو ادبی محاسن کے لحاظ سے آریائی اور سامی ادب میں بھی پائی جاتی ہیں ' یعنی قصیدہ ' تمثیل (قصہ یا ڈرامہ ' منظوم و منثور افسانہ) اور ناول (مقامہ) ۔ پہلی منزل میں تو صرف سامع کے حافظہ کی نمایش ہے ' دوسری میں متکلم سامع کے ذہن اور ذکاوت کا جایزہ لیتا ہے اور تیسری منزل پر پڑھنے والے کی قوت ارادہ کو متاثر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ صرف آریائی ادب کے اسلوب میں تلون پایا جاتا ہے اور نفس مضمون ٹھوس ہوتا ہے لیکن سامی ادب میں اسلوب ٹھوس ہے اور مضمون متلون ۔

همذانی کی تعریف و توصیف کے باوجود ثعالبی خود لسانیات اور ادب کی پرانی لکیر ہی کا فقیر رہا ۔ ہمارے نزدیک اس کی اہمیت زیادہ تر اس کی دو کتابوں کی وجہ سے ہے ۔ایک تو عام تاریخ کی کتاب ہے جس میں سے صرف ایک حصہ ہم تک پہنچا

ہے جو ایران کے ابتدائی زمانے کے بادشاہوں کے متعلق ہے۔ لیکن وہ اس اعتبار سے دلچسپ ہے کہ وہ اس تمام مواد کی ایک ایسی جامع و مانع نثر ہے جس کا آخری اظہار فردوسی کی مشہور و معروف رزمیہ مثنوی ''شاہنامہ'' میں ہوتا ہے۔ دوسری کتاب زیادہ قریبی زمانے کے عربی شعراء کے کلام کا بیاض ہے ' جس میں ان کے سوانح بھی تحریر ہیں۔ اس کتاب میں عربی ادبیات کے سارے میدان کو چھان مارا ہے اور اس کتاب کا نام '' یتیمۃ الدھر فی شعراء اھل العصر'' ہے۔ اس مجموعے کو مصنف کے ذوق سلیم کی وجہ سے فوری مقبولیت حاصل ہو گئی اور اس میں آئندہ دو صدیوں میں اضافہ بھی ہوتا رہا کیونکہ اس سلسلے کو بعد کے متعدد ادیبوں نے بھی برابر جاری رکھا۔

جب ۹۹۹ع میں سامانیوں کو وسط ایشیا کے ترکوں نے مار بھگایا تو ان کی قبائے شاہی ایک نئے ترکی خاندان کو ملی ' جو ملک افغانستان کے شہر غزنہ میں بر سر حکومت و اقتدار ہوئے۔ غزنوی بادشاہوں میں سب سے زیادہ مشہور بادشاہ محمود (غزنوی) یمین الدولہ تھا (۹۹۸ع تا ۱۰۳۰ع)۔ گو بباطن تو وہ ایک بے علم انسان تھا لیکن سیاسی میدان عمل میں شہرت حاصل کرنے کی غرض سے اس نے بڑے طمطراق سے مذہبی جہاد کے بھیس میں ملک ہندوستان میں بزور شمشیر آگ لگا دی اور ادبیات کے میدان میں یوں نام پیدا کیا کہ اس نے یگانہ روزگار ادباء و فضلاء کو اپنے دربار کی شان و شوکت کو تابناک بنانے کی غرض سے اپنے

ھاں جمع کر لیا - اس کے دور حکومت کو ایک کتاب "یمین الدھر" نے دوام بخشا جو اس کے درباریوں میں سے ایک شخص العتبی (م ۱۰۳٦ ع) نے لکھی تھی - یہ تصنیف علم تاریخ کی کتابوں میں عجوبۂ روزگار تھی - اب تک صورت یہ تھی کہ طبعزاد تاریخی عنوانات کی کتابیں انفرادی طور پر بادشاھوں کے مخصوص ادوار کے متعلق رسالوں کی صورت میں محدود رکھی جاتی تھیں یا ان میں زیادہ سے زیادہ کسی مخصوص خاندان کے حالات ھوا کرتے - اس قسم کی کتابیں عام طور پر ان خاندانوں کے ملازم ھی لکھا کرتے تھے اور ان کا خاص مقصد یہی ھوتا تھا کہ وہ اپنے مربی بادشاھوں کی تعریف و توصیف کے پل باندھا کریں - ادبی فنون اور کمالات کو ایسی کتابوں میں مضمون کا اثر بڑھانے کے لیے خوب استعمال کیا جاتا تھا اور عام تاریخی بیان صنائع و بدائع کے بوجھ کی وجہ سے بہت کچھ زیر بار ھو جایا کرتا تھا - یہ قابل قدر اسلوب بیان ھمذانی کے مقبول اسلوب کی وجہ سے بے حد پسند کیا جاتا تھا - اپنے مخصوص ماحول میں تو اس قسم کا اسلوب بیان بلا شک و شبہ بے حد موزوں اور مناسب تھا لیکن تاریخ نویسی پر اس کا اثر بے حد مایوس کن اور افسوس ناک ھوا - اس اسلوب میں محض ایک نایاب اور خوبصورت جملے کی خاطر ھر دوسری چیز کو قربان کردیا گیا ہے اور صنائع معنوی کی بھرمارنے معمولی حقایق کو محض مبہم اور مشکل کرکے رکھ دیا ہے اور عبارت سے صرف تملق اور خوشامد پرستی ھی کا اظہار ھوتا ہے- (ھر دور کا ایک مخصوص طرز انشا

ہوتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ جس عہد میں جو کتاب لکھی گئی وہ اس عہد میں بنظر استحسان دیکھی گئی یا نہیں۔ مصنف خود معترف ہے کہ کتاب ''یمین الدھر'' نے سلطان محمود رح کے دورحکومت کو دوام بخشا — م)۔

سلطان محمود رح شہرت حاصل کرنے کے لیے کشادہ دلی یا سخاوت پر زیادہ بھروسہ نہ کرتا۔ اس کا طریق عمل زیادہ ارزاں اور با اثر ہوا کرتا تھا (یہ الفاظ نہایت گستاخانہ ہیں — م) - وہ اکثر اوقات ایسے لوگوں کو اپنے مفتوحہ ممالک سے اغوا کرا لیا کرتا تھا یا ان پر جبر کرکے انہیں اپنے ہاں لے آتا تھا۔ چنانچہ اسی طرح خوارزم کی فتح کے موقع پر وہ البیرونی (م ۱۰۴۸ ع) کا سرپرست بنا جو کسی اور مصنف کے مقابلے میں ہمارے نزدیک اسلامی سائنس کا سب سے بڑا عالم ہے۔ اس کے نزدیک علم بطور خود ایک منتہائے خیال تھا (یعنی وہ علم برائے علم کا قائل تھا نہ کہ جاہ دنیوی کے لئے — م)۔

جب اس نے اپنی تصنیف ''قانون'' ختم کی (بقول شخصے منقولہ ''یاقوت'') تو سلطان مسعود نے اس کے پاس چاندی ہی چاندی سے لدا ہوا ایک ہاتھی بطور انعام بھیجا۔ لیکن اس نے عام دستور کو توڑتے ہوئے اسے خزانہ شاہی میں یہ کہہ کر واپس بھیج دیا کہ میں اس کے بغیر بھی اپنی گزر بسر کر سکتا ہوں۔ اس نے شاذ ہی قلم کو اپنے ہاتھ سے علیحدہ کیا ہو، یا مشاہدات مناظر سے اپنی آنکھ بند کی ہو، یا تفحص و تدبر کے کاموں سے دو تیوہاروں یعنی نو روز

اور سہر جان کے علاوہ کسی دن ناغہ کیا ہو - باقی ہر دن اس کا یہی مشغلہ تھا کہ وہ عروس علم کے چہرے سے کشف غطا کرتا رہے اور اس کی کلائیوں سے حجاب آلود آستینوں کو اوپر چڑھاتا رہے - ایک عالم کا بیان ہے: ''میں ابو الریحان (البیرونی) سے اس وقت ملنے گیا جب اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کرنے کو تیار تھی اور وہ سکرات موت کی مصیبت میں گرفتار تھا - اس حالت میں بھی اس نے مجھ سے پوچھا کہ بھلا وہ کیا مسئلہ تھا جو وراثت کے متعلق آپ نے مجھے بتایا تھا - میں نے ہمدردانہ لہجے میں جواباً عرض کیا کہ 'اس حالت میں؟' اس نے جواب دیا کہ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ میں اس مسئلے کو اچھی طرح سمجھ کر اس دنیا سے کوچ کروں، بجائے اس کے کہ میں اس سے نا آشنا رہوں - چنانچہ میں نے وہی مسئلہ مکرر بیان کیا اور اس نے اسے یاد کر لیا اور مجھے بھی اس نے اس بات کی تعلیم دی جس کا اس نے مجھ سے وعدہ کر رکھا تھا اور ابھی میں نے اس کے گھر سے نکل کر بازار میں قدم ہی رکھا تھا کہ شور و شیون برپا ہوگیا کہ وہ اللہ کو پیارا ہو چکا ہے'' -

بد قسمتی سے اس کی تاریخی تصانیف میں سے کچھ بھی محفوظ نہیں رہ سکا - لیکن اس کی شہرت کو دوام اور پائداری اس کی دو تصنیفوں کی وجہ سے حاصل ہوئی جو اس کے نتیجۂ فکر کی بہترین شاہکار ہیں - ''الاثار الباقیہ عن القرون الخالیہ'' - اس کتاب میں تقابلی واقعہ نگاری کے سلسلے میں نہ صرف سنین مختلفہ اور

مختلف قوموں اور مذہبوں کے تہواروں کا بیان ہے بلکہ مفید تاریخی معلومات بھی مندرج ہیں اور متعدد موضوعات پر عجیب و غریب طریق سے رائے زنی کی ہے۔ دوسری تصنیف کے لیے اس نے سلطان محمود کی فتوحات ہند سے یہ فائدہ اٹھایا کہ اس نے سنسکرت زبان سیکھ کر ہندی ادبیات کا مطالعہ کیا بلکہ قومی اور مذہبی تعصبات سے بالا تر ہو کر (البتہ عربوں کے خلاف اس کا فطرتی حسد و بغض دور نہ ہوا) اس نے غیر تنقیدی تعریف و توصیف اور غیر مخیلہ حرص کے درمیان توازن پیدا کیا۔ اس نے کئی ہندی کتابوں کا ترجمہ (بشمول یوگ سوتر و پتنجلی) عربی زبان میں کیا اور زیادہ عجیب و غریب بات یہ کی کہ یونانی زبان کی کئی کتابوں کے عربی تراجم کو سنسکرت زبان کے قالب میں ڈھال دیا۔ اس کی ایک تیسری کتاب کا نام ''القانون'' ہے جو اس نے سلطان مسعود کے نام پر معنون کی تھی۔ اس کتاب کی بارہ جلدوں میں اس نے عربوں کے تمام علم ہیئت کو اکٹھا کر کے رکھ دیا۔

ابن سینا بخاری (۹۸۰ع تا ۱۰۳۷ع) بالکل ہی مختلف قسم کا عالم تھا۔ محمود کے دام تزویر (محض اغو طعن — م) سے بچنے کی خاطر وہ خوارزم سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا اور ایک من چلی سپاہی زندگی کے بعد وہ آخر میں اصفہان میں آ کر آباد ہو گیا۔ ابن سینا کی شخصیت اہل یورپ کی نظروں میں اسلامی سائنس کے انتہائی عروج کی مثال ہے۔ اس بات کو اکثر اوقات قطعاً فراموش کر دیا جاتا ہے کہ وہ سب سے پہلے ایک بہت بڑا فلسفی تھا (جیسا

کہ رازی کے سوا بہت سے مسلم علماء ہو گزرے ہیں)۔ اس نے کم
از کم ۶۸ کتابیں علوم فلسفہ پر لکھ کر نام پیدا کیا ۔ اس کے
مقابلے میں اس نے علم طب پر صرف اٹھارہ اور علم ہیئت میں صرف
گیارہ کتابیں لکھیں - سب سے پہلی صنف میں اس کی کتاب ''الشفاء'
یا ''کتاب الشفاء'' ہے- یہ کتاب علم منطق' علم طبیعات' علم ریاضی
اور علم دین کا ایک قاموس یا مخزن ہے ۔ اس کے علاوہ متعد
کتابیں علم تصوف کے متعلق بھی ہیں اور ایک نہایت ھی نفیس او
خوش گوار چھوٹی سی نظم' جسم میں نزول روح کے متعلق ہے
یورپ اور اسلامی دنیا میں اس کی شہرت اور ناموری کا انحصا
زیادہ تر طب کی تصنیفات پر ہے اور زیادہ تر اس کتاب پر جس
نام ''القانون'' ہے ۔ اس کا ترجمہ سبلونیۃ کے باشندے جیرارڈ ۔
تیرھویں صدی عیسوی میں کیا تھا یہ کتاب متواتر کئی صدیو
تک یورپ کی طب پر حاوی رھی ۔ مسلمانوں میں بھی اس کتاب ۔
اس کے پیش رووں کی تصانیف پر پانی پھیر دیا ۔ اس کے علاوہ علو
فلسفہ میں اسے ید طولی حاصل تھا ۔ اس کا اندازہ بھی کچھ مبالغ
آمیزی سے کیا گیا ہے اس کو ایک ایسا مقام دے دیا گیا' ج
رازی ایسے فطری اور طبعی حکیم اور مفکر سے بھی زیادہ بلند ما
جاتا ہے ۔

(د) مصر اور شمال مغربی افریقہ ۔ اسلام کی پہلی تین صدیو
کے زمانۂ عروج میں مصر کا بھی ان تمام سرگرمیوں میں بہت بڑ
حصہ تھا جو بغداد میں مرکوز تھیں ۔ بعض صورتوں میں ی

سرگرمیاں وہاں تک پہنچائی گئیں اور وہاں کے مقامی دبستانوں نے ان کو اور زیادہ ترقی دی۔ مثال کے طور پر نویں صدی عیسوی میں یہ ملک مسلمان اور نصرانی دونوں مذاہب کے مورخین کا مرکز بن گیا اور ان میں سے بعضوں کی تصانیف ہم تک پہنچی تھی۔ تاہم عربی زبان کی ترویج، شمالی افریقہ کے ساحل پر کچھ ایسی سست رفتاری سے ہوئی کہ نویں صدی عیسوی میں کہیں جا کر تونیسہ کے شہر قیروان میں ایک علمی اور ادبی حلقہ قائم ہوسکا۔ "فاطمیہ" خاندان کے عقائد الحاد آمیز تھے[1] ۹۰۹ء میں یہ خاندان

---

(۱) عبیدیوں کا یہ خاندان جو اپنی فاطمیت کے ساتھ مصر پر مستولی ہوگیا اور دین اسلام کی تحریف میں اس نے کوئی کسر نہیں رکھی۔ اس کا مستند حال ہم امام جلال الدین السیوطی کی کتاب تاریخ الخلفا سے نقل کرتے ہیں (مطبوعہ مصر ۱۳۰۵ء ص ۱)۔

ولم اورد احدا من الخلفاء العبيديين لان امامتهم غير صحيحة لامور منها انهم غير قرشيين وانما سمتهم بالفاطميين جهلة العوام والا جدهم مجوسي..... وقال القاضي ابوبكر الباقلاني ان القداح جد عبيد الله الذي يسمى بالمهدي كان مجوسيا ودخل عبيد الله المغرب وادعى انه علوي ولم يعرفه احد من علماء النسب وسماهم جهلة الناس الفاطميين" وقال ابن خلكان "اكثر اهل علم لا يصححون نسب المهدي عبيد الله جد خلفاء مصر حتى ان العزيز بالله ابن معز في اول ولايته صعد المنبر يوم الجمعة فوجد هناك ورقة فيها هذه الابيات:

انا سمعنا نسبا منكرا — يتلى على المنبر في الجامع
ان كنت فيما تدعي صادقا — فاذكر ابا بعد الاب السابع
وان ترد تحقيق ما قلته — فانسب لنا نفسك كالطائع
اولا دع الانساب مستورة — وادخل بنا في النسب الواسع
فان انساب بني هاشم — يقصر عنها طمع الطامع

کو تیسرہ میں برسراقتدار ہوا اور ساٹھ سال بعد ملک شام اور مصر میں بھی یہی لوگ قابض ہوگئے۔ اسلئے ان ملکوں اور مشرق کے درمیان باہمی تعلقات کا قائم رکھنا مشکل ہوگیا۔ گمان غالب یہ ہے کہ اسی وجہ سے مصر کا ملک ان اثرات سے آزاد رہا جن کے تحت عربی ادبیات کو ایشیاء میں نئے سانچے میں ڈھالا جا رہا تھا لیکن اس دور میں جو تصانیف بھی یہاں ہوئیں اور جن کا بہت ہی تھوڑا حصہ محفوظ

ترجمہ: میں نے (اس کتاب تاریخ الخلفا) میں عبیدی خلفاء کا کوئی ذ
نہیں کیا۔ اس لیے کہ انکی امامت بہ وجوہ صحیح نہیں۔ ازانجملہ یہ ہے کہ وہ لو
قریشی نہیں۔ انہیں فاطمین کا نام تو جاہل عوام نے دیا ہے ورنہ انکا جد اعلیٰ مجوس
تھا . . . . قاضی ابوبکر باقلانی فرماتے ہیں "عبیداللہ جسے مہدی لقب دیا گیا ہے اس
دادا قداح مجوسی تھا۔ عبید اللہ نے مغرب میں داخل ہو کر علوی ہونے کا دعو
کیا لیکن علمائے انساب میں سے کسی نے اسے نہ پہچانا البتہ جاہل لوگوں نے انہ
فاطمی کہا" . . . . ابن خلکان کہتے ہیں "اکثر اہل علم خلفائے مصر کے دا
عبید اللہ المہدی کا نسب صحیح تسلیم نہیں کرتے حتے کہ عزیز باللہ بن المعز اپ
حکومت کے ابتدائی ایام میں جمعہ کے دن منبر پر چڑھا تو وہاں اسے ایک پرچ
ملا۔ جس میں یہ اشعار لکھے ہوئے تھے:

(۱) ہم نے ایک نامعلوم نسب سنا جو مسجد جامع میں منبر پر سنا
جاتا ہے۔

(۲) اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو اپنے ساتویں دادا کے بعد کے مور
کا نام سناؤ اور

(۳) اگر تم میری بات کا صحیح مفہوم جاننا چاہتے ہو تو اپنا نسبنامہ ایس
سناؤ جیسا (امیر المومنین) الطائع باللہ کا ہے۔

(۴) یا پھر نسب کا معاملہ ڈھکا چھپا رہنے دو اور جو نسب سب کا عام
اسی میں داخل ہو جاؤ کیونکہ بنو ہاشم کا نسب ایسا ہے کہ اس تک ط
کرنے والوں کی طمع کی پہنچ نہیں۔

رها عام دلچسپی سے خالی نہیں ہیں ۔ مصر میں ان کا سب سے پہلا اقدام یہ تھا کہ انہوں نے جامع ازہر تعمیر کرکے اس کے لیے وسیع مالی وسائل وقف کر دیے جو بعد میں کٹر اسلامی عقائد اختیار کرکے ایشیاء میں اپنی حریف درسگاہوں کی تباہی کے بعد، اسلام کی سب سے بڑی درسگاہ بن گئی اور آج تک اس کی یہی شہرت قائم

وكتب العزيز الى الاموى صاحب الاندلس كتابا سبه فيه و هجاه فكتب اليه الاموى " اما بعد فانك قد عرفتنا فهجوتنا ولو عرفناك لاجبناك "۔

قال الذهبي المحققون متفقون على ان عبيدالله المهدي ليس بعلوي وما احسن ما قال حفيده المعز صاحب القاهرة وقد سئله ابن طبا طبا العلوى عن نسبهم فجذب سيفه من الغمد وقال هذا نسبي و نثر على الامراء والحاضرين الذهب وقال هذا حسبي ومنها ان اكثرهم زنادقة خارجون عن الاسلام ومنهم من اباح الخمر

"اسی طرح عزیز نے اندلس کے اموی حکمران کو ایک خط بھیجا جس میں انہیں گالیاں دی تھیں اور انکی ھجو کی تھی - انہوں نے جواب میں لکھا " اما بعد تم ھمیں جانتے ھو اس لیے ھجو کر سکے ھو- ھم بھی تمہیں جانتے ھوتے تو جواب دیتے ۔

امام ذھبی فرماتے ھیں " تمام اھل تحقیق اس پر متفق ھیں کہ عبید اللہ مہدی علوی نہیں اور اس کے پوتے المعز نے اسوقت کیا خوب کہا ھے ابن طباطبا علوی نے ان لوگوں کا نسب پوچھا تو اس نے میان سے اپنی تلوار نکال لی اور کہا یہ ھے میرا نسب- پھر امراء اور حاضرین پر سونا پھینکا اور کہا یہ ھے میرا حسب ۔

ازانجملہ یہ ھے کہ انمیں اکثر لوگ زندیق اور خارج از اسلام ھیں ۔ انمیں وہ ھیں جنہوں نے انبیاء علیہم السلام کو گالیاں دیں اور وہ بھی جنہوں نے شراب کو حلال

ہے - یہ بات یقینی ہے کہ انہوں نے سائنس اور فلسفے کی تعلیم کی حوصلہ افزائی کی - فاطمیوں کے عہد میں مصری ادبیات میں جو فلاکت پائی جاتی ہے اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ راسخ الا عتقاد جماعت نے ہر اس چیز کو دبایا جس میں فاطمی الحاد یا بدعات کا شائبہ بھی پایا جاتا تھا - مشہور جغرافیہ دان مقدسی ۹۸۰ ع میں علی الاعلان اس حقیقت کا انکشاف کرتے ہوئے لکھتا ہے :

" پہلے زمانے میں بغداد ایک شاندار شہر تھا لیکن اب وہ

و منهم من امر بالسجود له والخير منهم رافضي خبيث لئيم يأمر بسب الصحابة رضي الله عنهم ومثل هؤلاء لا تنعقد لهم بيعة ولا تصح لهم امامة -

کر دیا اور انہیں سے بعض نے اپنے سامنے سر بسجود ہو جانے کا حکم دیا - انہیں جو شخص سب سے بہتر ہے وہ ایسا رافضی خبیث اور بد بخت ہے کہ اس نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو گالیاں دینے کا حکم دیا - ایسے لوگوں کی بیعت نہیں کی جاتی اور نہ انکی امامت درست ہوتی ہے" -

قال القاضي ابوبكر الباقلاني كان المهدي عبيدالله باطنيا خبيثا حريصا على ازالة ملة الاسلام اعدم العلماء والفقهاء ليتمكن من اغواء الخلق وجاء اولاده على اسلوبه اباحوا الخمور والفروج واشاعوا الرفض -

قاضی ابوبکر باقلانی فرماتے ہیں "عبید اللہ مہدی باطنی خبیث تھا اور ملت اسلام کو فنا کر دینے کے درپے - اس نے علماء اور فقہاء کو قتل کیا کہ مخلوق کو آرام سے گمراہ کر سکے - پھر اس کی اولاد بھی اسی کے اسلوب پر ہوئی- انہوں نے شرابوں اور شرم گاہوں کو حلال کر دیا اور رفض کی اشاعت کی" -

رو بہ انحطاط ہے اور اس کی پہلی شان و شوکت ختم ہو چکی ہے - مجھے نہ تو مسرت حاصل ہوئی اور نہ ہی کچھ اور جو تہ یف کے قابل ہو - قاہرۃ آج وہ شہر ہے جو بغداد اپنی ابتداء میں تھا اور اس سے زیادہ شاندار شہر میں نے اسلامی دنیا میں نہیں دیکھا - ''

(ہ) ہسپانیہ (۷۰۰ع تا ۹۰۰ع) ہسپانیہ میں عربی ادب کی ترقی متعدد وجوہ کی بنا پر معرض التویق میں پڑی رہی - اسلامی دنیا کی انتہائی حد پر واقع ہونے کے علاوہ ہسپانیہ میں کوئی منظم مرکزی حکومت اس قسم کی نہ تھی جیسی کہ عباسیوں نے مشرق

و قال الذھبی '' کان القائم بن المہدی شرا من ابیہ زندیقاً ملعونا اظہر سب الانبیاء و قال و کان العبیدیون علی ملۃ الاسلام شرا من التتر و قال ابو الحسن القابسی و ان الذین قتلھم عبید اللہ و بنوہ من العلماء و العباد اربعۃ آلاف رجل لیردوھم عن الترضی فاختاروا الموت فیا حبذا لو کان رافضیا فقط و لکنہ زندیق'' -

امام ذہبی فرماتے ہیں کہ مہدی کا بیٹا قائم اپنے باپ سے بھی برا تھا - زندیق تھا - ملعون تھا - اسی نے انبیاء پر سب و شتم شروع کیا - یہ عبیدی لوگ ملت اسلامیہ کے حق میں تاتاریوں سے بھی بدتر تھے - ابوالحسن قابسی جو مالکی عالم ہیں وہ فرماتے ہیں عبید اللہ اور اس کی اولاد نے چار ہزار کے قریب علماء اور صوفیاء کو قتل کیا تاکہ وہ صحابہ پر دعاء رضا کرنے سے باز آئیں - لیکن انہوں نے اس پر موت کو ترجیح دی - اے کاش وہ فقط رافضی ہی ہوتا لیکن وہ تو زندیق تھا -

میں قائم کر لی تھی - عربوں اور بربروں کا باھمی جنگ و جدل اور وہ نفاق و اختلاف جن کی وجہ سے خود عرب بھی ایک دوسرے کے مخالف تھے کچھ ایسے اسباب تھے' جن کی وجہ سے زیادہ اھم ایک اور بات یہ بھی تھی کہ ان بیرونی اثرات کا کوئی ایسا متوازی سلسلہ بھی اس ملک میں موجود نہ تھا جن کے ذریعہ شام اور عراق میں عربی ادب کو ترقی نصیب ھوئی - اس ملک میں تو محض ایک وحشی گوتھک سلطنت قائم تھی جسے مسلمانوں نے زیر و زبر کر دیا تھا - مشرق میں تو عرب فاتحین مفتوحوں کے شاگرد بن گئے - (شاگرد کی بھی خوب رھی مسلمان تو شاگرد کتاب اللہ کا ھے اسی کی روشنی میں ھر علم حاصل کرتا ھے اور اسے صحیح بنیاد پر قائم کرتا ھے—م) -

لیکن ھسپانیہ میں گوتھک عیسائیوں نے عربوں کا تہذیب و تمدن اختیار کر لیا - اموی بادشاھوں نے اپنی روشن خیالی اور

و قال القاضی عیاض "سئل ابو محمد القیروانی الکیزانی من علماء المالکیة عمن اکرھه بنو عبید یعنی خلفاء مصر علی الدخول فی دعوتھم او یقتل قال یختار القتل ولا یعذر احد فی ھذا الامر" -

قاضی عیاض فرماتے ھیں " امام ابو محمد قیروانی کیزانی سے کسی نے دریافت کیا کہ اگر بنو عبید یعنی خلفائے مصر کسی کو اپنی دعوت میں زبردستی شامل کریں ورنہ موت کی دھمکی دیں تو کیا کیا جائے - آپ نے فرمایا کہ موت قبول کی جائے اور اس بارے میں کوئی شخص معذور نہیں -

فیاضانہ سرپرستی سے مشرقی علماء کو اپنے درباروں کی طرف کھینچنے کی بڑی کوشش کی اور اپنے نئے پایۂ تخت قرطبہ کو اسلامی تہذیب و تمدن کا مرکز بنانے میں کامیاب ہوگئے ، بلکہ اس مرکز سے علم و فضل کی ضیا پاشیاں حدود ہسپانیہ سے باہر تک بھی ہونے لگیں ۔ ان کے اقتدار کا عروج عبد الرحمن ثالث (۹۱۲ع تا ۹۶۱ع) کے دور حکومت میں ہوا جو ایک عظیم الشان بادشاہ تھا ۔ یہ وہی زمانہ ہے جب ہسپانیہ کے دل و دماغ نے ، جو ابھی تک عروج و ارتقاء کی منازل طے کر رہا تھا ، بعد کی چند صدیوں میں ایسے ایسے صاحب کمال اور یگانہ روزگار فاضل پیدا کیے جن کی تصانیف اسلامی تہذیب و تمدن کی درخشاں مثالیں ہیں ۔

سب سے پہلا ہسپانوی مصنف جس کی تصنیف ہم تک پہنچی ہے ، ابن عبد ربہ (۸٦۰ تا ۹۴۰ع) تھا ، جو بنوامیہ کے خاندان کا ایک آزاد کردہ غلام تھا ۔ منظوم کلام کے علاوہ اس کی اکیلی تصنیف ''العقد الفرید'' ایک مشہور ادبی قاموس یا لغت کی کتاب ہے جو زیادہ تر ابن قتیبہ کی کتاب ''عیون الاخبار'' (ص ۵۵) کی طرز پر تیار ہوئی ہے اور اس کا مواد زیادہ تر اسی کتاب سے ماخوذ ہے ۔ خود مصنف کے اپنے قول کے مطابق ، جس کا ذکر وہ دیباچے میں کرتا ہے ، یہ کتاب زیادہ تر اس کے اپنے فخریہ اشعار ہی سے پر ہے ، تا کہ ناظر کتاب کو یہ معلوم ہو سکے کہ ہمارے مغربی ممالک نے بھی ، اپنی دور افتادگی اور بعد مسافت کے باوجود ، نظم و نثر دونوں کے ارتقاء میں کافی حصہ لیا ہے ۔ عقدالفرید نے ،

اپنی سیر حاصل تشریحات اور زیادہ سادہ ترتیب کی وجہ سے ابن قتیبہ کی تصنیف کو ماند کر دیا اور آج تک یہ کتاب ذہنی تفریح کی نہایت مقبول کتاب مانی جاتی ہے - ابن عبد ربہ کو سب سے پہلے حسن پرست ہونے کا فخر حاصل ہے - اس کا جانشین ماہر لسانیات تھا اور وہ ہسپانیہ کے دبستان لسانیات کا بانی سمجھا جاتا ہے - القالی (م ۹۶۷ع) ارمینیہ میں پیدا ہوا تھا اور بغداد میں اس نے تعلیم پائی تھی - ۹۳۲ع میں وہ قرطبہ میں آ کر آباد ہوا ' جہاں اس نے اپنی زندگی کا باقی حصہ بسر کیا اور وہیں اس نے اپنی تصنیف کتاب الامالی کے درس دئیے' جن کا مطالعہ آج تک مشرق میں وسیع پیمانے پر کیا جاتا ہے - یہ اسباق مختلف موضوعات کی نحوی اور لغوی تشریحات پر مشتمل ہیں ' مثلاً آیات قرآنی ' قدیم عربی افسانے ' تاریخی بیانات وغیر ذالک ' ان میں احادیث اور اشعار کے حوالے بھی دئیے گئے ہیں -

ہسپانیہ کے ابتدائی شعراء کے متعلق ہمیں بہت کم معلومات حاصل ہیں جو صفر کے برابر ہیں - لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ روایتی شعر و سخن نے یہاں بڑی ترقی کی - جدید قسم کا اسلوب بیان بھی ہسپانیہ میں جا پہنچا اور اس طرح تمام اسلامی دنیا کی تہذیب و تمدن میں یکجہتی برابر قائم رہی - گیارھویں صدی عیسوی کے شروع میں ایک نئی صورت حالات پیدا ہوگئی - ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ مشرق میں شعرائے ادب نے مقبول عوام مذاق اور رجحان کی مطلق پروا نہ کی - ہر وہ چیز جو مقررہ ادبی دستور العمل کے

مطابق نہ پائی جاتی تھی ، اسے غیر درباری زبان قرار دے کر ناجائز قرار دے دیا جاتا تھا - گو اس مسلمہ اصول کو ہسپانیہ میں بالکل متروک قرار نہ دیا گیا ، تاہم جدید قسم کی ترکیب بند اور ترجیع بند اس زمانے کے ادب میں داخل ہونے کے پہلے پہل موشح کی صنعت جاری ہوئی یعنی چار پانچ یا چھ سطروں یا اشعار کی ترتیب ، ترکیب بند کی طرز پر ، جس کی بناوٹ اور قافیے میں اختلاف ہوتا یعنی ایک مثالی ترتیب !اب ب ب !! ک ک ک !! وغیرہ - یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ بند نویسی کا رواج ہسپانیہ میں کیوں ترقی پذیر ہوا اور مشرق میں کیوں مروج نہ ہوا - یہ بات کچھ مبہم ہی رہی - مگر یہ شک ضرور پڑتا ہے کہ ہسپانیہ کے مقبول اور مشہور گیت جو لاطینی کلساء کے گیتوں کی طرز پر بنائے گئے تھے ، شاید اس قسم کے اسلوب بیان کے موید ہوئے ہوں اور اس کی وجہ غالباً یہ بھی ہو سکتی ہے کہ عربوں کے علم موسیقی نے بھی مغرب میں کافی ترقی کی اور یہ طرز انہی اثرات کا نتیجہ ہو -

عربوں کے اجتہاد اور تعیین معیار کا مظاہرہ کسی اور جگہ زیادہ زور کے ساتھ واضح نہیں ہوتا جتنا کہ موشح کے استعمال کے متعلق مقررہ پابندیوں کے ذریعہ ہوتا ہے - ساری نظم میں ادبی زبان کا استعمال ہوتا تھا - لیکن یہ بات ایک خاص وجہ زیبائش سمجھی جاتی تھی کہ آخری مصرعہ تیز اور شوق انگیز ہو اور محاورۂ زبان سے بالکل عاری ہو - عام اوزان کو عام طور پر رائج

تھے لیکن اس قسم کی نظم میں انہیں ناپسند کیا جاتا تھا اور ابیات کو مختلف بحروں میں خاص تعداد کے لحاظ سے ایک دوسرے سے منقطع کر دیا جاتا تھا ' گو سارے بند میں وہ اندورنی طور پر ہم قافیہ رہتے تھے - یہ بات بھی کچھ کم تعجب انگیز نہیں کہ ان اصطلاحی مشکلات کے ہوتے ہوئے ' بعد کے زمانے کے موشح میں ' آمد کی کمی ہوگئی اور بالخصوص جب اس قسم کا طرز کلام مشرق میں تبدیل ہوا تو وہ بڑی تیزی کے ساتھ زوال پذیر ہوکر صرف ایک ذہنی کاوش کی صورت میں تبدیل ہوگیا اور قصیدے کی طرح محض ایک رواجی اور دستوری قسم کا کلام سمجھا جانے لگا - موشح لکھنے والوں کو معلوم ہوتا ہے کہ ایک اور دستور العمل کا بھی پابند ہونا پڑتا تھا ' اور وہ تھا انتخاب موضوع - موشح میں عشق و محبت اور مذہبی جذبات کے اظہار کے سوا ' شاذ ہی کسی اور قسم کے اشعار موزوں کیے جاتے تھے - مدحیہ قصائد میں بھی عاشق سے خطاب کرنے کے طریقوں کو ملحوظ رکھا گیا - اکثر اوقات ایسی یادگاروں کے نمونے بھی ملتے ہیں اور بعض اوقات تو دوسرے قدیم شعراء کا اصلی کلام تک بھی مستعار لے لیا گیا ہے بالخصوص عمرو بن ابی ربیعہ (ص ۳۲) کے کلام کو تو خاص طور پر استعمال کیا گیا ہے ' اور بعد کے زمانے کے شعراء نے اپنے پیش رووں کے موشحات کو تو بڑی آزادی کے ساتھ لوٹا ہے -

تاہم قدیم زمانے کی ترکیبیں برابر جاری رہیں اور ان کی

ہمہ گیری میں کسی قسم کا فرق نہ آیا۔ غالباً اس قسم کے شاعر بہت ہی کم تھے جنہوں نے اپنے آپ کو صرف بند نویسی کی طرز پر شعر کہنے کے دائرے میں محدود رکھا ہو۔ پر استعارہ جملوں اور دور افتادہ فخریہ خیالات کی بھرمار، مشرق کے کلام میں نمایاں رہی چنانچہ ایک ہسپانوی قصیدے کے اس شعر کا جواب نہیں ملتا :

اس کے اندر پہنے کے کپڑے بوسیدہ کیوں نہیں ہو جاتے کیونکہ وہ تو ماہ کامل ہے اور یہ کپڑے کتان کے ہیں۔ ابن خلکان جیسے کہنہ مشق ادیب کو لازمی طور پر یہی تشریح کرنا پڑی کہ چاندنی میں کتان کے کپڑے بوسیدہ ہو جاتے ہیں۔

اندلس کے شعر و سخن کا عہد زرین ان حدود سے جو ہم نے مشرق کے متعلق معین کی ہیں چند سال آگے تک چلا جاتا ہے۔ اموی خاندان کے زوال (نواح ۱۰۲۰ع) اور اسلامی ہسپانیہ کے کئی سلطنتوں میں تقسیم ہو جانے کے باعث، اس زمانے کے علم و ادب اور شعر و سخن میں انحطاط کے بجائے کچھ اور ترقی ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک شاہی دربار کی بجائے کوئی ایک درجن دربار بن گئے۔ گیارھویں صدی کے بیشمار شاعروں میں سے دو بہت مشہور ہیں۔ ابن زیدون، باشندہ قرطبہ (۱۰۰۳ع تا ۱۰۷۱ع) ہسپانیہ کے بڑے بڑے شعراء میں شمار ہوتا ہے اور ابتدائی عشقیہ گیتوں اور بعد کی زندگی میں اپنے منظوم کلام دونوں اصناف میں، اس کا پایۂ بلند ہے۔ دوسرا المعتمد (۱۰۴۰ع تا ۱۰۹۵ع) ہے جو اشبیلیہ کا آخری اور مقامی حکمران تھا۔ ان

دونوں کی شہرت اور ناموری ان کی زندگی کے حالات سے کم و بیش متعلق ہے - ابن زیدون تو ایک قسمت آزما منچلا تھا جو اموی شہزادی ولادہ کے عشق میں مبتلا تھا اور اس کی محبت بطور خود ایک رومان تھی - دوسری طرف المعتمد کو دو مختلف دوروں سے سابقہ پڑا - کجا وہ زمانہ جب اس کا عالیشان دربار قائم تھا اور وہ شاہان ہسپانیہ میں سب سے بڑا حکمران تسلیم ہوتا تھا اور کجا اس کی دردناک موت جب وہ ایک قیدی کی حیثیت سے ملک مراکش میں جان بحق ہوا - بہرحال دونوں کے دونوں (اپنے بیشمار ہم وطنوں کی طرح) ایسے انسان تھے جو زندگی کے معمولی سے معمولی انقلاب سے متاثر ہوکر فوراً شاعری کا لبادہ پہن لیتے ہیں - البتہ یہ بات قابل افسوس ہے کہ اس خوش کن اور ولولہ انگیز عربی کلام کا کوئی انگریزی ترجمہ موجود نہیں - ابن زیدون اپنی نثر نویسی کی وجہ سے بھی برابر کی شہرت کا مالک ہے - کچھ تو اپنے مکتوبات کی وجہ سے اور کچھ اس رسالہ کی وجہ سے جو ''ہزلیہ'' کے نام سے مشہور ہے - ادبی صنعتگری کا یہ ایک مکمل نمونہ ہے اور ایک چبھتی ہوئی ہجو ہے - مفصلہ ذیل اشعار اس کی ترکیب بند منظومات سے ماخوذ ہیں : ترجمہ حسب ذیل ہے -

(۱) اب بھی قلعوں کے ارگرد باران رحمت کا نزول ہوتا ہے اور اب بھی پتوں کے جھرمٹ میں فاختہ کوکو کرتی ہے - قرطبہ شجاع اور بہادر انسانوں کا خوب ترین وطن تھا جہاں اٹھتی جوانی نےمیرے بچپن کے تعویذ دور کرکے اتارے اور امرائے کبارنے

مجھے آزاد اسیر بنایا -

خوشا وہ ایام جو مسرتوں اور برکتوں سے بھرے تھے ' جہاں موڑ توڑ والی وادیوں میں ' ہم البیلے پن سے اپنی جوانی کے زمانے میں گھومتا کرتے تھے - ہماری سرخ و سپید گردنیں ' کوسے ایسے کالے بال ' ! خوشی اور زندہ دلی کے سوا اور کوئی کام نہ تھا - ہمارے گھسٹتے ہوئے لبادوں یا ریشمیں مرزائیوں کو برا مت کہو وہ تو جوانی کا ایک غرور تھا - ہم کچھو کم چنچل نہ تھے -

اب وہ زمانہ کہاں ! وہ عیش سب نابود ہو چکے ہیں - اس کے آثار راتوں کے گزرنے سے ماند اور پھیکے پڑ چکے ہیں -

الوداع ' الوداع ! ایک ایسے دل کی الوداع جس میں ابھی تک تیرے عشق کی آگ جل رہی ہے -

گیارھویں صدی کے ادب میں نثر نویسی کے اعتبار سے قرطبہ کے ابن حزم (۹۹۴ع تا ۱۰۶۴ع) کا نام بڑا نمایاں ہے - یہ شخص ایک ہسپانوی کا پوتا تھا - اپنی زندگی کے ابتدائی سالوں میں وہ ایک بہت مشہور شاعر تھا لیکن اس کے خیالات و عقاید اسلامی دینیات میں بے حد محدود تھے - اس لیے اس کی سرگرمیاں اپنے مذہبی مخالفین کی جانب منعطف ہو گئیں - اس کی زبان کی تیزی کی مثال مشہور ظالم الحجاج کی تیزیٔ شمشیر سے دی جاتی تھی اور اسی زبان کی تیزی کی بدولت اسے مجبور ہو کر تمام سیاسی سرگرمیوں سے دست بردار ہونا پڑا اور عملی طور پر وہ خارج از قوم سمجھا جانے لگا - اس کی دینی اور تاریخی سرگرمیوں کی مکمل تفصیل کے متعلق تو ہمیں کم آگاہی حاصل ہے ' البتہ

اس کی ایک نہایت قابل قدر تصنیف ہم تک ضرور پہنچی ہے جو مختلف مذاہب اور فلسفی گروہوں کے متعلق ہے (کتاب الملل و الا ھواء و النحل) ۔ گو یہ بات ضرور قابل تعجب ہے کہ اس مضمون کی پہلی کتاب ھمیں عربی ادبیات میں ملے لیکن اس کے اسباب کی جستجو ھمیں زیادہ نہ کرنا پڑے گی - (اس عنوان پر سب سے پہلی کتاب امام ابوالحسن اشعری رح کی مقالات الاسلامیین ہے- ابن حزم نے اس موضوع کو وسیع تر کرکے مسلم و غیر مسلم سب پر حاوی کر دیا ـم) ۔ عرب فاتحین کی رواداری کی وجہ سے سلطنت میں ایسے بے شمار فرقے موجود تھے جن کے مذھبی خیالات بے حد مختلف تھے- ان میں یہودی ' نصرانی ' زردشتی اور نیم کافر لوگ بھی شامل تھے - ان عقائد کے باھمی اختلافات اور ان کے اپنے عقائد کے درمیان جو بعد و تفاوت واقع تھا اس کی وجہ سے کئی مسلم علماء نے قدیم الایام ھی سے اس مسئلہ پر توجہ دی اور اس طرح بہت سا اختلافی ادب معرض وجود میں آ گیا (مثال کے طور پر اسی قسم کی ایک کتاب ھی کو لے لیجیے جو ۸۰۸ع میں علی بن ربان الطبری نے لکھی تھی جو خود عیسائی تھا اور بعد میں مسلمان ھوا) اور اس کے بعد ان مذاھب کے متعلق ایک اصولی جستجو کا شوق پیدا ھوگیا ۔ اس کے علاوہ کئی انتظامیہ مسائل بھی ایسے تھے جن کا تعلق غیر مسلموں پر تشخیص ٹیکس اور ان کی قانونی حیثیت سے تھا ' جن کے لیے ضروری ھوگیا کہ ان مذاھب اور ان کے اعمال کا کچھ مطالعہ کیا جائے ۔ اسلامی فرقوں میں بھی مختلف الخیال فقہی دبستان قائم ھوگئے جن کی وجہ

سے قابلی عقائد کے متعلق مختلف تصانیف ہوئیں ' جو عام طور پر احتلافی مقاصد کی غرض سے لکھی گئیں' مثلاً الفرق بین الفرق جو ابو منصور البغدادی نے لکھی (م ۱۰۳۷ ع) جس نے سوائے ان فرقوں کے جو اپنے آپ داخل اسلام سمجھتے تھے اور کسی فرقے یا مذہب کے متعلق کچھ نہیں لکھا - یہ کام ابن حزم ھی کا تھا کہ اس نے سب سے پہلے بنی نوع انسان کے مذاھب کے متعلق ایک مبسوط اور تنقیدی کتاب لکھی ' جس میں مختلف فرقوں اور ادبستانوں کو شامل کر لیا - اس کی کتاب مختلف مذاھب کی دینی فلسفی تقسیم بندی سے شروع ہوتی ھے ' جس کی بنیاد ھر مذھب کے عقائد ' خالق عالم اور پیغمبروں کی تبلیغ وغیرہ پر رکھی گئی ھے - مثال کے طور پر نصرانیت ایک مذھب کی ایسی صف میں آتی ھے جن کا عقیدہ ھے کہ دنیا ایک مدت خاص میں معرض وجود میں آئی اور اس کے خالق ایک سے زیادہ تھے اور وہ بعض رسولوں کی رسالت کے منکر ھیں (یعنی رسول اکرم اور عربی انبیاء) - ھر باب میں ان عقائد کے ثبوت میں جو دلائل دئیے جاتے ھیں انہیں وہ بالتفصیل پیش کرتا ھے اور پھر ان سب کی یکے بعد دیگرے تردید کرتا چلا جاتا ھے - کتاب کا ایک بہت بڑا باب نہایت پرزور تبصرہ اور تجزیہ کے لیے وقف ھے ' جن میں مختلف ابواب اور اشعار کا حوالہ ھے ' جن کے ذریعے وہ ان تمام متناقض دلائل کی تردید کرتا ھے اور مسلمانوں کی توجہ ان ھزلیات کی طرف دلاتا ھے جو عیسائیوں کے قدیم اور جدید عہد ناموں میں موجود ھیں - اس کے بعد مسلمانوں کے تمام فرقوں اور

فلسفی دبستانوں کا ذکر ہے اور آخر میں ابن حزم کے خود اپنے د
اور فلسفی عقائد کے ذکر پر کتاب ختم ہو جاتی ہے ۔ یہ ظاہر ہے
اس کتاب کا مقصد اور اسلوب مخالفانہ ہے لیکن اس کتاب کی و
سے اسی موضوع پر زیادہ منصفانہ کتابیں بھی لکھی گئیں ۔

یہ ایک قدرتی بات تھی کہ ملک ہسپانیہ کے مورخین ا
تمام تر توجہ ہسپانیہ میں عربوں کی تاریخ کے موضوع پر
مرکوز رکھیں ۔ اس قسم کی جو معیاری کتابیں مشرق میں لک
گئی تھیں ، انکی اشاعت مغرب میں بھی ہوگئی اور مک ہسپ
کے ذکر کے متعلق جو خامیاں اور کمی ان میں باقی رہ گئی ت
اس کی تکمیل و صحت ضروری تھی ۔ سب سے پہلی اور اصلی تصن
جو ہمارے علم کے مطابق ہسپانوی عربی تاریخ کے متعلق لکھی
وہ Chronica del moro Rasis ہے ، جس کا نسخہ مصححہ محا
ہے ، لیکن اس کے علاوہ ابتدائی زمانے کی اور بہت سی تاریخیں یا
بالکل ضائع ہوچکی ہیں یا ان کے صرف چند اجزاء ہی موجود ہیں
اس کے برعکس سوانح کا ایک نہایت ہی اہم سلسلہ جو دسویں ص
عیسوی کے اواخر سے شروع ہو کر تیرھویں صدی تک چلا جاتا ہ
خوش قسمتی سے محفوظ رہ گیا ہے ۔ اس کے ذریعے ہم بڑی تفص
کے ساتھ ان ادبی حلقوں کی سرگرم زندگی کا ڈھانچہ از سر نو تع
کرسکتے ہیں ، جو اپنے زمانے میں یورپ کی بہترین تہذیب و ت
کے علم بردار تھے ۔

٦ ـ نقرئی عہد (١٠٥٥ء تا ١٢٥٨ء)

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں عربی ادبیات کا ارتقاء زیادہ تر بادشاہوں اور امیروں کی سرپرستی پر مبنی تھا۔ اس لئے مسلم تاریخ کے انقلابات کے باعث اس پر بہت برا اثر پڑا اور یہ کوئی خود رائی کا فیصلہ نہیں، کہ ١٠٥٥ء کے بعد اس سلسلے میں ایک نیا دور شروع ہوا۔ اس سال سے ایک ترکی خاندان یعنی سلجوقیوں نے بغداد میں داخل ہو کر مغربی ایشیا میں ترکی اقتدار مستحکم کر لیا۔ اس انقلاب کے اثرات بہت جلد عربی ادبیات میں نظر آنے لگے۔ ترکوں کے عہد میں غیر مہذب خانہ بدوش لوگ بر سر اقتدار آئے جن پر فوجی امراء حکومت کیا کرتے تھے۔ اس لیے اس صورت حالات کو کسی قسم کا استحکام نصیب نہ تھا۔ صرف چند مستثنیات کے سوا، ایشیاء میں ان کی حکومت کے دور میں متواتر انقلاب ہوتے رہتے تھے۔ عام طوائف الملوکی کی حالت تھی اور اس کے ساتھ ساتھ ملک میں عام تباہی، آبادی کی کمی اور سرکاری مالگزاری میں جبرستانی کا رواج عام تھا۔ ان باتوں سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ علم ادب کا قیام تو کجا، کسی قسم کے معاشرے کا قائم رکھنا مشکل امر تھا۔ کبھی کبھار اگر کوئی مضبوط یا روشن خیال حکمران بر سر اقتدار آبھی جاتا تو اس کی وجہ سے صورت حالات میں کوئی ٹھوس تبدیلی یا اصلاح نا ممکن تھی۔ چنانچہ ان دو صدیوں میں، ترکوں کی طوائف الملوکی اور لوٹ مار کی وجہ سے عربوں اور ایرانیوں نے جو نظام حکومت تعمیر کیا

تھا وہ پاش پاش ہوگیا ۔

ترکوں کا اقتدار ایک اور اعتبار سے بھی عربی ادبیات پر بری طرح اثر انداز ہوا ۔ ایرانی شہزادے عربی ادب سے بخوبی واقف تھے اور اس لیے وہ اس کی امتیازی سرپرستی کرتے رہتے تھے ۔ لیکن ترک، جو مغربی ایشیا میں حکمرانی کیا کرتے تھے، شاذ ھی عربی علم و فضل سے آشنا ہوتے تھے اور انھی کے زمانے میں ایرانیوں نے اپنے ادب کی ترقی میں غلبہ حاصل کیا ۔ عربی تصانیف کا مطالعہ اب ثانوی حیثیت رکھتا تھا اور سلطان کی نظر عاطفت کو اب صرف دربار کے چند عربی بولنے والے اراکین مبذول کرانے لگے، جو زیادہ تر علمائے دین یا دبیر سلطنت ھی ھوا کرتے تھے ۔ علمائے دین تو ھر قسم کے بے لگام تخیل کے اصولی طور پر مخالف تھے اور کاتبوں یا دبیروں کو علم لسانیات کی حدود سے باھر قدم رکھنے میں شاذ ھی کوئی دلچسپی پیدا ہوتی تھی ۔ ان حالات میں جو رکاوٹیں کسی مصنف کی راہ میں حائل تھیں ان سے کما حقہ عہدہ برا ہونا قریب قریب نا ممکن تھا ۔ ان حالات کا ایک بدیہی نتیجہ یہ نکلا کہ غلامانہ تتبع کو جس کے آثار ابتدائی زمانے ھی سے عربی ادب میں پائے جاتے تھے بڑی ترقی حاصل ہوئی ۔ اس کے علاوہ غیر مذھبی مصنفین کی تصانیف میں عجیب و غریب قسم کے اعتذار نمایاں طور پر نظر آنے لگے جنھیں وہ اپنے دیباچوں میں شامل کرنا ضروری سمجھتے تھے ۔

یاقوت، علماء و فضلا کی لغات یعنی معجم الادبا میں،

رقمطراز ہے کہ ”میں ان قابل نفرین نقادوں کی فطرت سے بخوبی آشنا ہوں، جو مجھ پر گندگی اچھالیں گے اور مجھے بدنام کرنے کی کوشش کریں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دل جہالت کے زہر کی آلودگی کی وجہ سے مسموم ہو چکے ہیں اور جن کے ضمیر کی گہرائیوں میں عطیات قدرت کے خلاف بغاوت کرنے کا مادہ موجود ہے۔ ان کا دعوے ہے کہ مذھبی امور میں انہاک نہ صرف اس دنیا کے لیے بلکہ عقبیٰ کے لیے بھی زیادہ ضروری اور اہم ہے۔ کیا وہ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ انسان کی افتاد کو مختلف سانچوں میں ڈھالا گیا ہے اور ان کی اہلیت، ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ اور مختلف ہے؟ خداوند نے ہر قسم کے علم و فن کی پوری حفاظت کے لیے خاص خاص آدمی پیدا کیے ہیں۔ منشائے ایزدی یہ ہے کہ موجودات میں ترتیب قائم ہو۔ ہر انسان کی ایک خاص کام کی طرف قدرت رہنمائی کرتی ہے جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا تھا (ہر کسے را بہر کارے ساختند۔م)۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ اگر میں مسجد و مصلی کے ساتھ ہی پیوست ہو کر رہ جاتا تو اس قسم کا طریق عمل آئندہ زندگی میں میری حفاظت وصیانت کے لیے زیادہ موزوں ہوتا، لیکن مجھے بہترین طریق عمل اختیار کرنے کی توفیق حاصل نہ ہوئی اس لیے یقیناً ہر نیک انسان کے لیے یہی بات کافی ہے کہ وہ نہ تو کوئی قابل ملامت کام کرے اور نہ ریاکاری سے کام لے“۔

یہ ایک حقیقت نفس الامری ہے کہ ان ممالک میں جہاں عربی

زبان بولی جاتی تھی حالات بالکل مختلف تھے اور یہ حقیقت اس بات ۔
ظاہر ہے کہ ملک شام اور مصر نے عربی ادبیات کی توسیع و ترق
میں بہت بڑا حصہ لیا -

تاہم اس قسم کی ادبی تصانیف میں ، جو اس زمانے سے یہ
تک شائع ہوئیں ، نمایاں طور پر بڑھتی ہوئی مقدار کے مقابلہ میں
ان کے محاسن رو بہ انحطاط نظر آتے ہیں - جوں جوں ادبی حلقہ صرف
اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی اقلیت میں محدود ہوتا چلا گیا ، اسی
قدر ادبی معیار اور غور و فکر میں بھی تنگی پیدا ہوتی چلی گئی او
جیسا کہ عام دستور ہے ، وسعت نظر اور معیار ادبی کی کمی
پوری کرنے کے لیے محض تصنع اور ادعائے فضیلت نے لے لی - خود
مختارانہ قوت خیال کی جگہ ، اسناد پر حصر ہونے لگا - طبع زاد
تصانیف پر خلاصوں اور اقتباسات کو ترجیح دی جانے لگی - لطافت
بیان اور صناعانہ صلاحیت ، جس میں پرانے مصنفین کی تصانیف
اپنی خاص شان اور بذلہ سنجی کے ساتھ ملبوس نظر آتی تھیں ، اب
ان کی جھوٹی تقلید یہ لوگ خود کرنے لگے - گویا کہ نفس ادب
کا گلا گھونٹ کر رکھ دیا - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس دور
کی عدم صلاحیت کو خود چھپانا چاہتے تھے - Montaigne نے کیا
اچھا لکھا ہے کہ " وہ گھوڑے کی پیٹھ پر کود کر بیٹھ گئے
کیونکہ ان میں اپنے پاؤں چلنے کی سکت باقی نہیں رہی تھی " -
یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مقامی علوم و فنون کی
تحصیل سے جس میں یونانی خیال کو بڑا دخل تھا ، عربی علم ادب

خوب پھلا پھولا - اس زمانے تک یونانی خیال کی قوت محرکہ بالکل ختم ہو چکی تھی اور ان کتابوں کا مطالعہ جن میں اصل قوت محرکہ اسی خیال کی تھی مگر وہ خیال کیا جاتا تھا اور صرف ایسے حنفیہ تک محدود تھا جس کا اثر بڑی تیزی سے معدوم ہو رہا تھا ۔ (مصنف کا یہ خیال بہت دلچسپ ہے کہ علوم و فنون کی ترقی کی مدار یونانی طرز فکر پر ہے -م) کثر قسم کی مکتب پرستی علوم دین میں تو پہلے ہی سے غالب تھی ، اب اس کے علامات و نشانات ظاہر ہونے لگے (مگر یہ چیز نہ تو پہلا واسطہ اس انحطاط کا سبب تھی اور نہ اس کا نتیجہ) جس کے ذریعہ اسلام کا دل و دماغ ماؤف ہوکر مفلوج ہو رہا تھا ۔

یہ ہمارے زمانے کا ذکر ہے کہ یہ اثرات ، جن کا ماخذ مشرق ہے ، سارے کے سارے اسی تمدن و تہذیب میں کامیابی کے ساتھ سرایت کر گئے - اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ایک چیز جو بڑے زور کے ساتھ اس دمیانی کی معاون ثابت ہوئی ، کثر معابد کی یونیورسٹیوں کا قیام تھا - وہ قوت حافظہ کی تربیت تھی - چھ سات سال کے بچے قرآن حفظ کر لیا کرتے تھے اور انہیں مقامات اور متنبی کا کلام بھی زبانی یاد ہو جایا کرتا تھا - سالہا سال تک شب و روز ان کی کل سرگرمی اور کد و کاوش اسی بات کے لیے وقف ہوتی تھی کہ وہ بے شمار تفاسیر اور شرحوں کی شرحیں جو علم نحو منطق اور دینیات پر لکھی جاتی تھی ، ان سب کو وہ زبانی یاد کر لیں ۔ یہ کوئی خاص اعجاز نہ سمجھا جاتا تھا کہ ایک طالبعلم

بیس سال کی عمر کے اندر اندر سو دو سو کتابوں کے متن اپنے دل و دماغ میں محفوظ کرلے۔ اعلیٰ تعلیم پر علماء نے اپنا پورا تسلط قائم کر رکھا تھا اور اس طریق سے وہ خالص ذہن و ذکا کی تقطیر کر لیا کرتے تھے اور ان تمام خطرات کی پوری بیخ کنی کر دیتے تھے جن کے پیدا ہونے کا احتمال یا تو وسعت مطالعہ کے سبب ہوتا تھا یا خود سری کی بنا پر۔ اس قسم کے دباؤ سے لازمی طور پر اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑا اور شاید ہمارا یہ خیال کلی طور پر متناقضانہ نہ ہو کہ اس دور کے فطری خیالات کی سر گرمی دینی حلقوں ھی میں رونما ہو کر رھی۔ (مصنف کے اس بیان کے تجزیے کی ھم میں تو قدرت نہیں، شاید کوئی اور صاحب علم کو سکے۔م)۔

فصل۔ ۱۔ عراق و ایران

یہ دور اسلامی اور مذھبی نقطۂنظر کے سب سے بڑے مفکر امام غزالیؒ کے نام سے شروع ھے۔ الغزالیؒ نے (۱۰۵۹ء تا ۱۱۱۱ء) نیشاپور اور بغداد میں شاندار شہرت و ناموری حاصل کرنے کے بعد اچانک درس و تدریس کا سلسلہ بند کر دیا اور پورے دس سال تک دنیا سے کنارہ کشی اختیار کیے رکھی۔ وہ آپ لکھتے ھیں وہ شکوک اور شبہات کے دباؤ کی وجہ سے لاادریت کے ھم خیال ہونے لگے اور اس لیے وہ اس کوشش میں مصروف ہونے کہ وہ اپنے کھوئے ہوئے ایمان کی دوبارہ تلاش کریں۔ آپ کو علمائے دین

کی مکتب نوازی، علم فلسفہ اور اہل شیعہ کے اصول و عقائد سے تشفی نہ ہوئی ۔ آخر کار آپ تصوف کی جانب راغب ہوئے، جس کے ذریعے آپ پر انوار و تجلیات کا ورود ہونے لگا۔ آپ اپنے وطن مالوف میں واپس آ گئے جہاں آپ نے اپنی زندگی کے باقی دن مطالعہ، مراقبہ کی حالت میں اپنے مریدوں کے ساتھ گزارے۔

آپ کی ادبی سرگرمیاں اس وقت سے شروع ہو گئی تھیں جب آپ بغداد میں درس و تدریس کے کام میں مصروف تھے۔ آپ نے عام دینی موضوعات پر کئی رسالے لکھے، جن میں غالی شیعوں کے متعلق ایک مناظرے کی کتاب بھی شامل ہے اور اس کے علاوہ ایک اور کتاب تہافۃالفلاسفہ ہے۔ ان کتابوں میں خالصتہً دینی معاملات میں دلائل منطق کا استعمال کیا۔ تاہم اسلام کی تاریخ میں نیا دور اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب آپ نے صوفی نقطۂ نظر کا قائل ہو کر ایک سلسلۂ تصانیف تیار کیا۔ آپ کا مقصد یہ تھا کہ تصوف کے اساسی اصول و عقائد اور صوفی کی زندگی کی کیفیات کو خالص مذہبی عقائد میں داخل کر کے اس توازن کو پورا کریں جو دبستان اشعریؒ کی ملائیت کی وجہ سے ضائع ہو چکا تھا اور الفاظ و دلائل متعلقہ ما الالفاظ اور نظام تقسیم اصول دین، وغیرہ کی جگہ موضوعی اور نفسی مشاہدات دینیہ کی ترویج کریں، (یہ مصنف کا اپنا خیال ہے ورنہ بڑے بڑے صوفیائے کرام سب کے سب اشعری عقائد رکھتے تھے اور خود امام غزالیؒ بھی—م) اپنی تصنیف منقذ میں وہ اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر اپنے ایمان کے بنیادی

اصول بیان کرتے ہیں جن کی مفصل تشریح و تفسیر آپ نے اپنی سب سے بڑی تصنیف احیاء علوم الدین میں کی ہے۔ ان معیاری تصانیف کے علاوہ آپ نے عام استعمال کے لیے چھوٹی چھوٹی، ایمان افروز کتابیں عربی اور فارسی زبان میں بھی لکھیں جن میں سے بعض تو لب و لہجہ اور نفس مضمون کے اعتبار سے ہمارے موجودہ زمانے کے ان رسالوں سے بے حد مشابہ ہیں جو انجیل کے موضوعات پر لکھے گئے ہیں۔ (بہت ممکن ہے کہ ان پادریوں نے بھی غزالی کی تصانیف سے استفادہ کیا ہو—م)۔

امام غزالی کچھ اتنے بڑے طبعزاد مفکر نہ تھے لیکن وہ زبردست شخصیت کے مالک ضرور تھے۔ آپ کی تصانیف کا فوری اثر تو یہ ہوا کہ کٹر اعتقادات کے نقطۂ نظر میں علم تصوف کی بہترین اخلاقیات کا جذبہ پورے طور پر سرایت کر گیا۔ لیکن ان سب چیزوں کے باوجود آپ کا انحراف بہت زیادہ اساسی قسم کا تھا۔ بعد کی نسلوں کے لیے آپ کو دوسرے بہت سے علماء کی طرح ایک عالم دین مانا جانے لگا۔ احیاء کی تعلیمات فراموش ہوگئیں اور جب تک اٹھارھویں صدی کے اواخر میں اس کا دوبارہ اجراء نہ ہوا مسلمانوں میں اس کتاب کی اہمیت کے متعلق کوئی بیداری پیدا نہ ہوئی (یہ مصنف کا اپنا خیال ہے ورنہ احیاء کی قدر و قیمت کسی زمانے میں بھی کم نہیں ہوئی—م)۔ یورپ کے علماء میں ان کو ایک مدت سے حیرت و محویت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے اور ان کے سب سے بڑے مخالف ابن رشد (ص ۹۹) کی طرح ان کی

شخصیت تاریخ اسلام کے ان چند افراد میں شمار ہوتی ہے جن کی وجہ سے یورپ کا بہت سا علم و ادب فراہم ہوا۔

امام غزالی کی تصنیف کے انقلابی پہلو کو زیادہ دلچسپی اور قدر افزائی کی نیت سے سمجھنے کے لیے ہمیں ان کا موازنہ انہی کے ہم زمانہ دو مشہور عالمان دین سے کرنا چاہیے۔ الزمخشری خوارزمی رح (۱۰۷۵ع تا ۱۱۰۳ع) علم دین کے اسانیاتی دبستان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان چند کتابوں میں سے جو یورپ کے دبستانوں میں کچھ زیادہ متداول تھیں آپ کی صرف و نحو کی کتاب المفصل بھی تھی اور اس کے علاوہ اخلاقیات پر آپ کی جامع کلمات کی ایک کتاب تھی نہایت شاندار مقفیٰ نثر میں اطواق الذہب فی المواعظ والخطب کے نام سے مشہور تھی۔ امام فخر الدین رازی رح (۱۱۴۹ع تا ۱۲۰۹ع) اس کے برعکس ایک فلسفی اور قاموس نویس تھے۔ آپ عالم بشریت کے سب سے بڑے ہمدرد اپنے زمانے میں ہو گزرے ہیں۔ آپ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آپ نے سب سے پہلے اپنی تصانیف میں باقاعدہ ترتیب و تدوین کو قائم کیا۔ یہ تصانیف مختلف موضوعات پر ہیں، مثلاً علوم دین و فلسفہ سے لے کر علم النقوش اور علم ہیئت و نجوم تک۔ یہ دونوں عالم زیادہ تر اپنی تفاسیر قرآن کی وجہ سے زیادہ مشہور ہیں کیونکہ تفسیروں کی تصنیف اس زمانے کا ایک عام شغل تھا۔

امام سیوطی رح لکھتے ہیں کہ ہر قسم کے متبحر عالم تفسیر قرآن ضرور لکھا کرتے تھے۔ لیکن ان میں سے ہر ایک اپنی

تصنیف کو اپنے مخصوص فن تک ہی محدود رکھتا تھا۔ آپ دیکھیں گے کہ ایک نحوی کو سوائے نحوی تراکیب اور ان معنی کے جس میں کوئی لفظ استعمال ہو سکتا ہو اور کچھ نہیں سوجھتا۔ مورخ کی دلچسپی صرف اسی حد تک محدود ہوتی ہے کہ وہ مخصوص بیانات و حالات پر توجہ دے۔ وہ ایسے بیانات کی مکمل تشریح کرنے میں بال کی کھال نکالتا رہتا ہے اور متقدمین کے افسانوں کا ذکر کرتا ہے خواہ وہ سچ ہوں یا جھوٹ۔ فقیہ قانون کے متعلق ناقابل برداشت مقالے لکھنا شروع کر دیتا ہے اور اکثر اوقات اپنی حدود سے باہر نکل کر اصول و فقہ کے نکات ایسی آیات سے استنباط کرنے لگ جاتا ہے جن کا ان نکات سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا۔ اسی طرح ماہر نفسیات و فلسفہ بالخصوص امام فخر الدین رح رازی اپنی تفسیر کو اسلامی اور یونانی حکماء کے اقوال و اسناد سے پر کر دیتے ہیں اور بات میں سے بات نکالتے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ ناظر کتاب حیرت و استعجاب کے چکر میں گم ہو کر یہ خیال کرتا ہے کہ اصلی آیت سے آخری اصول بحث کا کوئی تعلق یا جوڑ ہی نہیں رہا۔ چنانچہ ایک متبحر عالم دین کی یہ رائے ہے کہ "اس تفسیر میں اور تو سب کچھ ہے، لیکن تفسیر نہیں ہے"۔

گو زمخشری کی تصانیف میں معتزلی "الحاد" (یہ الفاظ سخت ہیں) کی علامات موجود ہیں، لیکن انکی تفسیر جس کا نام کشاف ہے اتنی کثرت سے استعمال ہونے لگی کہ اگلی صدی میں

اس کی "نیش زنی" کو دور کرنے کے لیے البیضاوی رح و (۱۲۸۶ ع—م) نے اس کتاب کو قابل اعتراض عبارتوں سے پاک صاف کرکے شائع کیا اور اس صورت میں وہ آج تک مقبول ترین تفسیر کی کتاب شمار ہوتی ہے۔ (امام ابو قاسم محمود جار اللہ بن عمرو الزمخشری اتنے بڑے عالم تھے کہ امیر مکہ علی بن عیسیٰ بن دھاس الحسنی رح نے ان کی مدح میں کہا ہے: جمیع قری الدنیا سوی التی تبوا ھا دارا فداء زمخشرا: دنیا کی ہر بستی، سوائے اس بستی کے جو انہوں نے اپنے وطن قرار دیا ہے، زمخشری پر قربان ہے—م)۔

علم لسانیات اور خاص ادب کی اقلیم میں اس دور کے تمام مصنفین کے نام حریری بصری (۱۰۵۴ع تا ۱۱۲۲ع) کے مقابلہ میں ماند پڑ جاتے ہیں۔ انہوں نے معمول کے مطابق لسانیات کی تعلیم، اپنے وطن کے مدرسے میں پائی، جس کی شہرت اب تک قائم تھی، اور اس کے بعد ان کے وقت کی آمرانہ حکومت میں کسی چھوٹے سے عہدے پر مقرر ہوگئے۔ اس عہدے کے معمولی مواجبات اور اپنے ذاتی ذرائع کی مدد سے، وہ لسانیات کے مطالعہ میں مصروف رہے۔ اپنے طبقے کے اور لوگوں کی طرح بدیع الزمان کے مانند ہی سے، انہوں نے صنعت سجع میں کمال حاصل کر لیا تھا، لیکن انہوں نے اس عرصے میں کوئی قابل ذکر تصنیف نہ کی تھی کہ اچانک وہ اپنی تصنیف "مقامات" کی وجہ سے شہرہ آفاق ہوگئے۔ یہ مقامات بدیع الزمان کے مقامہ کی کھلی

اور آزاد تقلید تھی - نہ صرف ادبی لحاظ سے یہ ایک نقل تھی، بلکہ اس کی بناوٹ اور اداکاروں کے بیانات کی طرز کی بھی پوری پوری نقل کی - حریری نے اپنی کتاب میں ابو زید سروجی کو ہو بہو ایسے لباس میں پیش کیا ہے، جس طرح ہمدانی نے بذلہ سنج آوارہ گرد ابوالفتح ساکن اسکندریہ کی تصویر کھینچی ہے - جس واقعہ سے متاثر ہوکر انہوں "مقامات" تصنیف کی اس کا ذکر انہوں نے اپنے ہی الفاظ میں یوں بیان کیا ہے :

" ابو زید سروجی ایک چم چچڑ قسم کا بوڑھا بھکاری تھا - یہ شخص بے حد باتونی تھا - بصرے میں آ نکلا - ایک دن بنو حرام (وہ محلہ جس میں حریری رہا کرتے تھے) کی مسجد میں آ کھڑا ہوا اور آداب و سلام کے بعد بھیک مانگنے لگا - چند قاضی بھی اس وقت وہاں موجود تھے اور اس وقت مسجد بھی امرائے کبار سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی چنانچہ وہ سب کے سب اس کی فصاحت اور بذلہ سنجی سے محظوظ، اور اس کی چست فقرہ بندی سے خوش ہوئے - اس موقع پر اس نے یہ واقعہ بھی بیان کیا کہ کس طرح یونانیوں نے اس کی لڑکی کو گرفتار کر لیا - جس طرح میں نے اپنے مقامہ " حرام " میں بیان کیا ہے - اسی شام کو بصرہ کے مشاہیر اور علماء و فضلا میرے گھر پر بھی جمع ہوئے اور میں نے اس فقیر کی بابت جو کچھ دیکھا اور سنا تھا انہیں بھی سنایا اور اس کے لطیف اسلوب اور بذلہ سنجی کا بھی ذکر کیا جو اس نے اپنی مقصد براری کے لیے استعمال کی تھی - اس پر ہر شخص نے جو وہاں موجود

تھا ایک ایک کرکے اسی شخص کے متعلق وہ حالات بیان کیے
جو ہر ایک نے اپنی اپنی مسجد میں اس کے متعلق سنے تھے - یہ
گفتگوئیں اس گفتگو کے مقابلے میں جو میں نے سنی تھیں زیادہ دلچسپ
تھیں اور مختلف موضوعات پر تھیں - یہ شخص اپنا لباس اور اپنا حلیہ
بدل کر ہر مسجد میں جایا کرتا تھا اور اپنے فن کا اظہار طرح
طرح کے طریقوں سے کرتا تھا - لوگوں کو اس بات پر بڑا تعجب
ہوتا تھا کہ وہ اپنی مقصد براری کے لیے کتنی محنت کرتا ہے اور
اپنا بھیس بدلنے اور اپنی ذہانت کے اعتبار سے کتنا ہوشیار ہے -
الغرض میں نے اسی طور پر مقامہ ' حرام ' لکھا اور اس کے بعد
اسی مقامہ پر اپنی آئندہ تصنیف کی بنیاد رکھی" (یاقوت : ارشاد)
الحریری کے باقی مقامات کی تصنیف و تاریخ ' اس کے رنج و غم کی داستان
اور اس کی آخری کامیابی کے متعلق ناظرین کو چنری (Chenery)
کی اس تمہید کا مطالعہ کرنا چاہیے جو اس نے الحریری کے پہلے
چھبیس مقالوں کے مشرح ترجمے کے ساتھ ایراد کی ہے (کل مقالوں کی
تعداد پچاس ہے) - چینری کی یہ تالیف یورپ میں عربی کے اعلے قسم
کے تراجم میں شمار ہوتی ہے) -

ابتداء ہی سے حریری کے مقامات کی نسبت رائے یہ ہے
کہ وہ عدیم المثال ہیں - ان کا ایک سوانح نگار لکھتا ہے کہ وہ
انہیں اعجاز سمجھتا ہے اور اس دعوے کی تردید کوئی فرد واحد
نہیں کرسکا - یہ مقامات زیادہ تر اپنی علمی اور ادبی خوبیوں کے
اعتبار سے قابل قدر ہیں - لیکن علم و فضل کے مختلف شعبوں کے

متعلق جو بے شمار حوالے اور زندگی کے ہر قسم کے پہلوؤں پر جو مباحث ان میں درج ہیں، ان کی وجہ سے یہ کتاب فصاحت و بلاغت کا ایک خزانہ بن گئی ہے۔ یہ کمالات، صرف اپنی رسمی تکمیل ہی کی وجہ سے مکمل نہیں، بلکہ زبان پر پورا عبور بھی ظاہر ہے۔ اسلوب بیان کی بیشمار پیچیدگیوں اور ماہرانہ ابہام و ایہام کی وجہ سے اسے نہایت بلند مقام حاصل ہے۔ حریری کے بہتیرے مقلد بعد میں ہوئے جن کی زبان دانی کی قابلیت حریری سے قدرے کم تھی۔ یہ لوگ اپنی تصانیف کو معدوم ہونے سے محفوظ نہ کر سکے۔ لیکن حریری نے اس نکتے کو کبھی فراموش نہیں کیا کہ مقامات کا اولیں مقصد یہ ہے کہ اس سے تفریح اور دلچسپی پیدا ہو۔ اس لیے اس کی ساری کتاب میں بیانات کی بذلہ سنجی، مزاحیہ گفتگو اور اشعار کی جادو بیان، کو بڑی خوش اسلوبی اور لطافت سے قائم رکھا اور زیادہ متین عبارتوں میں بھی یہی اسلوب موجود ہے۔

چینری لکھتا ہے کہ صدیوں تک متواتر اس کے کلام کو بلحاظ فصاحت و بلاغت قرآن سے دوسرے درجہ پر سمجھا جاتا رہا اور اسے عربی زبان کا بہترین گنجینہ مانا جاتا ہے۔ (قرآن کے بعد درجہ تو احادیث قدسیہ اور خطبات نبویہ کا ہے، پھر صحابۂ کرام کا کلام ہے جس کی بلاغت ایجاز اور حکمت کو بعد کا کوئی کلام نہیں پہنچتا۔ قب : الباقلانی : اعجاز القرآن—م)۔ ان کے معاصرین اور بعد کی نسلوں کے ادیب اس کی تعریف و توصیف میں رطب

اللسان ھیں ۔ ان کے مقامات پر متبحر علماء نے اندلس سے لے کر کنار جیحون تک شرحیں لکھی ھیں ۔ ان کی حیرت انگیز فصاحت کا صحیح اندازہ لگانا ' ان کے علم و فضل کی گہرائیوں تک پہنچنا ' ان کے لا تعد و لا تحصی حوالوں کو سمجھنا ' ھمیشہ سے نہ صرف عربی بولنے والی قوموں میں بلکہ جہاں کہیں بھی عربی زبان کا اصولی طور پر مطالعہ کیا جاتا ھے ایک مستقل موضوع تحقیق بنا رھا ھے ۔

اس دور میں جو کتابیں عربی زبان میں مشرق میں لکھی گئیں ان میں سے معدودے ھی چند ایسی ھیں جو ھمارے لیے کسی خاص دلچسپی کا موجب ھوں ۔ شعر و سخن میں آھستہ آھستہ فارسی زبان پیش پیش آ رھی تھی ' اس لیے عربی ادبیات کی تاریخ میں صرف الطغرائی (م لواح ۱۱۲۱ ع) کے ایک لطیف قصیدہ کو کچھ مرتبہ حاصل ھے جو اپنی نمایاں خصوصیات کی وجہ سے تو ایسا قابل قدر نہیں لیکن شنفرا کے مشہور لامیہ قصیدے کی مناسبت کی وجہ سے مشہور ھوگیا ھے' جو اس کے مصنف کی ذکاوت طبع پر دلالت کرتا ھے (ص ۲۱) ۔ علم تاریخ میں بھی خوارزم کے آخری سلطان کے سوانح کے سوا اور کچھ نہیں ملتا جو ان کے کاتب (سیکرٹری) النسوی نے لکھی تھی ۔ صرف دو مصنف ایسے ھیں جو اپنے معاصرین میں ممتاز نظر آتے ھیں ۔ ان میں بھی ایک یونانی الاصل تھا ۔

غالباً ابن حزم کی تصنیف (ص ۸۰) سے متاثر ھو کر

الشہرستانی (۱۰۸۶ تا ۱۱۵۳ع) مشہور عالم دین اور فلسفی نے ' اسی قسم کی ایک کتاب (کتاب الملل و النحل) لکھی - عربی ادبیات میں اس قسم کی کتابیں بہت کم ہیں جن سے قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کے علم و فضل کی شان منعکس ہو - شہرستانی بے حد با مذاق اور برد بار قسم کے ادیب تھے - انہیں فلسفہ کے "الحاد" آمیز نکات سے ایسی دلچسپی تھی جو ان کے معاصرین کی عقل و فہم سے بالا تر تھی - ان کی کتاب میں نہ صرف اسلامی فرقوں اور فلسفی دبستانوں کا ذکر ہے بلکہ اس میں مختلف یہودی اور نصرانی دبستانوں اور یونانی فلسفہ دانوں کا ذکر بھی موجود ہے ' یعنی تھیلز (Thales) سے لیکر آخر تک' اور نصرانی پادریوں اور ہندوستان کے مذہبی فلسفہ دانوں کا بیان بھی شامل ہے - وہ خود بڑے پکے اور کٹر مسلمان تھے - لیکن وہ کٹر ملحدوں کے دبستانوں کا نقطۂ نظر اور دلائل بھی بڑے منصفانہ طریق سے پیش کرتے تھے - البتہ کہیں کہیں مضمون کے آخر میں آ کر ایسی چبھتی ہوئی تنقید کر جاتے ہیں جو کسی مخصوص قابل نفرت اور رونگٹے کھڑے کر دینے والے اصول و عقائد کی تردید کے لیے ضروری ہو -

یاقوت (۱۰۷۹ تا ۱۱۲۹) عرب مولفین میں نہایت کامیاب مؤلف مانے جاتے ہیں - پیدائش کے اعتبار سے وہ اناطولیہ کے ایک یونانی تھے - لڑکپن ہی میں انہیں غلام بنا لیا گیا - مسلمان کی حیثیت سے ان کی تعلیم و تربیت ہوئی اور ان کے مالک نے جو بغداد ک سوداگر تھا انہیں سفری منشی کے طور مقرر کر دیا - اس حیثیت سے

انھوں نے ملک شام، ایران اور خلیج فارس کے علاقوں کی سیاحت کی۔ آزاد ہو جانے پر وہ کتابیں نقل کر کے اپنی بسر اوقات کرنے لگے اور اسی سلسلے میں مرو کے عالیشان کتب خانوں سے متاثر ہو کر وہاں چلے گئے - ۱۲۲۰ ع میں انہیں مغلوں کے حملوں کی وجہ سے راہ فرار اختیار کرنا پڑی - چنانچہ بڑی عسرت اور مفلوک الحالی میں وہ موصل پہنچے - یہاں انھوں نے اپنا کام دوبارہ شروع کیا اور اس کے بعد وہ حلب چلے گئے - ان کی جغرافیہ کی لغت معجم البلدان، عربی زبان میں، نہ صرف جغرافیۂ عرب کی، اپنی نوعیت کے اعتبار سے، نہایت اہم کتاب ہے، بلکہ اس میں ان ولایات اور زیادہ اہم شہروں کے مختصر تاریخی ماخذ بھی درج ہیں اور اس کے ساتھ ہی ان مشاہیر کے سوانح کے متعلق بھی کافی مواد موجود ہے جن کا ان ممالک سے تعلق تھا - اس قسم کی تصنیف میں خواہ وہ کیسی مفید ہی کیوں نہ ہو، کچھ نہ کچھ خشکی ضرور پائی جاتی ہے، لیکن یاقوت نے کہیں کوئی روایت لکھ دی ہے، کہیں کسی نظم کا اقتباس دے دیا ہے، کہیں قدرت کے محاسن بیان کر دئیے اور کہیں ذاتی یا ادبی یادگار کا حوالہ دے دیا ہے اور اس طریق سے انھوں نے نہایت حیرت انگیز طریق سے کتاب کی دلچسپی اور خوبی کو مالا مال کر دیا ہے -

اسی قسم کی ہر جستگی، ان کی کتاب ''ارشاد'' میں بھی پائی جاتی ہے، جو علماء و فضلاء کے سوانح سے متعلق ہے - یہ کتاب حال ہی میں یورپین علماء کی مساعی جمیلہ کے ذریعہ منصۂ شہود پر

دوبارہ آئی ہے ۔ ان کے معاصرین کے نزدیک اس تنصیف کی قدر و قیمت ان کی دوسری تصانیف کے مقابلے میں زیادہ تھی ۔ عربی ادب میں یہ ایک اہم ترین تصنیف ہے اور اس میں البیرونی، حریری اور دوسرے مصنفین کے سوانح کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس میں نہایت دلچسپ واقعات اور اقتباسات بھی شامل ہیں ۔ ابن خلکان (ص ۹۰) یاقوت کے سوانح کے سلسلے میں ایک طویل خط نقل کرتے ہیں (جس کا نفس مضمون یورپین مذاق کے مطابق بے حد پر تکلف ہے) جو انہوں نے اپنے کسی سر پرست یا مربی کو حلب میں لکھا تھا ۔ اس خط میں وہ اپنی زندگی کے اس حصے کا ذکر کرتے ہیں جو انہوں نے خراسان میں گذارا ۔ اس میں مغلوں کے حملے کے بعد کی مصائب اور تکالیف کا بھی ذکر ہے ۔ یہ خط بعد کے زمانے کی فارسی عربی مکتوب نویسی کا بہترین نمونہ ہے ۔

فصل ۔ ۲ ۔ مصر اور ملک شام

گو پہلی صلیبی جنگ کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک شام، مصر کے ملحد حکمرانوں (نام نہاد ــ م) بنو فاطمہ کے قبضے سے نکل کر راسخ الاعتقاد مشرق کے مسلمانوں سے از سر نو ملحق ہو گیا لیکن فرنگیوں سے لا متناہی جنگ و جدال کی وجہ سے علم و ادب کے فروغ کو کافی موقع نہ مل سکا ۔ ان چند کتابوں میں سے جو ان ممالک میں بارھویں صدی میں لکھی گئیں، سب سے زیادہ دلچسپ کتاب اسامہ ابن منقذ (۱۰۹۵ء تا ۱۱۸۸ء) کی اپنی لکھی

ہوئی داستان حیات ہے جو حقیقت میں اس پر آشوب زمانے کا ایک صحیح مرقع ہے۔ یہ کتاب زیادہ دلچسپ اس وجہ سے بھی ہے کہ عربی زبان میں یہ پہلی ترکی ہے جو کسی تفصیل کے ساتھ لکھی گئی۔ مصر کا ملک ''فاطمیوں'' کی حکمرانی سے ۱۱۷۱ء میں آزاد ہو کر سلطان غازی صلاح الدینؒ اور ان کے جانشینوں کے ماتحت ملک شام سے دوبارہ ملحق ہو گیا۔ اس طرح دونوں ملکوں میں نئی خوش حالی کا دور شروع ہوا۔ علم و فضل کے چشمے دوبارہ پھوٹ پڑے اور شعر و سخن اور تاریخ کے میدان میں خاص طور پر بڑی ترقی ہوئی۔

شعر و سخن کی تمام سرگرمیاں از سر نو عود کر آئیں اور ان کے ذریعے مشرق میں بھی صنف موشح کی ترویج ہونے لگی جس کی تکمیل عاں ہی میں ہسپانیہ میں ہو چکی تھی۔ مرشیہ کے مشہور و معروف صوفی شیخ اکبر ابن عربی رح (۱۱۶۵ء تا ۱۲۴۰ء) کی بابت یہ مشہور ہے کہ اپ نے مشرق شعر و سخن میں موشح کا مقام مقرر کر دیا۔ ابن عربی ابتداءً شاعر نہ تھے۔ آپ کی سب سے بڑی ناصحانہ تصوف کی کتاب ''فتوحات مکیہ'' اور دوسری تصانیف نثر ہی میں ہیں لیکن آپ کے منظوم کلام تفسیر کو بیحد مقبولیت حاصل ہوئی اور وسیع پیمانے پر شائع ہوا۔ واردات تصوف کو انسان کے جذباتی اشارات و استعارات کا لباس پہنا کر آپ کا کلام انتہا تک پہنچ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ یورپین مفکرین کو اکثر اوقات ان کا کلام سمجھنے میں بڑی غلط فہمی ہوئی ہے (حالانکہ ہم اس قسم کے

استعارات سے حافظ اور دیگر فارسی زبان کے شعراء کے کلام کی و
سے بخوبی آشنا ہے،) اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ مسل
نقادوں کے نزدیک بھی یہ بات بے حد مشکوک ہے کہ تصو
کی جو تشریح ان مصطلحات کے ذریعے سے کی گئی ہے وہ درست ہے
عمرو ابن الفارض شعر و سخن میں ابن عربی سے بھی گو
سبقت لے گئے - انہیں عربی زبان کا سب سے بڑا صوفی شاعر مانا ج
اور یہی ایک عربی شاعر ایسے ہیں جن کا کلام ایران کے صوفی
کبار کے کلام کا مقابلہ کر سکتا ہے - عمرو ابن الفارض (۱۱۸۱ ع
۱۲۲۵ ع) ابن عربی کے ہمعصر تھے (۱۱۸۱ تا ۱۲۳۵ ع) - ا
شعراء کی طرح یہ شاعر بھی انسانی عشق و محبت کی زبان ہی م
اظہار خیالات کرتا ہے گو اسکے سارے کلام میں -

''اس کا محبوب خدائے پاک ہی ہے جس سے وہ خطاب کر
ہے اور اس کی ذات کو کئی ناموں میں ملبوس کرکے اس کی ح
و ثنا کے ترانے گاتا ہے - کبھی تو اسے عرب کی سریلی مغنیہ
کر خطاب کرتا ہے، کبھی صحراء کا آھو اور کبھی اونٹوں کا حد
خوان کبھی ایسا تیر انداز جو اپنی نگاھوں کے تیروں سے عاشقو
کو گھائل کرتا ہے اور بعض اوقات محض 'وہ' کے اسم اشا
سے ان کے باطنی معانی شاذ ہی ظاہر یا نمایاں ہوتے ہیں گو ا
معانی و مطالب کے اثرات ہر جگہ نمایاں طور پر ایک بلند قسم
وجدانی کیفیت پیدا کیے بغیر نہیں رہتے'' (پروفیسر آر-اے-نکلسن
مقالہ جس کا ذکر تتمہ میں کر دیا گیا ہے) -

صرف یہی نہیں کہ ظاہری بناوٹ میں ابن الفارض رح کا فن پرانی قسم کی عربی شاعری سے مربوط ہے - ان کے جملوں کی برجستگی ابہام، صنائع بدائع اور شوکت الفاظ بالکل متنبی کے طرز کلام کے قریب قریب نظر آتے ہیں - ان کا دیوان ایک چھوٹی سی کتاب ہے جس میں بمشکل تمام بیس غزلیں یا قصیدے ہونگے - اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے قطعات بھی ہیں- ان میں سے سب سے اچھی نظم ان کا ساقی نامہ ہے جس کا کئی بار ترجمہ ہو چکا ہے - ایک لمبی نظم '' المقصد الاسنفس '' سلوک تصوف کے عنوان پر ہے- یہ ایک صوفیانہ اور ناصحانہ نظم ہے جس میں ۷۶۰ اشعار ہیں - اس میں انہوں نے اپنے تجربے سے تصوف کے مقامات لکھے ہیں - یہ نظم یا قصیدہ عربی کی منصوفانہ شاعری کا سرتاج ہے - مفصلۂ ذیل اقتباس جس میں حسن الہیہ کا بیان ہے (اور ان کے چھوٹے قصائد سے ماخوذ ہے) پروفیسر نکلسن کے ترجمے سے نقل کیا جاتا ہے، جس سے اس کے بیان کی خوبی و لطافت کا اندازہ ہو سکتا ہے :

'' گو وہ جا چکا ہے لیکن میرے بدن کا ہر عضو اسے دیکھ رہا ہے- اس کا ہر ناز- ہر ادا اور پیار بھرا انداز ظاہر ہے : بانسری کی لے میں بجتی ہوئی نرسلوں میں اور سبز مرغزاروں کی گہرائیوں میں اس کی نغمہ سرائی ہم آہنگی کے ساتھ ہو رہی ہے اور ان سرسبز وادیوں میں جہاں شام کی ٹھنڈک میں غزالان صحرا چرتے ہیں یا نور کے تڑکے بادل اکٹھے ہو کر مخملیں فرش و زمین پر جہاں شگوفوں اور پھولوں کی گلکاری ہو رہی ہے ، باران رحمت

برساتے ہیں (اس کا جلوہ نمایاں ہے) اور جہاں صبح سویرے نسیم سحر کے گھٹتے ہوئے دامن کے شیریں جھونکے ' مجھے آب حیات کی طرح تازہ زندگی بخشتے ہیں' میں صراحی کے منہ کو بوسے دیتا ہوا ایک خوش گوار ماحول میں شراب معرفت کی چسکیاں لیتا ہوں''۔

چھوٹے درجے کے دنیا دار شاعروں کے کلام میں بھی اس غلامانہ ذہنیت سے کچھ عارضی سی آزادی کی علامات پائی جاتی ہیں' جو گزشتہ دو صدیوں کے اسلوب بیان کی وجہ سے عربی شعر و سخن کے لیے سوہان روح ثابت ہو رہا تھا۔ مصر کے بہاء الدین زہیر(۱۲۵۸ء—م) اس زمانے کے بہترین درباری شاعر تھے۔ ان کا دیوان خوشامد سے پاک ہے اور سلاست زبان اور احساس و جذبات کی گہرائیوں کے لحاظ سے جس میں نازک اور لطیف بلند خیالی بھی موجود ہے ان کے کلام میں کچھ مغربی چاشنی بھی پائی جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام کے مترجم (E.H. Plamer) جس کے ترجمے سے ذیل کے اشعار منقول ہیں) نے اس کا مقابلہ Herrick سے کیا ہے۔

ایک اندھی لڑکی

وہ میرے محبوب کو ایک غریب اندھی لڑکی کہا کرتے ہیں لیکن میں نے کہا کہ اسی لیے تو میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ مجھے اس سے محبت ہے کیونکہ وہ ان سفید بالوں کو نہیں دیکھ

سکتی جن کی وجہ سے میرا حلیہ بگڑ گیا ہے -

" ہمیں اس بات پر تعجب نہ کرنا چاہیے کہ ایک بے نیام ننگی تلوار زخم پیدا کر سکتی ہے بلکہ زیادہ تعجب اور حیرت کی بات یہ ہے کہ تلواریں نیام ہی میں رہ کر قتل و غارت کریں - وہ ایک لہلہاتا ہوا باغ ہے جس میں مجھے وہاں کے پہرہ دار کی عقابی نظروں کا ڈر نہیں - گو وہاں گلاب کا پھول کھلا ہوا ہے لیکن نرگس کی آنکھ بند ہے - "

قدرتی طور پر (سلطان) صلاح الدین رح کی کئی سوانح عمریاں لکھی گئیں - ان میں سب سے پہلی دو کتابیں ان لوگوں نے تصنیف کیں جو ان کے ملازم تھے - امام الدین اصفہانی (۱۱۲۵ ع تا ۱۲۰۱ ع) اپنی صدی کے سب سے بڑے مورخ تھے - اپنی جوان سالی میں انہوں نے شاہان سلجوق کے ماتحت ، عراق میں ملازمت اختیار کی ، اور ادھیڑ عمر میں وہ دمشق چلے آئے - ان کے بعد وہ (سلطان) صلاح الدین رح کے عملے میں ملک شام کے چیف سیکریٹری (دبیر اعلیٰ) مقرر ہوگئے - صلاح الدین رح کی سوانح عمری کے علاوہ ، انہوں نے اپنے پہلے آقاؤں ' یعنی سلجوقیوں کی ' ایک تاریخ لکھی اور اس کے علاوہ اپنے زمانے کی ایک عام تاریخ بھی تصنیف کی (اس تصنیف کا زیادہ حصہ شائع ہو چکا ہے) - یہ ساری کتاب سرکاری خط و کتابت کی طرز پر نہایت ہی مغلق مقفے اور مسجع عبارت میں لکھی ہوئی ہے اور یہ اسلوب بیان بے حد ناقابل برداشت ہو جاتا ہے - اس سے ذرا کم شاندار لیکن تعریف آمیز لہجے

میں صلاح الدین رح کے چیف سکریٹری بہاءالدین الموصلی کے لکھے ہوئے سوانح ہیں -

(سلطان) صلاح الدین رح کی بے نظیر سوانح حیات میں ' لین پول لکھتا ہے کہ صلاح الدین کے عہد کے آخری پانچ سالوں میں بہاءالدین کی شخصیت چشم دید شاھد کی حیثیت سے بے مثل ہے - وہ (حضرت) سلطان کے گہرے دوست اور مشیر تھے اور وھی بتا سکتے ھیں کہ اس زمانے میں کیا کچھ ہوا - ان کے تحریر کردہ سوانح بلا شک و شبہ درست اور سچے ھیں اور ان کے ذاتی تعصبات اور مشرق مبالغہ آمیزی کو آسانی کے ساتھ نظر انداز کیا جا سکتا ہے - اس کے ثبوت میں سب سے بڑی شہادت وہ عہد نامہ ہے جو رچرڈ اول اور صلاح الدین رح کے درمیان ہوا - اس سلسلے میں بہاءالدین کی راست گوئی خاص طور پر بہت بڑی اہمیت رکھتی ہے -

اسے چھوڑ کر ابو شامہ دمشق کے لکھے ہوئے سوانح عمر بھی موجود ھیں - یہ شخص بھی صلاح الدین رح کا ہم زمانہ تھا - لیکن اس کے ماخذ مخالف ذرائع سے حاصل کیے گئے - ابن الاثیر (۱۱۶۰ع تا ۱۲۳۳ع) از روئے پیدائش عربی الاصل تھے - وہ عرب مورخین میں سب سے بڑے مورخ مانے جاتے ھیں - ان کی ابتدائی تصانیف تاریخ الدولة الا تابکیة بالموصل' ۱۲۱۱ع میں ختم ہوئی - اس میں صلاح الدین کے بڑے بڑے مسلمان مخالفین کا ذکر موجود ہے - اس کتاب میں مصنف نے اپنے سابقہ سرپرستوں کے مقابلے میں

صلاح الدین کی کار گزاریوں کی مذمت کی ہے ۔ لکن انہوں نے اپنی
بڑی تصنیف ''الکامل'' میں دونوں میں برابر کا توازن قائم رکھا ہے ۔
الکامل ایک بہت بڑی ضخیم کتاب دس جلدوں میں ہے جس میں مصنف
کے اپنے زمانے تک کی تمام اسلامی تاریخ یکجا کر دی گئی ہے پہلے زمانے
کے مورخین کے اقتباسات بھی موجود ہیں اور اسلام کے ابتدائی دور
کے واقعات تو انہوں نے طبری کی معرکہ آرا تاریخ سے اخذ کرکے
مختصراً بیان کردیئے ہیں (کیونکہ طبری کی تاریخ ' زمانہ ما بعد
کے طلباء کے لیے کچھ زیادہ بوجھل ثابت ہو رہی تھی) ۔ اس تصنیف
میں ابن الاثیر نے اور ماخذ بھی زائد کیے ہیں ۔ اس تصنیف کی
قدر و قیمت کچھ اس وجہ سے زیادہ نہیں کہ اس میں ان کتابوں کے
اقتباسات موجود ہیں جو اب ضائع ہو چکی ہیں بلکہ اس وجہ سے اس
کی قدر کی جاتی ہے کہ انہوں نے اپنے جمع کردہ مواد پر
دوسرے مورخین کی نسبت زیادہ تنقیدی نظر ڈالی ہے ۔ یہ ایک
عجوب بات ہے کہ انیسویں صدی تک ابن الاثیر کے نام سے لوگ
چنداں واقف نہ تھے اور تمام پہلے زمانے کے مستشرقین جن میں
گبن کے حوالے بھی شامل ہیں اس بات پر مجبور تھے ' کہ وہ
اپنی تحقیق و تدقیق کا انصار اس نقلی خلاصے پر ہی رکھیں جو ایک
قبطی المکین (۱۲۲۵ع تا ۱۲۷۳ع) نے تیار کیا تھا یا اس تاریخ پر
رکھیں فاضل اجل سلطان حمات ابوالفداء رح (۱۲۷۳ع تا ۱۳۳۱ع)
نے لکھی ۔

دو اور تصنیفیں بھی ایسی ہیں جن کا ذکر کرنا مناسب ہے ۔

آثار مصر (الأفادۃ والاعتبار فی الأمور المشاھدۃ والحوادث المع
فی ارض مصر) مصنفہ عبداللطیف (۱۱۶۰ع تا ۱۲۳۱ع) - یہ شخ
ماہرلسانیات اور علم طب تھا - اس کا درجہ قاموس یا موسو
نویسوں میں شمار ہوتا ہے - عربی زبان میں طبعزاد تصنیف کے اع
سے اس کتاب کا مقام بلند ہے - اس کتاب میں ملک مصر کی ج
بوٹیوں ، جنگلی جانوروں اور پرانی یادگار عمارتوں کے تذکر
کے علاوہ (جس میں اس کوشش کا بھی صحیح حال درج ہے
اہرام مصری کو گرا دینے کے باب میں کی گئی) اس ہولنا
واقعہ کا بھی ذکر ہے جب ۱۲۰۰/۱ع کے قحط کی وجہ
قاہرہ میں مردم خوری شروع ہوگئی اور اس زمانے کے علم ا
کی دریافت و تحقیق پر بھی کچھ روشنی ڈالی ہے -

اس کتاب سے کہیں زیادہ مشہور و معروف تصنیف
یورپ اور مشرق میں نام پیدا کر چکی ہے "وفیاۃ الاعیان" ہے
ابن خلکان رح نے لکھی (۱۲۱۱ع تا ۱۲۸۲ع) - یہ ملک
میں پیدا ہوئے لیکن وہ اپنے آپ کو باختر کے مشہور برا
خاندان کی اولاد سے بتاتے تھے - وہ ابھی لڑکے ہی تھے کہ ا
نے اپنی تعلیم کی تکمیل حلب میں کی - یہ وہ زمانہ ہے
یاقوت رح نے ابھی وفات پائی تھی - ممکن ہے کہ انھی کی م
کو دیکھ کر انہیں بھی یہ خیال پیدا ہوا ہو کہ وہ اسی طرز
ایک اور کتاب زیادہ وسیع پیمانے پر لکھیں - اپنے آپ کو ا
قسم کے مصنفین کی سوانح نگاری کرنے کی بجائے انہوں نے

منصوبے میں ہر قسم کے مشاہیر شامل کر لیے - صرف پہلی اور دوسری نسل کے مسلمانوں اور خلفاء کو اس فہرست سے مستثنے کیا کیونکہ ان کے سوانح پہلے ہی سے بکثرت موجود تھے [مثال کے طور پر ابن الاثیر نے ساڑھے سات ہزار صحابہؓ کے سوانح لکھے اور اس کتاب کا عجیب و غریب نام (شیران بادیہ) اسد الغابہ تجویز کیا] - اس کتاب کی تالیف میں انتہائی صحت کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے ان لوگوں کے نام بھی حذف کر دئیے ' جن کی تاریخ وفات انہیں معتبر ذرائع سے حاصل نہ ہو سکی - ان کا اسلوب بیان اس قسم کے ادبی تکلفات سے مبرا ہے جن کی وجہ سے بعد کے زمانہ کا ادب بے حد آلودہ ہوکر اپنی ہئیت کذائی کھو بیٹھا ہے - بہت سے اقتباسات ایسی تصانیف سے منقول ہیں جو اب ضائع ہو چکی ہیں - دلچسپ واقعات کی وجہ سے کتاب میں بے حد دلچسپی پیدا ہو گئی ہے اور ایسا متفرق مواد بھی موجود ہے جو برسبیل تذکرہ اس میں شامل کر دیا گیا ہے - اس وجہ سے یہ کتاب نہ صرف بے حد دلچسپ ہو گئی ہے بلکہ اس کے مطالعہ سے قرون وسطے کے مسلمانوں کی طرز زندگی کے متعلق ہماری معلومات میں گراں قدر اضافہ بھی ہوتا ہے - (ڈی سلین کے نہایت ہی عمدہ مشرح ترجمے سے' مسٹر E.V. Lucas نے ایک اقتباس اپنے دلچسپ مقالہ A Boswell of Baghdad میں بھی شامل کیا ہے) - اس کتاب کو جس احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا اس کا اندازہ اسی بات سے ہو سکتا ہے کہ مصنف کی زندگی ہی میں اس کا ترجمہ

فارسی زبان میں ہوگیا اور اس کے بعد کے زمانے میں دوسر
مصنفین نے ضمیموں اور تتموں کے ذریعے اس کی شان کو برقرا
رکھا۔

فصل - ۳ - سسلی

دو صدیوں سے زیادہ عرصے تک یعنی نویں صدی عیسوی
گیارھویں صدی کے اواخر تک سسلی میں عرب سرداروں
پر آشوب حکومت قائم رھی۔ اس طرح یہ ملک بھی اسلامی دنیا م
شمار ھوتا رھا۔ یہاں بھی بڑے بڑے ماھر لسانیات اور شاعر پیا
ھوئے۔ شعراء میں سے جن کے کلام میں ھسپانوی اثرات نمایاں ھ
سب سے زیادہ مشہور شاعر ابن حمدیس تھے (نواح ۱۰۵۵ء
۱۱۳۲ء) - اپنے بہت سے ھموطنوں کی طرح نارمن فتوحات
دوران میں وہ اس جزیرے سے بھاگ کھڑے ھوئے اور انھوں
معتمدرح (ص ۸۷) کے پاس جا کر اشبیلہ میں پناہ لی۔ شعر و سخ
میں زیادہ حصہ انھوں وھیں جا کر لیا۔ وہ مراکش م
معتمدرح کی جلا وطنی کے ایام میں بھی ان کے شریک حال ر
اور جب انھوں نے وفات پائی تو وہ تونیسیہ میں واپس آ گئے۔ انھ
مناظر قدرت سے محبت تھی اس لیے وہ عربی ادب کے Vordsworth
مشہور ھو گئے۔

تاھم یہ ایک حقیقت ھے کہ جب نارمن قوم نے جزیرہ سسل
کو دوبارہ فتح کر لیا تو اس وقت ھی سے سسلی میں عربی ذھن و ذکاو

کو اصلی معنوں میں پینا نصیب ہوا کیونکہ عربی نارمن تہذیب و تمدن اور علم و فن کا اچانک پھیلاؤ اسی زمانے میں ہوا۔ کامل ایک صدی تک سسلی کا ملک ایک اس قسم کی عیسائی حکومت کا منظر پیش کرتا ہے جس میں عربی الاصل لوگوں کی موجودگی نہ صرف برداشت ہی کی گئی بلکہ وہ جلیل القدر عہدوں پر سرفراز رہے۔ عربی زبان بھی عدالتی زبانوں میں ایک زبان شمار ہوتی تھی۔ مسلمان حکمرانوں میں بہت کم ایسے معاصرین تھے جو سسلی کے نارمنوں کے مقابلے میں عربی ادبیات کی زیادہ سرپرستی کرتے ہوں اور بہت تھوڑے ایسے لوگ ہوں گے جنھیں ایسا مربی ملا ہو جیسا کہ شریف ادریسی (۱۰۹۹ تا ----؟) کو راجر ثانی کی صورت میں ملا۔ ہسپانیہ میں تعلیم ختم کر لینے اور مغربی ممالک کی سیر و سیاحت سے فارغ ہونے کے بعد ادریسی کو شاہ راجر نے یہ دعوت دی کہ وہ شاہی جغرافیہ دان کی حیثیت سے پلرومو کے شہر میں آ بسے۔ چنانچہ بادشاہ کی امداد سے جس نے مختلف ممالک کے مشاہدہ کرنے والوں سے اسے تمام معلومات مہیا کرا دیں، اس نے ۱۱۵۴ء میں اپنا مشہور جغرافیائی رسالہ نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق شائع کیا جسے عام طور پر کتاب راجو کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ وہ تصنیف ہے جس کے متعلق صاحب کمال لوگوں کی یہ رائے ہے کہ وہ سٹرابو کی تصنیف کا مقابلہ کرتی ہے گو اس کا مصنف اپنے مشرقی پیرووں مثلاً مقدسی کی نسبت زیادہ ضعیف الاعتقاد ہے۔

۱۱۵۳ء کے کچھ بعد ھی سسلی کا ایک اور جلا وطن ابن ظف
(م ۱۱۶۹ء) تھوڑی سی مدت کے لیے اپنے وطن مالوف میں واپ
آیا اور اس نے اس وقت کے عرب گورنروں میں سے ایک کو اپ
مقالوں کی کتاب بطور نذر پیش کی جس کا نام ہے ''حکام کے لیے تسکین د
کی اکسیر'' ۔ یہ مقالے جن میں استعفوں ' صبر و تحمل اور اس
قسم کے دوسرے موضوعات کی تلقین ہے ' حسب معمول قرآن او
احادیث کے حوالوں ' اشعار اور تاریخی واقعات سے پر ھیں ۔ اس آ
ایک طبعزاد خصوصیت یہ ہے کہ تاریخی روایات ' گو عربی اور ایرا
تاریخ کے واقعات پر مبنی ھیں ، لیکن ان کی تمہید فرضی ناموں (بطا
مقبول عام کتاب کلیلہ و دمنہ کے اصول پر) باندھی ہے ۔ اس
اعتبار سے اسے ایک تاریخی افسانہ ھی سمجھنا چاھیے ۔ ابن ظفر ۔
اور بھی کئی ادبی کتابیں لکھیں ۔ ان میں سے ایک کتاب مشہور و ممت
چھوں پر بھی ہے جو پیرس میں محفوظ ہے ۔

فصل ۔ ٤ ۔ ھسپانیہ

جو کام ترکوں نے مشرق میں کیا تھا وھی کام بربروں ۔
مغرب میں بھی کیا ۔ ایک متعصب اور نا اھل بربر خاندان نے مرابطو
کے دور حکومت میں اندلس پر ۱۰۹۱ء میں قبضہ کر لیا ۔ ی
ملک اس وقت گلستان ادب کا وہ شگفتہ پھول تھا جو ان کی وج
سے کمھلا گیا ۔ پھر بھی ھسپانیہ کی ذھانت و ذکاوت ' شعر و سخ
کے میدان میں پیش پیش رھی ۔ یہی زمانہ تھا جب ترکیب بند آ

طرز کے نئے شعر نمودار ہوئے یعنی "زجل" جو اپنی ساخت کے لحاظ سے تو "موشح" کے مشابہ تھی لیکن ملک کی عام سلیس زبان میں اظہار خیال ہوا کرتا تھا۔ عملی طور پر اس قسم کا ادبی نمائندہ ابن قزمان (م ۱۱۶۰ء) ہے۔ وہ ایک قسم کا غزل گو شاعر تھا جو اپنے مربیوں کی سخاوت پر بسر اوقات کیا کرتا تھا اور ایک دربار سے دوسرے دربار میں گھومتا رہتا تھا۔ مشرق کے اسلامی ممالک میں زجل گوئی کو کوئی خاص فروغ حاصل نہیں ہوا اور وہاں یہ جنس نایاب ہی رہی۔ البتہ مغربی ممالک میں جہاں کے لوگوں نے اسے ایجاد کیا اور انھوں نے اسے پسند بھی کیا، اس لیے اس نے زبانی زبانی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو کر نسل و مذہب کی حدود کو بھی عبور کرتے ہوئے ہمہ گیری اختیار کر لی اور کیٹیلونیہ اور پراونس میں اور غالباً اطالیہ میں بھی اس قسم کی شاعری میں اضافہ ہوا۔ گو وہاں اس طرز کی شاعری کو فروغ تو نہ ہوا لیکن اس کے ذریعے رومانی قسم شاعری کی بنیاد ضرور پڑ گئی۔

بارھویں صدی کے درمیان ایک دوسرے بربر خاندان الموحدین نے ایک عجیب و غریب عالم دین ابن تومرت (م ۱۱۳۰ء) کے زیر علم اپنے پیش روؤں کو پچھاڑ ڈالا۔ اس خاندان نے علم و ادب کی طرف زیادہ بردبارانہ رویہ اختیار کیا اور اس صدی کے باقی نصف حصے میں ہسپانیہ میں ادبی سرگرمیوں کا نیا جوش و خروش پیدا ہو گیا۔

اس نئی تحریک کی نمایاں اور ممتاز شخصیتوں میں بڑے بڑے فلسفی تھے جن کا حلقۂ اثر ھسپانیہ کی حدود سے نکل کر دور دور تک پہنچا اور غالباً اپنے ھم مذھب مسلمانوں کی نسبت یورپ کے دبستان، اس سے زیادہ گہرے طریق پر اثر پذیر ھوئے۔ ھسپانیہ کا پہلا دبستان فلسفہ ابن باجہ رح کا ھے، جو غالباً بربروں سے پہلے زمانے کا ھے۔ گو وہ خود ۱۱۳۸ع میں مراکش میں فوت ھوئے۔ ان کے بعد ابن طفیل رح (م ۱۱۸۵ع) کا دور دورہ ھوا جو حی ابن یقظان (زندہ ولد بیدار) مشہور فلسفی رومان کے مصنف ھیں۔ اس کتاب میں انہوں نے ایک جزیرہ کے تنہا عزلت گزین کے ارتقای قلب کی تفصیل دی ھے کہ کس طرح اس نے اپنی فطری اور غیر فانی طاقتوں کو اعلیٰ درجے کے فلسفی معیار پر جا پہنچا کر معرفت خداوندی حاصل کر لی۔ اس کتاب کا لب و لہجہ بلا شک و شبہ صوفیانہ ھے جیسا کہ عام اسلامی فلسفیوں کا دستور ھے۔ اس کے برعکس ابن رشد (۱۱۲۶ع تا ۱۱۹۸ع) کا مقصد یہ تھا کہ انسانی عقل و فکر کی حمایت بحد امکان بڑی دلیری سے کی جائے۔ انہوں نے تعلیمات ارسطو کو از سر نو زندہ کرکے وہ شہرت پائی کہ قرون وسطی کی کیتھولک فلاسفی پر حملہ کرنے والے لوگوں نے ان کے نام کا نعرہ لگایا۔ البتہ یہ نام بگاڑ کر ابن رشد سے Averroes بنا لیا۔

ان کی پہلی تصنیف بلا شک و شبہ تفسیر ارسطو (تلخیص المقالة الاولی من کتاب الخطابة لارسطاطالیس) تھی لیکن اسلامی دنیا

میں لوگوں کو زیادہ دلچسپی ان کی اس تصنیف سے تھی جو انہوں نے غزالی رح کی مناظرے کی کتاب (ص ۸۰) کی تردید اور جواب میں لکھی تھی۔ اس کتاب کا نام انہوں نے تہافۃ التہافتین رکھا۔ اس کے علاوہ ان کے وہ رسائل بھی دلچسپی کا باعث تھے جو انہوں نے فلسفہ اور مذہب کے باہمی تعلق پر لکھے ۔ تمہیدی دلائل کے بعد کہ قرآن میں اکثر اوقات اس بات کی تاکید آئی ہے کہ انسان قانون فطرت کا مطالعہ کریں اور اس مطالعہ کے لیے عقل و فکر کی ضرورت ہے ، اس لیے یہ لازم آیا کہ عقل و فکر کی تہذیب اعلے درجے کی ہونی چاہیے ۔ ان دلائل کے بعد وہ اس شوخ چشم دعوے پر اتر آتا ہے کہ اگر کسی فکری صداقت اور الہامی صداقت میں تناقض پایا جائے تو الہامی صداقت کی کوئی مجازی تاویل کر لینی چاہیے ، اور یہ فلسفہ دانوں کا کام ہے نہ کہ غیر تعلیم یافتہ اصحاب کا کہ اس کی صحیح تاویل کریں اور غیر معمولی پڑھے ہوئے لوگوں کو اس تاویل کے مطالب سمجھائیں ۔ ان کی مراد علمائے دین سے ہے (معاذ اللہ ! ابن رشد کے فلسفے میں اساسی غلطیاں ہیں جو اسلام کے اصولوں کے سراسر خلاف ہی نہیں بلکہ کفر و الحاد کی جانب مائل کرتی ہیں ۔ الہامی صداقت کا بھلا انسانی غور و فکر سے کیا مقابلہ ! دنیا بھر میں کوئی ایسا فلسفی پیدا نہیں ہوا جو یہ دعوی کر سکے کہ اس کا غور و فکر صداقت اور عین صداقت ہے اور وہ کبھی غلطی نہیں کرسکتا ۔ سچ ہے :
پای استدلالیاں چوبین بود ۔ پائے چوبین سخت بے تمکیں بود ـــ م) ۔

رینن (Renan) جیسا کہ سب کو معلوم ہے اسے خالص استدلال پسند (دلیلی) قرار دیتا تھا لیکن موجودہ زمانے کے مفکر کچھ اور رائے رکھتے ہیں (اصل بات یہ ہے کہ ابن رشد کو اپنی استدلال پسندی پر بے جا ناز و غرور تھا اسلیے اس کا غور و فکر اکثر باطل ہے—م)۔ ھسپانیہ کے تیسرے فلسفی دبستان جو حقیقت میں مسلمانوں کے آخری فلسفی تھے مرسیہ کے ابن سبعین ہیں (م۱۲۶۹ع) جو زیادہ تر فریڈرک ثانی سے اپنی فلسفیانہ خط و کتابت (گو اس کی تصدیق مشکوک ہے) کی وجہ سے زیادہ مشہور ہوئے۔ غالباً وہ صوفی ہونے کی نسبت فلسفی کم تھے اور ان کے معاصر انہیں فلسفیوں کے دستور کے مطابق صوفی ہی کہا کرتے تھے۔

صرف ایک تصنیف اور ہے جو الموحدین کے عہد میں کی گئی اور اور جس کا ذکر کرنا یہاں باقی ہے۔ شاعر اور محدث بن جبیر سکنہ بلنسیہ (۱۱۴۵ع تا ۱۲۱۷ع) نے اپنے پہلے حج کے موقع پر ایک روزنامچہ ''رحلة'' کے نام سے لکھنا شروع کیا۔ اسے انہوں نے غرناطہ پہنچنے کے بعد شائع بھی کر دیا تاکہ اس کے ذریعہ حاجیوں کی رہنمائی ہو سکے۔ اس کتاب کے نفس مضمون کی دلچسپی کے علاوہ اس میں مصر، حجاز اور ملک شام کے شہروں کے حالات بھی درج ہیں اور اس وجہ سے اسے ایک اعتبار سے کسی حد تک مستند کتاب سمجھا جانے لگا، نہ صرف مغرب میں، جہاں بعد کے سیاحوں نے اس کتاب کا حوالہ دئیے بغیر اسے استعمال کیا ہے، بلکہ مشرق میں بھی، اس کتاب کی شہرت ہوئی کیونکہ اس کے اقتباسات

ابن جبیر کے اپنے شاگرد الشریش نے مقامات حریری کی شرح میں شامل کیے ہیں۔ گو ہمارے لئے سب سے زیادہ قابل قدر وہ حصہ ہے جس میں مناسک حج کی تفصیل ہے لیکن یہ حصہ حوالے کے قابل نہیں۔ مفصلہ ذیل تذکرہ سمندر کے ایک طوفان کے متعلق ہے جس سے ان کا خاص اسلوب بیان ظاہر ہوتا ہے:

"منگل کی رات کو ایک ہوا چلنے لگی جس کی وجہ سے سمندر میں تلاطم پیدا ہوگیا۔ پھر بارش آگئی۔ ہوا کے زور نے پانی کی بوندیں تیروں کی طرح گرنے لگیں۔ ہماری حالت قابل رحم تھی اور ہمیں بے حد اندیشہ تھا کیونکہ ہر جانب سے لہریں ہم پر ایسے گر رہی تھیں جیسے پہاڑ۔ ہم تمام رات مایوسی کا شکار بنے رہے۔ ہمیں یہ امید تھی کہ صبح ہونے پر ہماری مصیبت میں کچھ کمی ہو جائے گی، لیکن دن دیا آیا، پہلے سے بھی زیادہ شدید قسم کا طوفان اپنے ہمراہ لایا۔ ایسا خوفناک اور ہولناک کہ الامان والحفیظ! سمندر کا زور و شور اور بھی بڑھ گیا۔ آسمان پر غبار آلو سیاہی چھا گئی۔ پانی کا زور اور ہوا کا شور ایسا سخت تھا کہ بادبان بھی اپنی جگہ پر قائم نہ رہ سکا۔ اس لیے چھوٹے بادبان چڑھائے گئے لیکن ہوا نے ایک بادبان کو پھاڑ ڈالا اور اسکے چیتھڑے کئے اور وہ مستول بھی ٹوٹ گیا جس پر یہ بادبان لگا ہوا تھا سب دلوں پر مایوسی چھا گئی۔ سارے مسلمان خدائے پاک کے حضور میں دست بدعا کھڑے تھے۔ غرضیکہ دن بھر یہی سلسلہ جاری رہا اور جب رات ہوئی تو طوفان بھی کچھ کم ہوا۔ د

نے اپنا سفر جاری رکھا اور ننگے مستولوں کے نیچے ہی پڑے رہے۔ رات تو امید اور مایوسی کی حالتوں میں خدا خدا کرکے گزری لیکن صبح ہوتے ہی خدا نے اپنا فضل و کرم کیا۔ بادل پھٹ گئے ' ہوا صاف ہوگئی ' سورج چمکنے لگا اور مایوسی رخصت ہوئی۔ الحمدللہ کہ اس نے اپنے جلال و جبروت کی شان ہمیں دکھائی ''۔

۷۔ عہد سلاطین مملوک (۱۲۵۸ء تا ۱۸۰۰ء)

مغلوں نے اپنے متواتر حملوں کے ذریعے مغربی ایشیاء میں بھی اپنا راستہ صاف کرلیا ' جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بغداد تاخت و تاراج ہوا۔ ۱۲۵۸ء میں خلافت بغداد کی خود مختاری کا بھی خاتمہ ہوگیا اور اس طرح اس صورت حالات کی تکمیل ہو گئی جو عرصۂ دراز سے پرورش پا رہی تھی۔ اب مصر نے فاتحانہ انداز سے ان دوگونہ مشکلات سے خلاصی پاکر سر نکالا جو ایک طرف تو مغلوں اور دوسری جانب صلیبی سورماؤں سے نبردآزما تھا۔ اب یہی ملک اسلامی تہذیب و تمدن کا (بشمول ریاست ملک شام) علمبردار تھا اور مشرق میں عربی ادبیات کا صحیح وارث۔ پرانی تہذیب کی راکھ سے ملک ایران میں ایک نہایت شاندار ادب پیدا ہوا لیکن زبان اور جذبات کے اعتبار سے وہ کلیۃً ایرانی ہی نہ تھا۔ عہد مغول میں عربی ادب میں کوئی خاص تصنیف شائع نہ ہوئی ' البتہ ابتدائی تاریخ کی ایک کتاب جو الفخری کے نام سے مشہور ہے ضرور لکھی گئی اور اس کے علاوہ چند معمولی سے شاعر بھی پیدا ہوئے۔

علم دین اور سائنس کی کتابیں برابر لکھی جاتی رهیں جو زیادہ تر عربی زبان هی میں هوتی تهیں لیکن ان فروعی موضوعات کو ایک عرصے سے ادبیات سے خارج سمجھا جانے لگا تھا۔ عربی ادبیات کے مطالعے کے زوال پذیر هو جانے کا قصہ ابن بطوطہ سیاح نے بڑی صراحت کے ساتھ لکھا ہے۔ ۱۳۲۸ء میں انھوں نے بصرے کی سیاحت کی۔ وہ لکھتے هیں :

"میں ایک دفعہ جمعہ کی نماز کے لیے مسجد میں حاضر هوا اور جب خطیب نے خطبہ دینا شروع کیا تو انھوں نے اپنے خطبے میں صرف و نحو کی کئی غلطیاں کیں۔ مجھے اس پر بڑا تعجب هوا اور میں نے اس بات کا ذکر قاضی سے کیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ اس شہر میں ایک شخص بھی ایسا موجود نہیں ھے جو صحیح طور پر عربی صرف و نحو سے واقف ہو۔ "فاعتبروا یا اولی الابصار" (بلند شان ھے اس خدائے قدوس کی جو سب چیزوں کو بدل دیتا ھے اور انسانی امور کو زیر و زبر کر دیتا ھے)۔ یہ وهی بصرہ ھے جس کے افراد صرف و نحو کے ماهر هونے کی وجہ سے معراج ترقی پر پہنچ چکے تھے۔ یہیں سے صرف و نحو کا علم نکلا، یہاں هی اس کی نشو و نما هوئی اور یہ هی اس علم کے موجد سیبویہ کا وطن تھا جن کے کمالات علمی کا لوها دنیا مانتی ھے اور آج یہ وهی شہر ھے جس میں ایک واعظ بھی ایسا نہیں ملتا جو اس زبان میں قواعد نحو کو توڑے بغیر خطبہ بھی دے سکے"۔

اس باب کے پورے دور میں سر کیشیہ (چرکستان) کی ایک فوجی

جماعت جنہیں مملوک (سفید غلام) کہتے ہیں مصر پر حکمراں
تھی۔ اس ساڑھے پانچ صدیوں کے دور کو دو برابر حصوں میں تقسیم
کیا جا سکتا ہے۔ ۱۵۱۷ع تک تو مملوک مصر کے خود مختار
حکمران تھے۔ گو اس زمانے میں متواتر بغاوتیں ہوتی رہیں، لیکن
ہندوستان کی تجارت کی وجہ سے اسے بہت خوشحالی حاصل رہی
عثمانی فتوحات کے بعد البتہ عام زوال و انحطاط کا دور ضرور شروع
ہوگیا۔ عام دستور کے مطابق سیاسی حالات اس زمانے کے ادب
میں منعکس ہوتے ہیں۔ ادبی تصانیف کی تعداد برابر زیادتی پر رہی
لیکن ادب کے طبع زاد محاسن، زور بیان اور قوت متخیلہ نمایاں تھی
اور چونکہ یہ کمزوری پہلے ہی سے موجود تھی، اس لیے سولھویں
صدی عیسوی کے آخر تک اس قسم کا ادب بالکل ہی ختم ہوگیا۔

فصل ۱۔ مصر اور شام ۱۵۱۷ع تک

صرف ایک مملوک شاعر کو کچھ دوامی قسم کی شہرت
نصیب ہوئی ہے۔ امام البوصیری رح (۱۲۱۲ تا نواح ۱۲۹۶ع) بربر
نسل سے تھے۔ ان کے حالات زندگی تاریکی میں ہیں۔ ان کا نام ان کے
مدحیہ قصیدے کی وجہ سے زندہ ہے جو انہوں نے حضرت اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم کی شان میں لکھا۔ یہ قصیدہ آپ کے لبادے (بردہ) کے نام
سے مشہور ہے جو حالت رویاء میں آپ نے ان پر ڈال دیا تھا
جس کی برکت سے آپ فالج کے مرض سے شفایاب ہوئے اور یہ ایک
اعجاز نما علاج تھا۔ اس قصیدے کو بڑی عزت و احترام کی نظر سے

دیکھا گیا اور اس کلام کی اعجاز نمائی کی وجہ سے اس کی اور بھی قدر و منزلت ہونے لگی۔ یہ احترام اب تک قائم ہے، گو اسے اس قسم کی امتیازی خصوصیت کا کوئی خاص حق حاصل نہیں (کیوں؟—م)۔ یہ نظم اپنی ترکیب کے لحاظ سے ایک قصیدہ ہے جو باقاعدہ نسیب سے شروع ہوتا ہے اور چند مختصر پند آموز اشعار کے بعد نفس مضمون کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اس کی لطافت بیان اور متصوفانہ خیالات کی آزادی سے قطع نظر کرتے ہوئے جن کے ذریعہ اس قصیدے کے اشعار میں ایک خوشگوار سادگی پیدا ہو جاتی ہے، اس سے خاص دلچسپی اس لیے ہے، کہ اس میں نہایت مختصر طریق پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ و سلم کے متعلق قرون وسطی کی روایات آگئی ہیں۔

اس زمانے کے جغرافیائی ادب کو جو نہایت وسیع پیمانے پر موجود ہے ہمیں ان جغرافیہ دانوں سے قطع نظر کر لینی چاہیے جنھوں نے گھر میں بیٹھ کر ضخیم کتابیں مختلف تحریری اور زبانی ماخذ کو جمع کرکے مرتب کیں۔ اس قسم کے مصنفین سے زیادہ قریب وہ لوگ ہیں جو احوال عالم لکھا کرتے تھے، مثلاً دمشقی (م ۱۳۲۷ء) کے جو عجائبات کا مشتاق ہے اور اصل حقیقت کو خبط کر دیتا ہے یا ایسے مصنف جو خالص سائنٹفک جغرافیائی مواد اور اعداد و شمار وغیرہ کے مصنف تھے مثلاً مشہور و معروف مصنف ابوالفداء (ص ۹۰) کا جغرافیہ۔ اس قسم کی تصانیف سے بالکل جداگانہ وہ کتابیں ہیں جو جہازرانی کے فن سے متعلق ہیں اور جو

ان جہازرانوں اور جہاز کے راہناؤں کے لیے لکھی گئیں جو بحر ہند میں جہازرانی کیا کرتے تھے ۔ ان کتابوں کا مقصد یہ تھا کہ ان کے نفس مضمون کو آسانی کے ساتھ حفظ کر لیا جائے۔ اسلیے انہیں عام طور پر منظوم ہی لکھا جاتا تھا ۔ اس قسم کی نظموں کا ایک مجموعہ یا بیاض ابن ماجد نجدی نے ۱۴۸۹ع میں مرتب کیا تھا جو ایک مشہور جہاز ران کا بیٹا تھا اور خود بھی اچھا خاصا مشہور جہازران تھا (کہتے ہیں کہ یہی وہ شخص ہے جو واسکوڈی گاما کو افریقہ سے ہندوستان کے ساحل پر لایا تھا) ۔ یہ کتابیں حال ہی کے زمانے میں پہلی مرتبہ دریافت ہوئی ہیں اور ان کے ساتھ چند ایک اور چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی ہیں جو بعد کے زمانے میں لکھی گئیں اور ان میں عرض البلد کے متعلق خاص طور پر مشاہدات کی بنا پر ضروری ہدایات درج ہیں ۔ اسی طرح ایک اور مخصوص موضوع کی کتاب بھی ہے جس میں ملک مصر کے تفصیلی جغرافیائی حالات اور مختلف مقامات کے صحیح محل وقوع کا بیان ہے جو ایک اور کتاب ''کتاب القیامۃ'' کے مواد کے بموجب لکھی گئی ہے ' جو ۱۳۱۵ع میں تصنیف ہوئی تھی ۔ عام استعمال کے لیے ان کتابوں کے خلاصے بھی اکثر اوقات تیار ہوتے رہے جو القلقشندی کے تصنیف کردہ اس دستور العمل کے مطابق ہیں جو انہوں نے کاتبان حکومت کے فائدے کے لیے لکھا ہے - (دروس الاولیۃ فی مسک الدفاتر) - ایک جامع ادبی تمہید اور مبسوط مقالے کے بعد جس میں فن تحریر کی اصطلاحات پر سیر حاصل بحث ہے مثلاً قواعد

فرمان نویسی بین السطور فاصلہ حواشی وغیر ذالک۔

مصنف نے اس میں مصر، شام اور دوسرے اسلامی اور غیر اسلامی ملکوں کے جغرافیہ پر بھی ابواب شامل کر دئیے ہیں۔ مصر کے سیاسی اور ملکی نظام کا حال درج ہے۔ ہرکاروں کے کبوتروں کی ڈاک کے اسٹیشنوں اور راستوں کا ذکر ہے مختلف ممالک میں جو جنتریاں مختلف اقوام استعمال کرتی ہیں، سرکاری خط و کتابت کے نمونے جو غیر ممالک کے حکمرانوں سے ہوا کرتی تھی، اور اس کے علاوہ مراسلوں اور دستاویزوں کی طرز، محافظ خانے میں امثلہ کی ترتیب، مضامین کی تلخیص، اور اسی قسم کے بیسیوں موضوعات پر بحث ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ چودھویں صدی کی اسلامی دنیا کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے اور ان معلومات کے لیے ہم اسی تصنیف کے مرہون ہیں۔

عربی ادبیات کے کئی ادوار کی طرح، بازنطینی عہد میں بھی ادبیات کے ہر مرکز میں مورخین بڑی کثرت سے پیدا ہوئے۔ مورخین کی کثیر تعداد میں سے ہم صرف دو مورخوں کا خاص طور پر ذکر کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ تاریخی تصانیف کے اعتبار سے المقریزی (۱۳۶۶ تا ۱۴۴۲ع) کا پایہ بہت بلند ہے۔ وہ دوسرے مصنفین کی نسبت کچھ زیادہ نقاد اور انوکھے واقع ہوئے ہیں اور اس جوہر میں تو وہ اپنی مثال نہیں رکھتے کہ انہوں نے ماضی کے مصنفین سے بہت کچھ ''سرقہ'' بھی کیا اور ان کے نام تک کا حوالہ نہیں دیا لیکن وہ اس بات میں ان سے

خاص طور پر ممتاز بھی ھیں کہ حقائق کے بے انداز مواد کی ترتیب و تدوین میں انہوں نے پوری احتیاط سے کام لیتے ہوئے بیحا محنت کی ھے اور اپنے کام میں پوری دلچسپی کا اظہار کیا ھے غالباً ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ حوالہ کی ان تمام کتابوں ؟ جن کا مصر سے تعلق ھے پوارا دور ختم کر دیں اور اس کا کی تکمیل میں انہوں نے اپنی زندگی کے آخری بیس سال صرف کر دئیے - ھمارے پاس ان کے ھاتھ کا لکھا ھوا ایک نہایت مکمل اور مفصل جغرافیائی تذکرۂ مصر الخطط کے نام سے موجود ھے جس میں مصر کے قدیم عجائبات کا ذکر ھے - عہد "فاطمی" کی تاریخ کا ایک حصہ اعتبار کے نام سے شامل ھے - اس حصے کے آخری حصے کی تلفی خاص طور پر قابل افسوس ھے - اسی طرح ایوبی خاندان اور مملوک خاندان کی غیر مطبوعہ تاریخ سلوک کے نام سے بھی موجود ھے جس میں ١٤٤٠ع تک کے واقعات درج ھیں - چند جلدیں اس اصلی مگر نامکمل قلمی نسخے کی بھی موجود ھیں ، جو مشاھیر مصر کے سوانح پر مشتمل ھے - اس کتاب کی ترتیب ایسے وسیع پیمانے پر کی گئی ھے کہ ھمیں تعجب ھوتا ھے کیونکہ کوئی فرد واحد اس کے لیے ضروری مواد جمع کرنے کی ھمت نہیں کر سکتا - اسی طرح تاریخی موضوعات پر متعدد رسائل بھی ان کی تصنیف سے ھیں -

ھمارے دوسرے مورخ کی تصنیف " سوانح " کو یورپ میں مدت تک بڑی شہرت حاصل رھی - ابن عرب شاہ (١٣٩٢ع تا

۱۳۰۰ء) دمشق میں پیدا ہوئے تھے اور بچپن ہی کے زمانے امیر تیمور انہیں سمرقند میں لے گئے تھے ۔ بعد میں ان کا پتہ تب چلتا ہے جب وہ ادرنہ میں عثمانی سلطان کے کاتب (سیکریٹری) مقرر ہوئے اور آخر میں ادبی خدمات کے سلسلے میں دمشق اور قاہرہ میں مصروف رہے ۔ انہوں نے امیر تیمور کے سوانح حیات "عجائبات المقدور فی اخبار تیمور" کے نام سے مقفے اور انتہائی مسجع طرز میں لکھے ' جسے شاعروں کے کلام سے آراستہ و پیراستہ کیا ' اور اس میں فن بلاغت کے حسین پھولوں کی گلکاری کی ۔ اس کتاب کو اس دور کے ایرانی مصنفین بیحد پسند کرتے تھے لیکن تیمور کے دوسرے خوشامدی سوانح نگاروں کے برخلاف ہمیں اس تصنیف میں مصنف کی جانب سے اپنے ممدوح کے خلاف سخت مخالفت کا اظہار نمایاں طور پر نظر آتا ہے ۔ ان کی کسی دوسری تصنیف کو اتنی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی ' لیکن ان میں سے بہترین تصنیف فاکہة الخلفاء و مفاکہة الظرفاء ہے ' یعنی قدیم شمال مغربی ایران کی داستانوں کے ایک مجموعے پر اسی طرز اور اسلوب بیان کے مطابق نظر ثانی کی ہے ۔

اس صدی کے آخری نصف حصے میں ' یعنی عثمانی فتوحات سے کچھ پہلے اپنے زمانے کے سب ' بڑے ادیب امام جلال الدین سیوطی (۱۴۴۵ء تا ۱۵۰۵ء) تھے ۔ عربی ادبیات میں جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ایسے مصنفین کی کوئی کمی نہیں جن کی تصانیف سینکڑوں کی تعداد میں نہ ہوں ۔ لیکن اس کے باوجود

سیوطی کی تصانیف کی فہرست تو محض حیرت انگیز ہے۔ ہمارے پاس ان کی ۵۶۱ تصانیف کی فہرست موجود ہے اور ان میں سے کم از کم ۳۱۶ اب تک موجود بھی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں سے بعض تو چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں لیکن ضخیم کتابوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں۔ اس زمانے کے ادب اور سائینس کے ہر مضمون پر ان کی کتابیں موجود ہیں۔ بعض میں تو صرف حوالوں کا مجموعہ ہے۔ بعض دینی معلومات اور دلچسپی کے موضوعات اور جزئیات پر مبسوط رسالے ہیں اور بعض طبعزاد تصانیف ہیں جس میں مواد علمی کو زیادہ سود مند صورت میں پیش کیا ہے۔ ان میں سے سب سے زیادہ اہم یہ کتابیں ہیں : (۱) اتقان یعنی علوم قران کی تفصیل' جس سے صفحہ ۸۶ پر ہم نے کچھہ' اقتباس کیا ہے۔ (۲) مفحمات الاقران فی مبہمات القران اور (۳) تاریخ الخلفاء۔ سیوطی کی تصانیف شہرت اور اپنی طبعزاد' اسلوب' سلاست اور جامعیت کے لحاظ سے اسلامی دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گئی اور تقریباً چار صدیوں سے مسلمانوں کی ادبی اور علمی روایات کی ترجمان اور لب لباب سمجھی جاتی ہیں۔

اکثر اوقات ایسا ہوا ہے کہ علم و فضل کے انحطاط کے بعد لوگوں کی لطافت زبان و ادب کو پہنچنے کا موقع ملتا ہے۔ مشرق اور مغرب دونوں میں مقبول عام شعرو سخن اور عام پسند داستانوں پر زیادہ توجہ دی جانے لگی۔ اب تو یہ حال ہو

گیا کہ عام فہم زبان میں جو شعر کہے جاتے تھے وہ ایسے حلقوں میں بھی سنے سنائے جانے لگے جن میں اب تک ان کا کوئی رواج نہ تھا ۔ لیکن روایات کی ہمہ گیری اور علم و فضل پر معدودے چند اصحاب کا قبضہ ہونے کی وجہ سے اس قسم کی مساعی کا گلا گھٹ کر رہ گیا اور یہ حوصلہ شکنی ایسی مؤثر ثابت ہوئی کہ کسی عربی بولی کو کبھی یہ کامیابی نصیب نہ ہوئی کہ وہ عربی ادب کی ترجمانی کا دعوے کر سکے ۔ اس کے برعکس عام پسند ادب کو اس حاسدانہ ماحول میں کوئی نہ کوئی جگہ مل ہی گئی اور اس قسم کی کتابوں کو برے بھلے طریق سے ادبی معیار کے مطابق کر لیا گیا ۔ چنانچہ اس قسم کا ادب معرض وجود میں آ گیا جس میں مسلسل داستانوں اور افسانوں کا سلسلہ شروع ہوگیا جو اپنی جگہ مفید ثابت ہوئیں اور ایک کتاب الف لیلة و لیلة کو تو بین الاقوامی ادب میں ایک مستقل مقام حاصل ہوگیا اور اکثر اوقات یہ احتمال پیدا ہو جاتا ہے کہ اسلام کے وسیع ترین ادبیات میں سے یہی ایک تصنیف ایسی ہے ' جس سے اہل یورپ کے کان بخوبی آشنا ہیں ۔ الف لیلة و لیلة کی ترتیب و تصنیف کی ابتدائی تاریخ ابھی تک موہوم ہے ۔ شہر زاد اور دینا زاد کے قصے کا پتہ ہندوستان میں جا نکلتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اسی کہانی کی بنیاد پر اس داستان کا ڈھانچہ تیار کیا گیا ہے (مثلاً ایک سو ایک رات) اور یہ امر واقعی ہے کہ گو الف لیلة و لیلة کی

ابتداء ایک قدیم زمانے کی فارسی مجموعے کے ترجمے سے شروع ہوئی ' اس میں تدریجی طور پر پہلی کہانیوں کی جگہ دوسری کہانیاں شامل ہوتی رہیں - حقیقت یہ ہے کہ زمانہ حال تک کوئی مقررہ اور واضح مجموعہ ' ان داستانوں کا ایسا تسلیم نہیں ہوسکا جس کو صحیح معنوں میں الف لیلۃ و لیلۃ کے نام سے تعبیر کیا جا سکے - مختلف داستان نویسوں نے یہ کہانیاں مختلف قسم کے مواد کو جمع کرکے لکھیں اور ان میں بالکل مختلف ممالک کے عام قصے کہانیاں کو بھی شامل کر لیا گیا - ادبی صحت کے لحاظ سے مخطوطات کی عام زبان میں بھی ایک دوسرے سے بڑا اختلاف پایا جاتا ہے - سب سے پہلا یورپین ترجمہ جو گیلینڈ (Galland) نے کیا ہے ایک اور پرانے ترجمے کا ترجمہ ہے ' جو آج کل کے مروجہ ترجمے سے جسے عام طور پر قبول کر لیا گیا ہے ' مختلف ہے - اس میں دو نہایت مشہور کہانیاں یعنی علی بابا اور علاء الدین (چراغ) موجود نہیں ہیں - البتہ یہ بات ضرور ہے کہ تمام کہانیوں کو ' خواہ ان کو ماخذ کچھ ہی ہو' اسلامی سانچے میں بعینہ اس طرح ڈھال دیا گیا ہے جس طرح ہمارے ہاں مقامی کہانیاں ہیں ' جو Caviene Tales کے نام سے مشہور ہیں - یہ تمام کہانیاں ایسی ہیں جن میں عربی اطوار و خصائل اور تصورات کا صحیح موقع بڑی وفاداری سے ' بلا کم و کاست اور غالباً بلا ارادہ پیش کر دیا گیا ہے - (مصنف کا یہ قول درست نہیں - الف لیلہ و لیلہ میں اسلامی اور قدیم عربی

زندگی سے مشابہت نہیں پائی جاتی—م) -

مقبولیت کے اعتبار سے، عرب ممالک میں عجیب و غریب افسانوں کو گونہ سبقت حاصل ہوگئی۔ یہ افسانے کبھی خالص نثر میں اور اکثر اوقات نظم و نثر میں تاریخی یا روایتی اشخاص یا واقعات کے متعلق لکھے جاتے تھے اور یہ کہانیاں انھی کی بابت کسی طرح مشہور ہوگئیں۔ ان میں سے بہترین داستان عنترہ کی ہے جو صحرائے عرب کا ایک غلام زادہ اور مشہور و معروف شاعر تھا۔ اس کو عام مقبولیت کے اعتبار سے برابری کا مرتبہ حاصل تھا - اس نے صلیبی جنگوں کی داستان لکھی ہے جو مملوک سلطان بیبرس کے شجاعانہ کارناموں پر مرکوز ہے۔ ایک یورپین ناظر کے لیے (یا سامع کے لیے کیونکہ یہ قصے عام طور پر بڑی تیزی کے ساتھ قہوہ خانوں میں سنائے جاتے ہیں) اس قسم کی ایک جیسی اور متواتر داستان گوئی کچھ بوجھل معلوم ہوتی ہے لیکن ان کا جو اثر عربوں پر ہوتا ہے اس سے انکار نہیں ہوسکتا -

ایک اور مقبول عوام تفریح "تمثیلی کھیل (Shadowgraph Plays) ہوا کرتے تھے- لیکن ان کا رواج تیرھویں صدی ہی میں کچھ تھوڑے سے عرصے کے لیے ادبی تعلقات کے قیام و دوام کے سلسلے میں ہوا - اگر حالات سازگار ہوتے تو اس موقع سے جو عربی ادب کو ملا تھا کچھ ڈرامائی قسم کے ادب کی ترقی بھی ہو جاتی، لیکن یہ کھیل کچھ ابتدائی حالت ہی میں رہے اور اس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا گیا اور صنف تمثیل بانجھ ہی رہی -

صل۔ ۲۔ ہسپانیہ اور شمال مغربی افریقہ

ہویں صدی میں الموحدین کے زوال اور عیسائیوں کے
جبل الطارق اور غرناطے کے درمیان کے ایک چھوٹے سے
، علاوہ باقی اندلس کے دوبارہ فتح ہو جانے کے واقعات
، عربی ادبیات کے لیے بے حد نتیجہ خیز ثابت ہوئے۔
، علاقے کے اس تھوڑے سے باقی ماندہ حصے میں موروں کی
کوئی تین صدیوں تک برقرار رہی اور یہاں کی شان و شوکت
غرناطے کا عالیشان محل بیان کر رہا ہے۔ یہ سچ ہے کہ
نے کے ادب کی چند یادگاریں ہی باقی رہ گئی ہیں۔ اس کی
ہ تو یہ تھی کی فرڈیننڈ اور ملکہ ازبیلہ کی دوبارہ فتوحات
نے میں تمام اسلامی تصانیف کو وحشیانہ طریق سے تلف کر
تھا لیکن ان تمام مصنفین میں سے کم از کم ایک مصنف
یسا ہے جو علم ادب میں مہارت تامہ رکھنے کی وجہ سے
رفراز ہے۔ ابن الخطیب (۱۳۱۳ء تا ۱۳۷۴ء) اپنی طوفان خیز
سرگرمیوں کے زمانے میں بھی اتنا وقت ضرور نکال سکا
مختلف قسم کی ادبی کاوشوں میں بھی کافی حصہ لے سکے۔ ان کی
میں سے ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے جو مختلف نظموں کا بیاض
میں خطوط اور دستاویزات بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ
اریخی تصانیف کے بے شمار اجزاء رسائل اور مقالے بھی ہیں۔
غرناطے کے متعلق ہیں وہ سب کے سب ہماری دلچسپی کا
یں۔ ان کی تمام تر تصانیف مقفیٰ اور مسجع نثر میں لکھی

ہوئی ہیں اور انہیں بلحاظ اسلوب و لطافت ایسا مرتبہ حاصل ہوا ہے جو معدودے چند مصنفین کے سوا اور کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اندلسی مصنفین میں سے یہی آخری شخص ہے جس نے موشح نظم لکھی جس کا نام و نشان بھی چودھویں صدی کے آخر تک بالکل مٹ چکا تھا۔

اس سے بالکل مختلف قسم کی تصانیف حلیۃ الفرسان و شعار الشجعان (اصل کتاب تحفۃ الانفس و شعار سکان الاندلس کا ایک حصہ ہے) جو سلطان کی فرمائش کے بموجب غرناطے کے رہنے والے ابن هذیل (؟) نے ۱۴۰۰ء کے قریب لکھی تھی تا کہ اس کے ذریعے وہ اس صوبے کے لوگوں کو عیسائیوں کے خلاف جہاد کرنے پر آمادہ کر سکے۔ حسب نوع عربی ادبیات میں گھوڑے نے بڑا کام کیا ہے اور ابن هذیل کی تصنیف ان کتابوں پر مبنی ہے جو اب ضائع ہوچکی ہیں۔ اس میں گھوڑے کے تناسب اعضاء، صفات، برائیوں اور اس کی مختلف چالوں اور سواری کی حالت میں ہتھیاروں کے استعمال وغیرہ کے متعلق پوری تفاصیل درج ہیں۔

تاہم کفار کے پیہم دباؤ کی وجہ سے ہسپانیہ کے خاندان بالمقابل ساحل کے کناروں پر آہستہ آہستہ ہجرت کر کے آباد ہو گئے اور اس لیے ہسپانوی اسلامی تہذیب کے مخلوط آثار وہاں پائے جانے لگے۔ سیاسی مصائب و حوادث اور اندرونی نظام کی عام بے ترتیبی کے باوجود فاس میں تلمسان کے شہر اور دوسرے ساحلی شہروں میں پرانے طور طریقے اور اندلس کے پرانے شریف خاندانوں کا ذوق و

شوق علمی برابر قائم رہا۔ پہلے تو تونس نے تیرھویں صدی میں اور اس کے بعد فیز (فاس) نے چودھویں صدی میں اسلامی تہذیب و تمدن کی علم برداری کی وجہ سے شہرت حاصل کی جو مشرق کے بڑے سے بڑے شہروں کے مقابلے میں بھی کچھ کم حیثیت کی نہ تھی۔

اب ہم اس دور کے شعراء اور مشہور و معروف علمائے دین، فقہاء اور ماہرین لسانیات سے قطع نظر کرتے ہوئے چودھویں صدی عیسوی کے دو ممتاز ترین ادیبوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ۱۳۲۵ع میں محمد ابن بطوطہ (۱۳۰۴ع تا ۱۳۷۷ع) اپنے وطن مالوف طنجہ سے حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوا۔ یہ ایک نوجوان آدمی تھا جو اپنی نیکی اور فضلیت علم کی وجہ سے مشہور تھا۔ اپنی اس سیروسیاحت کے واقعات سے متاثر ہو کر اب اسے یہ شوق پیدا ہوا کہ وہ ہر اسلامی ملک کی سیاحت کرے اور اگر موقع ملے تو دوسرے ملکوں کی بھی سیر کرے۔ اس نے مختلف تاجداروں سے اسی طرح سے ملاقاتیں کرکے ان کی تفصیل لکھی جس طرح بعد کے زمانے میں لوگ بڑے بڑے لوگوں کے دستخط اکٹھے کرنے لگے ہیں اور اس طرح اس کی شخصیت کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہوگئی اور وہ ایک بڑے عملے اور حاشیہ برداروں کے ہمراہ ایک دربار سے دوسرے دربار میں آنے جانے لگا۔ اس تمام عرصے میں اس نے اپنے حافظے میں مختلف ممالک کے واقعات کو بخوبی محفوظ رکھا کہ وہ ملک کیسا ہے اس کے باشندے کیسے ہیں۔ رسم و رواج کیا ہے، پیداوار کیا ہوتی ہے اور اس طرح کی دوسری تفصیلات۔ اور جب

وہ مشرق افریقہ، قسطنطیہ، روس کے کف دست میدانوں، ہندوستان، لنکا اور چین کی سیاحت ختم کر چکا تو وہ ۱۳۴۹ع میں اپنے وطن میں واپس آیا۔ چند ماہ تک آرام کرنے کے بعد وہ غرناطہ اور دریائے نائیجر کے حبشی مسلمانوں کے ممالک کی سیر و سیاحت کے لیے چلا گیا۔ اس کے سفر کی داستانیں بقول ابن خلدون پہلے پہل تو فاس میں کچھ بداعتمادی کے ساتھ پڑھی گئیں جہاں اس نے سلطان کے حکم سے ان کی تفصیل ایک محرر ابن الجوازی نامی کو لکھوا دی تھیں۔ اس کی تصنیف سے اہل مشرق بالکل نا آشنا رہے۔ اس سفر نامے کے کچھ معمولی سے خلاصوں سے جو انیسویں صدی میں حاصل کیے گئے تھے اہل یورپ کو زیادہ دلچسپی پیدا ہوئی لیکن جب تک الجزائر کو فرانسیسیوں نے مکمل طور پر فتح نہ کر لیا اس سفر نامہ کا اصلی نسخہ دستیاب نہ ہو سکا۔

اپنی سیر و سیاحت کی وسعت کے اعتبار سے تو ابن بطوطہ زمانۂ قدیم اور قرون وسطے کے تمام سیاحوں پر گونہ سبقت لے گیا ہے البتہ یہ ایک ناگزیر امر تھا کہ اس کی تفاصیل میں اغلاط نہ ہوں بالخصوص ایسی حالت میں کہ جب اس کی تحریری یاد داشتیں بحر ہند کے ڈاکوؤں کے حملے میں ضائع ہوگئیں اور اسے محض اپنے حافظے کی بنا پر ہی سارے حالات کو لکھوانا پڑا مگر ایسی تفصیلات اتنی کم اور اتنی غیر اہم ہیں کہ یہ تصنیف ما بعد مغول کے اسلام کی تمدنی اور معاشرتی تاریخ میں سند مانی جاتی ہے۔ اس تفصیل میں اگر کوئی نقص ہے جسے نقص کہا جا سکتا ہے

تو وہ اس زمانے کا نقص ہے لیکن اس کی دیانت صحیفہ نگاری شک
و شبہ سے بالا تر ہے۔ اس کتاب میں بطور خود ایک ادبی دلچسپ
بھی پائی جاتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ ابن جوزی نے اس کتاب
اشعار کے حوالوں اور ابن جبیر اور دوسرے مصنفین کی عبار
آرائیوں کے علاوہ خود اپنے بے تصنع اضافوں سے خوب مزین
ہے لیکن پھر بھی یہ کتاب ایک سیدھا سادہ بیان معلوم ہوتا
جس میں دلچسپ واقعات اور مزاحیہ نکات کی فراوانی ہے۔ اس م
اسلوب بیان کا دعوے نہیں ہے۔ محض دستور واقعات میں بوقلمو
پیدا کرکے اس زمانے کی تہذیب اور رسم و رواج پر کافی روشن
ڈالی گئی ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

"لاذقیہ سے ہم ایک بڑے جہاز پر سوار ہوئے جو اہ
جینیوا کی ملکیت تھا اور اس کے مالک کا نام مرتلمین تھا اور ترکو
کے ملک کی طرف روانہ ہوئے جو ملک روم کے نام سے مشہور ہے
اس ملک کا نام رومیوں (یونانیوں) کے نام پر ہے کیونکہ زما
قدیم میں وہی لوگ یہاں کے باشندے تھے۔ اب وہاں بہت
عیسائی بھی آباد ہیں جو ترکمان مسلمانوں کی حفاظت میں رہتے ہیں

ہم دس روز تک باد موافق کے سہارے سفر کرتے رہے
جہاز کا نصرانی مالک ہم پر بڑی مہربانی کرتا تھا اور اس نے ہ
سے کوئی کرایہ وصول نہ کیا۔ دسویں روز ہم شہر علیہ م
پہنچے جو روم کی سرحد پر واقع ہے۔ یہ ملک جسے روم کے نام
تعبیر کرتے ہیں دنیا کے خوبصورت ترین ملکوں میں سے ہے۔ یہا

خدانے کریم نے ان تمام نعمتوں کو اکٹھا کرکے رکھ دیا ہے جو تمام دنیا میں جگہ جگہ پھیلی ہوئی ہیں۔ یہاں کے لوگ بیحد شکیل اور خوش رو ہیں۔ عمدہ لباس پہنتے ہیں۔ کھانے میں بڑا تکلف کرتے ہیں اور خدا کی مخلوق میں سب سے زیادہ با برکت ہیں۔ اور اسی لیے یہ مثل بھی مشہور ہے کہ برکت اور دعاؤں کے لیے ملک شام اور مہربانی کے لیے روم۔ ہمیں جب کبھی کسی مسافر خانے یا نجی مکان میں قیام کرنے کا اتفاق ہوا ہمارے پڑوسی کیا مرد کیا عورت (یہاں عورتیں پردہ نہیں کرتیں) ہماری خیر و عافیت دریافت کرنے کے لیے آئے اور جب ہم سفر پر دوبارہ روانہ ہوتے تو وہ ہمیں الوداع کہنے آتے گویا ہم ایک ہی خاندان اور گھر بار کے افراد تھے اور ہماری روانگی پر عورتیں اشکبار ہوا کرتی تھیں"

(اس ضمن میں کم از کم ایک بعد کے زمانے کے مسافر الوزان کا حال لکھنا بھی مناسب ہے جو فاس کا رھنا والا تھا (م بعد ۱۰۲۶ ع) جسے عیسائی لٹیروں نے پکڑ لیا تھا اور اٹلی میں آباد ہوگیا تھا۔ عیسائی مذہب قبول کر لینے کے بعد اس نے اپنا نام جان لیو رکھا۔ اس کا اصلی سفر نامہ جو عربی میں تھا ضائع ہو چکا ہے لیکن اس کی کتاب کا اطالوی ترجمہ افریقہ کے متعلق تمام یورپین تصانیف میں اٹھارویں صدی عیسوی تک سند مانا جاتا رہا ہے)۔

شمالی افریقہ کے بر بری خاندانوں کے متعلق ہمارے پاس مکمل

مواد موجود ہے۔ ان کتابوں میں سب سے زیادہ مشہور اور نہایت قابل
قدر تصنیف عبدالواحد مراکشی (۱۱۸۵ع تا ؟) کی تاریخ الموحدین
ہے۔ ان تمام موورخین کی تصانیف پر عبدالرحمان ابن خلدون تونسی
(۱۳۳۲ع تا ۱۴۰۶ع) کی تاریخ سبقت لے گئی ہے۔ ابن خلدون
اپنے زمانے کا سب سے بڑا مورخ اور نئے علم تاریخ کا موجد مانا جاتا
ہے۔ اس کے اپنی تحریر کردہ سوانح میں ہمیں شمال مغربی افریقہ میں
اس کی جانبازانہ سیاسی زندگی کے حالات کا پتہ چلتا ہے کہ اس کے لیے
اپنی ادبی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لیے وقت نکالنا کس قدر
مشکل تھا اور کس طرح آخرکار وہ قاہرہ پہنچا جہاں رہ کر اس
نے ممتاز خدمات انجام دیں۔ اس کی شہرۂ آفاق تصنیف "العبر"
پہلے پہل ۱۳۷۷ع میں مکمل ہوئی اور اس کے بعد کئی دفعہ اس
پر نظر ثانی بھی ہوئی۔ اس میں ایک مقدمہ ہے۔ اسلامی تاریخ کا
خلاصہ ہے (زیادہ تر ابن الاثیر سے ملخص کیا ہے)۔ ضمنی ابواب ہیں
جن میں مشرق کے حالیہ انقلابات کا ذکر ہے اور بربروں اور شمالی
افریقہ کے شاہی خاندانوں کی مفصل تاریخ ہے۔ تاریخ تصانیف کے
سلسلے میں اس کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ ابھی پورے طور پر نہیں
لگایا جا سکا۔ اس کی مستقل تصانیف کا مقابلہ کسی اور اسلامی
مورخ سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ خواہ وہ خود اپنا معیار بلند کرنے
میں اپنے آپ کو کتنا ہی کم کیوں نہ سمجھے لیکن اس کی تمام
شہرت کا دار و مدار زیادہ تر اس کے مقدمے پر ہی ہے۔ مسلمانوں
کے سیاسی ارتقاء کی آٹھویں صدی تک آ جانے کے بعد اور خود اپنے

تجربے کی بنا پر کہ شمالی افریقہ کی تاریخ کے سلسلہ میں اس کا مواد کتنا خام ہے اس نے یہ کوشش کی کہ وہ تاریخ کے تمام ظاہری ماحول کو عام اصول کے ماتحت منضبط کردے اور اس طریق عمل سے پہلی مرتبہ (جہاں تک ہمیں معلوم ہے) وہ اس منزل پر پہنچا کہ بنی نوع انسان کے ادب میں علم تاریخ کو بھی ایک فلسفی تصور کا مقام حاصل ہے [اس قسم کا دعوے پہلے سینٹ آگسٹائن کے متعلق بھی کیا جاتا تھا لیکن پروفیسر فلنٹ نے اپنی کتاب تاریخ فلسفۂ تاریخ (۱۵۰ تا ۱۷۱) میں اس ادعا کی تردید کرتے ہوئے ابن خلدون کی بے حد تعریف و توصیف کی ہے] - ابن خلدون لکھتا ہے :

" دانا اور ناداں دونوں تاریخ کی تعریف کرتے ہیں کیونکہ ظاہری صورت میں تو یہ صرف ایک ایسا تذکرہ ہے جس میں ان حالات کی تفصیل ہے جن کے ذریعہ انسانوں کے معاملات میں عظیم انقلاب آئے لیکن اس کی باطنی صورت یہ ہے کہ اس میں ان اسباب و علل کے شعور سے بحث کی گئی ہے جس کے ماتحت ایسی کیفیات پیدا ہوئیں۔ اس اعتبار سے علم تاریخ کی بنیاد نہایت گہرے فلسفے پر قائم ہے جسے اس علم کی ایک شاخ سمجھنا چاہیے "۔

وہ لکھتا ہے کہ :

" بنی نوع انسان کا معاشرہ اپنی مختلف ظاہری صورتوں میں ایسی جبلی خصوصیات کا اظہار کرتا ہے جن کے ذریعہ تمام بیانات پر ضبط قائم رہتا ہے . . . وہ مورخ جو صرف روایات پر اعتماد کرتا

ہے اور جو ان اصولوں سے پورے طور پر واقف نہیں جو واقعات کی عام رفتار پر حاوی ہیں مثلاً فن حکومت کے اساسی قواعد و اصول ' تہذیب کی اصلیت اور انسان کی مجلسی زندگی کی خصوصیات تو وہ یقیناً راہ راست سے بھٹک جائے گا - اس لیے تمام روایتی واقعات کو عام اصولوں کی روشنی میں اساسی قواعد کا پابند کرکے جانچنا چاہیے''۔

ابن خلدون سیاسی ' دینی یا فلسفی تعصبات سے خاص طور پر بالکل پاک تھا' اس لیے وہ اس غلط نظریہ کا کم شکار ہوسکتا تھا کہ واقعات کا اظہار کسی پہلے سے قائم کردہ نظریہ کے ماتحت کر دیا جائے جیسا کہ اکثر مورخین کرتے ہیں - اس نے اس بات کا صحیح اندازہ لگا لیا تھا کہ تاریخ کا راستہ دو مختلف قسم کی طاقتوں کے درمیان توازن قائم رکھنے ہی سے قائم رہ سکتا ہے - اس کے نزدیک یہ دونوں طاقتیں خانہ بدوشی اور شہری زندگی کے مماثل تھیں - اس صورت میں اس نے علم تاریخ کو تاریخ تمدن کے ساتھ تطبیق دی اور اس طرح اپنا عام نظریہ قائم کرکے اس نے اپنے مقدمے میں تہذیب وتمدن کے ارتقاء کی مختلف منازل کا مذہبی' اقتصادی' انتظامی' فنی اور سائنٹفک تصورات کے ماتحت تفصیل کے ساتھ مطالعہ کیا - اس میں کچھ شک نہیں کہ ان سب باتوں میں اس کی تصنیف کا تعلق اور اس کی قدر و قیمت اس کے اپنے زمانے کے سیاسی حالات اور اپنی قوم کے حالات تک ہی محدود و مرکوز ہے لیکن اس اعتبار سے بھی یہ تصنیف اس قابل ہے کہ اس کی جتنی بھی قدر کی جائے وہ کم ہے -

شمال مغربی افریقہ کے بے شمار مورخین نے جو کتابیں بعد کے زمانے میں لکھی ہیں (جن میں سے بہتوں کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے) ان میں سے صرف ایک کتاب ایسی ہے جسے عربی ادب میں کچھ وسیع مقبولیت حاصل ہوئی۔ ۱٦۳۰ع میں المقری تلمسانی (۱۰۹۱ع تا ۱٦۳۲ع) نے چند دمشقی علماء کی فرمائش پر تاریخ ہسپانیہ (نفح الطیب) اور ابن الخطیب (ص ۱۰۹) کے سوانح لکھے۔ اس کتاب کے پہلے حصے میں اندلس کی سیاسی اور ادبی تاریخ کا ایک خزانہ موجود ہے جو اس نے پہلے زمانے کی ان کتابوں سے اخذ کیا جو اب معدوم ہو چکی ہیں اور اگر خوش قسمتی سے یہ کتابیں ہمیں کسی طرح دوبارہ مل جائیں تو وہ ہمیشہ ہسپانوی عربی تہذیب کے عروج کے سلسلے میں ہماری بہترین مستند کتابیں متصور ہوں گی۔

فصل ۳۔ ۱۵۰۰ع تا ۱۸۰۰ع

عثمانی فتوحات کے دور کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام پر خواب گراں کی حالت طاری ہو گئی اور بالخصوص ان ولایات میں جہاں عربی زبان بولی جاتی تھی۔ یہ مسائل ہمارے نفس مضمون کی حدود سے باہر ہیں کہ ان حالات کا تعلق انسانی خصوصیات، تاریخی و جغرافیائی حالات، اقتصادی بد حالی یا ایک ہی قسم کے خیالات و تصورات کے مہلک اثرات سے کہاں تک تھا۔ اس زمانے میں یورپ کے دل و دماغ کی عام بیداری پر اگر غور کیا

جائے تو اس کے مقابلہ میں سولھویں صدی سے لے کر انیسویں صدی تک تو یہاں اندھیرا ھی اندھیرا نظر آتا ہے ۔ اس زمانے میں کوئی زبردست انقلاب تو نہ ھوا لیکن ایک قسم کی افسردہ کن یکسانیت ضرور نمایاں ہے اور مذھبی اختلافات کے ھوتے ھوئے بھی یہ کیفیت دور نہ ھوسکی ۔ گو یہ بات بظاھر مہمل معلوم ھوتی ہے لیکن اصلیت یہی ہے کہ عربی ادب آج کل زیادہ تر جغرافیائی رقبے کے لحاظ سے وسیع ھو رھا ہے ۔ چودھویں صدی کے پر آشوب انقلابات کی وجہ سے اسلام وسط افریقہ، ھندوستان ، ملایا ، چین ، روس اور مشرق یورپ تک پھیل گیا ۔ اس کے ساتھ ھی ساتھ قرآن اور دینی کتابوں کا بھی چرچا ھوا ۔ اس طرح عربی علم و فضل کے مرکز نئے علاقوں میں قائم ھوگئے اور بالخصوص ایسے ممالک میں جہاں کوئی ادبی زبان موجود نہ تھی اسی زبان کو عالمانہ رسل و رسائل کا ذریعہ قرار دیا گیا ۔ ھندوستان کی درباری زبان گو فارسی ھی تھی ، لیکن یہاں سے بھی گاھے گاھے عربی زبان کی تصانیف شائع ھونے لگیں اور عربی شعر و سخن کا بھی چرچا ھوا ۔ ان تصانیف میں دو کتابیں تاریخ کی بھی تھیں ۔ پہلی تو مالا بار کے علاقے میں اشاعت اسلام کے متعلق ہے جس میں پرتگیزوں کے خلاف لڑائیوں کا ذکر بھی ہے اور دوسری سلطنت گجرات کی تاریخ ہے ۔ جزائر غرب الہند میں بھی دینی علوم پر چند کتابیں عربی زبان میں لکھی گئیں ۔ اس کے برعکس چین میں مسلمان عربی تصانیف کا مطالعہ تو کرتے تھے لیکن تحریر و مکاتبت چینی زبان میں ھوا کرتی تھی ۔

ولایات اناطولیه اور مشرقی یورپ میں شروع ہی سے عربی طور طریقوں کی بجائے فارسی نمونوں پر ہی عمل کیا جاتا تھا اور پندرھویں صدی میں جو کتابیں عربی زبان میں ترکوں نے لکھیں وہ زیادہ تر مذہب یا سائنس کے متعلق ہی تھیں۔ ترکوں کی سلطنت میں عرب ولایت کے الحاق سے عام ادبی اغراض کے لیے عربی زبان کا استعمال کچھ زیادہ ہونے لگا، ترکوں نے عربی نثر مقفے نثر اور نظم میں کئی کتابیں لکھی ھیں۔ ان میں سے سب سے زیادہ مشہور کتاب عربی ترکی اور فارسی تصانیف کے ماخذ ھیں جو حاجی خلیفہ (م ۱۶۰۸ء) نے لکھی۔ یہ شخص قسطنطنیہ کے محکمہ جنگ میں کاتب (سیکرٹری) تھا۔

اسلام مشرق اور مغرب دونوں طرف سے وسط افریقہ میں داخل ہوا۔ کئی صدیوں تک عربوں کے تجارتی مرکز مشرقی ساحل کے ساتھ ساتھ موقالہ تک قائم رہے اور ہوتے ہوتے زنجبار اور سارے براعظم میں مسلمانوں کی بڑی بڑی نو آبادیاں قائم ہو گئیں۔ ہمارے پاس کئی تصانیف ایسی ہیں جو ان نو آبادیوں میں لکھی گئیں۔ ان میں کئی تاریخی کتابیں بھی ہیں جو ان تجارتی منڈیوں ہی کے متعلق ہیں اور ایک اہم تاریخ میں مسلمانوں اور حبشہ کے عیسائیوں کی لڑائیوں کا ذکر بھی ہے۔ یہ کتاب ۱۵۴۰ء میں ایک سمالی عرب مسمی عرب فقیہ نے لکھی تھی۔ مراکو سے اسلام علاقہ نائجیریا میں گیارھویں صدی میں پہنچا اور وہاں بھی سولہویں صدی عیسوی

میں تاریخی کتابیں لکھی گئیں - ان میں سے سب سے زیادہ دلچسپ
تصنیف خاندان سنفائے کی سیاسی اور قومی تاریخ کے متعلق ہے
یہ کتاب ۱۶۵۶ع میں السعدی ٹمبکٹوی نے لکھی تھی -

خاص عرب ممالک میں عربی ادب کی نمایاں خصوصیت
یہ تھی کہ اٹھارویں صدی میں بعض نامی گرامی علماء کے زیر
اثر علم لسانیات کی تجدید ہوئی - ان علماء میں ممتاز ترین شخصیت
جنوبی عرب کے علاقے کے رہنے والے سید مرتضے (۱۷۳۲ء
۱۷۹۱ع) کی تھی جو یمن کے دبستان زیدی کے آخری فر
تھے - آپ کے علم و فضل کی آخری اور دوامی یادگار آپ کی قابل
قدر تفسیر ہے جس کا عجیب و غریب نام تاج العروس ہے ج
آپ نے ابتدائی لغات کی کتابوں کے معیار پر لکھی تھی
لیکن اس کی اشاعت ثانی کو کہیں زیادہ اهمیت حاصل ہے جو
کے ساتھ غزالی کی احیاء کی بھی ایک مفصل و مکمل شرح ہے
آپ کی تصنیف کا فوری اثر تو یہ ہؤا کہ اس کے ذریعہ تم
اسلامی دنیا میں حصول علم و فضل کا ایک زبردست جذبہ پیدا ہ
گیا اور اس کے ذریعہ اسلام کے بے حس مذہبی ضمیر میں اخلا
سرگرمی اور غزالی کے زبردست ذاتی عقائد کا جوش و خروش
موجزن ہونے لگا - اس تصنیف میں آپ نے پرانی کتاب پرست
اور پہلے مصنفین کی غلامانہ تقلید سے آزاد ہو کر خود جم
ماخذ کی تحقیق و تدقیق کی ہے اور پوری سرگرمی اور انہا
و همت کے ساتھ محنت کی ہے - اس قسم کی تصنیف کا

نہایت ہی موزوں اور مناسب موقع تھا کیونکہ اسلام پر نازک وقت آنے کی گھنٹی بج رہی تھی -

خاتمہ کتاب

اسلامی دنیا اور خصوصاً عربی ممالک کے لیے انیسویں صدی اپنے ساتھ خارجی اور داخلی پریشانی اور سختی کا دور لائی - ۱۷۸۹ء میں نپولین مصر پر شہاب ثاقب کی طرح ٹوٹ پڑا اور اس اجنبیت کی نقاب کے پرخچے اڑا دئیے جس کی وجہ سے اہل مصر کا یورپ کی نئی زندگی اور معاشرے سے قطع تعلق ہو رہا تھا اور اس طرح قرون وسطے کی تہذیب پر ایک کاری اور مہلک زخم لگایا - تدریجی طور پر یورپین خیالات نے پرانے سیاسی اور سماجی حالات پر غلبہ پا کر ایک نیا تصور پیدا کر دیا -

لیکن اس بدلے ہوئے نقطہ نظر سے جو ایک نیا عربی ادب پیدا ہونا شروع ہوا وہ مصر میں نہ تھا اور نہ ہی اس تبدیلی کا یورپ کے سیاسی دباؤ سے کچھ تعلق تھا - زیادہ عجیب و غریب بات یہ ہے کہ اس ادب کے ارتقاء میں مسلمانوں نے بھی کوئی خاص نمایاں رہنمائی نہیں کی - اس میں کچھ شک نہیں کہ مغربی طرز و طور کا نفوذ کسی حد تک تعلیمی اداروں کے ذریعے بہت مؤثر طریقے سے ہوا اور ان اداروں کے چلانے والے طبعی طور پر عیسائی عرب تھے - اس لیے ملک شام اور خاص کر بیروت میں قدیم زمانے کی روایات اور نئی تہذیب کے خیالات کے امتزاج کی اصل کوشش جاری ہوئی اور مصر میں مغربی اثر سطحی طور پر نمایاں ہوا جس سے وہاں ایک

ایسا طبقہ پیدا ہوا جو نہ پرانے طریقے میں پورا ماہر رہا اور نہ پورے طور پر نئی تہذیب سے آگاہ ہو سکا - پرانی اور نئی تہذیب میں منافست اگر کچھ شدت کے ساتھ ہوئی بھی تو وہ انیسویں صدی کے اختتام کے قریب ہوئی - اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ ملک شام کے ادباء متواتر ہجرت کرکے ملک مصر میں چلے آئے - نتیجہ یہ ہو کہ عربی زبان کی ادبی تحریک کا مرکز مصر میں منتقل ہوگیا - اس کے ساتھ ہی اس نئی تحریک میں ایک تازہ گرمجوشی اس نوجوان طبقے کے کارناموں سے پیدا ہوئی جنہوں نے یورپین مدارس میں تعلیم پائی اور ان میں سے بہت سے نوجوانوں نے سال ہا سال یورپ میں تعلیم حاصل کرنے اور وہاں کی سیاحت میں صرف کیے - ان اسباب کے علاوہ ہمارے موجودہ زمانے میں مختلف رسالوں کے اجراء سے اور دوسرے ذرائع سے مثلاً یورپین ممالک میں عربوں کی بڑی نو آبادیوں اور بالخصوص امریکہ کی رہائش کی وجہ سے اس قسم کا اثر اور مذاق پیدا کرنے میں بڑی مدد ملی - اس دوسرے دور کا اہم پہلو شاعری کا آغاز ہے جس میں قدیم زمانوں کے نمونوں کی غلامانہ تقلید کا سلسلہ ختم کر دیا گیا اور گو پرانے اوزان اور مقبول طرزوں کو قائم رکھا گیا لیکن جذبات اور خیالات شاعر کی زندگی کے خاص ماحول سے لیے جانے لگے اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں مغربی شاعری بالخصوص فرانسیسی شاعری نے بڑا کام کیا - مثال کے طور پر احمد شوقی جسے آجکل عربی زبان کا اعلے شاعر مانا جاتا ہے خود معترف ہے کہ فرانسیسی شاعری سے انس پیدا کرنے کی وجہ سے اس کے شعر و سخن کا عا

لہجہ اور اسلوب بالکل تبدیل ہو گیا - مغرب کے اثرات نے کچھ لوگوں کو اس سے بھی زیادہ اچھے اور برے اغراض و مقاصد کی طرف مائل کر دیا - عربی ترجمہ نے گو وہ ناقص اور ایک حد تک ناکام ہی سہی قصصی نثر نگاری کی ترقی میں بہت کچھ مدد دی - اس سے زیادہ دلچسپی مقامی ڈرامہ نویسی کی ترقی میں لی جا رہی ہے جو پچھلے بیس تیس برس میں کافی ترقی کر چکی ہے گو اس کی ابتداء مولیر کے عربی تراجم سے ہوئی جو کچھ زیادہ امید افزا نہ تھی - بہرحال ان سب کارناموں میں ابھی تک اس بات کا امتیاز مشکل ہے کہ پرانے مواد کی پیوند کاری زیادہ نمایاں ہے یا خالص تقلید - یہی حال عربی نثر کے ادبیات کا بھی ہے - انیسویں صدی کے پہلے نصف میں تو دبستان قدیم سے کچھ انحراف نہ ہوا - فن تاریخ نویسی میں تو کم سے کم ایک مصنف ایسا پیدا ہوا جو قرون اولے یا ادبی زمانے کے عرب مورخین کا ہم پلہ تھا - الجبرتی (۱۷۵۶ع تا ۱۸۲۵ع) جس نے فرانسیسی قبضے کے دوران میں مصر کی سیاست میں خود اہم حصہ لیا تھا دو نہایت قابل قدر تصانیف چھوڑ گیا ہے - ایک اٹھارویں صدی کی تاریخ مصر اور دوسری فرانسیسی قبضے کے زمانے کا ایک روزنامچہ - اس صدی کے آخری نصف میں میدان ادب زیادہ تر اہل شام کے ہاتھ میں رہا جو جرجی زیدان کی تاریخ ''تمدن اسلام'' کی تقلید کرتے ہوئے عرب کے علم التاریخ میں تحقیق و تدقیق کے نئے با اصول طریقے جاری کرنے لگ گئے - دینیات کے حلقے میں بھی نئے خیالات نے زبردستی اپنا الگ مقام پیدا کر لیا ہے اور بہت سے مفکر اب اس بات کی ضرورت

محسوس کر رہے ہیں کہ عقاید و اصول اسلام کو دوبارہ نئے طریقے سے واضح کیا جائے۔ اس کا ایک عملی نمونہ ادیب و عالم محمد عبدہ (متوفی ۱۹۰۳ع) کا "رسالة التوحید" ہے - محمد عبدہ جامع الازہر کے مشہور مہتمم اور مصلح دین ہو گزرے ہیں -

شامی امریکن مصنفین نے مغربی خیالات کے نشر و اشاعت کے سلسلے میں اہم حصہ لیا ہے - ان لوگوں پر مغربی معاشرت اور تعلیم کا اتنا گہرا اثر ہوا ہے کہ آج تک مشرق اور مغرب میں جو قدرتی امتیازات تھے ان کی بالکل بیخ کنی ہو چکی ہے اور ان میں صرف ایک خفیف اور جذباتی قسم کا احساس اپنے وطن اور زبان کے لیے رہ گیا ہے - اس قسم کی ایک سربآوردہ ہستی کا تعجب خیز بیان ذیل میں ملاحظہ کیجیے :

" جب مجھے پہلی مرتبہ ممالک متحدہ امریکہ میں جانے کا اتفاق ہوا تو میری عمر اس وقت صرف ۱۲ سال کی تھی اور عربی زبان اور فرانسیسی میں تھوڑی سی شدبد کے علاوہ میں اور کچھ نہ جانتا تھا ۔ امریکہ میں دس سال رہنے کے بعد میں امریکنوں کی ہمت، ان کی آزاد خیالی، ان کی گفتار و کردار کا مداح ہوگیا لیکن میں ان کے مادی جہاد کے اثرات سے خائف تھا۔ میں سوائے فرانسیسی ادب کے فرانس کے متعلق سب کچھ بھول گیا تھا اور یہ ادب ایسا تھا کہ جس نے مجھے کمزور کر دیا اور زندگی کی تگ و دو کے متعلق قطعی فیصلہ کرنے کے ناقابل بنا دیا اور اسی وجہ سے میں زندگی کے ٹھوس مادی حقائق سے دور جا پڑا ۔ لیکن انگریزی کے علم

نے مجھے انگریزوں سے زیادہ قریب کر دیا اور میں نے انہیں کئی طرح اخلاق اور سماجی لحاظ سے اپنے لیے زیادہ زندہ دل اور موزوں پایا ـ انگریزی زبان میں ایمرسن میرا پہلا رهنما تھا - ایمرسن نے میرا تعارف کارلائل سے کرایا اور یہ کار لائل هی تھا جو مجھے سمندر عبور کرا کے پھر عرب ممالک میں واپس لے آیا (خلاصہ دیباچہ ''ملوک العرب'' مصنفہ امین الریحانی) -

جدید عربی ادب سے آئندہ کیا توقعات هیں ؟ اس کا جواب زیادہ تر اس بات پر منحصر ہے کہ اس قسم کے ادب نے خود عرب کی سر زمین میں اپنی جڑیں کس حد تک مضبوط کی هیں - یہ ایک ناگزیر امر ہے کہ انیسویں اور بیسویں صدی کی تجدید عرب کا مقابلہ اویں اور دسویں صدی کی یونانی تجدید سے کیا جائے- لیکن ان دو تجدیدوں کے اجزاء ایسے مختلف هیں کہ ان میں کوئی حقیقی توازن قائم نہیں کیا جا سکتا- اس کے علاوہ موجودہ رجحانات بھی کافی طور پر واضح نہیں ' ایسا معلوم هوتا ہے کہ نئی تحریک نے اپنا تمام و کمال زور صحیفہ نگاری میں لگا دیا ہے - اس کی وجہ شاید یہ ایم شعوری خیال ہے کہ تجدید کی سب سے بڑی مدد گار صحیفہ نگاری ہے - لیکن اس خیال کے ساتھ هی اس میں تجدید کے لیے سب سے بڑا خطرہ بھی موجود ہے - مستقبل کی خوش بختی اسی میں ہے کہ اس خطرہ کا احساس کر لیا جائے اور مشرق کے بہترین دماغ اس بات پر مصر هوں کہ وہ اپنے هم وطنوں کو خود ان کی اپنی تاریخی تمدن و معاشرت کی قدر و قیمت کھرے طور پر سمجھنے اور ان سے متمتع

ہونے کی طرف زیادہ توجہ دلائیں لیکن ایسا کرنے میں مغربی تہذیب
کی معاندانہ مخالفت نہیں ہونی چاہیے بلکہ جدید مغربی علوم کو
ایک مضبوط اساسی حیثیت دے کر ہم آہنگی کے ساتھ مکمل فلسفۂ
حیات کو سمجھنے اور انسانی فطرت کے رموز و نکات کو از سر نو
ظاہر کرنے کی کوشش ہونی چاہیے۔

ضمیمہ

متعلقہ ترتیب قرآن حکیم بجواب خیالات مصنف

صفحہ ۲۰ الف

مصنف کا یہ بیان تنقیح طلب ہے۔ قرآن حکیم کی ترتیب کتابی
مسلمانوں کے نزدیک "توقیفی" ہے یعنی خود آنحضرت صلی اللہ علیہ و
آلہ وسلم نے وحی الٰہی کے تحت متعین فرما دی، ہے کہ کونسی
آیت کس سورت میں اور کس آیت کے بعد رکھی جائے۔ سورتوں
کی ترتیب بھی آپ ہی کی مقرر کردہ ہے۔ اس کی تصدیق خود قرآن
کریم کی اندرونی شہادتوں سے ہوتی ہے۔ قرآن کا تعارف ہی "کتاب"
کی حیثیت سے کرایا گیا ہے: ذلک الکتب لا ریب فیہ ھدی للمتقین
(۲ : ۱)۔ "یہ کتاب کوئی شک نہیں اس میں ہدایت ہے پرہیزگاروں
کے لیے"۔

ترتیب کتابی

انہ لقرآن فی کتب مکنون   بیشک یہ قرآن ہے بڑی عزت والا

لا یمسه الا المطهرون تنزیل من رب العلمین (۵۶: ۷۷ تا ۸۰)

پوشیدہ کتاب میں — اسے چھو سکتے ہیں صرف پاک لوگ (کیونکہ) اتارا ہوا ہے تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے ۔

قرآن کریم غلاف میں رکھا جاتا ہے اور بغیر طہارت کے اسے چھوا نہیں جاتا ۔

کلا انها تذکرة فمن شاء ذکره ۔ فی صحف مکرمة مرفوعة مطهرة بایدی سفرة کرام بررة ۔ (۸۰: ۱۱-۱۶)

بیشک یہ نصیحت ہے جو چاہے اسے یاد کر لے یہ ان صفحات میں ہے جو عزت والے بلند مرتبہ اور پاک ہیں ۔ ان کاتبوں کے ہاتھوں میں جو بزرگ اور نیکو کار ہیں ۔

جن صفحات میں قرآن کریم مرقوم ہو ان کی عزت کی جاتی ہے، بلند جگہ انہیں رکھا جاتا ہے اور پاک کاغذ یا تختہ استعمال کیا جاتا ہے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے عہد مبارک میں جن بزرگواروں کے سپرد کتابت وحی تھی وہ بھی اعلی درجے کے پاک باز اور محترم تھے۔ مثلاً حضرت صدیق اکبرؓ، حضرت فاروق اعظمؓ، حضرت عثمان ذی النورینؓ، حضرت علی المرتضیٰؑ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبد اللہؓ بن مسعود، حضرت معاویہ بن ابی سفیان، حضرت ابی بن کعب وغیرہم رضی اللہ عنہم اجمعین ۔

حٰم والکتب المبین انا جعلنا قرآنا عربیا لعلکم تعقلون ۔ و انه فی ام الکتب لدینا لعلی حکیم ۔

قسم ہے اس کتاب کی جو تمام حقائق کھول کھول کر بیان کرنے والی ہے ۔ ہم نے اسے عربی قرآن بنا دیا ہے تاکہ تم سمجھ سکو۔ اور یہ ام الکتاب میں ہے ہمارے نزدیک بہت بلند مرتبہ اور حکمت والا ۔

قرآن اللہ کا وہ کلام ہے جسے کتابی شکل میں آنا تھا اور اسے عربی قرآن کی صورت ملنی تھی اور تقدیر الٰہی میں اسکی مدون صورتیں مقدر تھیں اور اسی میں اس کی تمام بلندی اور تمام حکمت کا ظہور۔

رسول من اللہ یتلوا صحفا مطھرۃ فیھا کتب قیمۃ۔ (۹۸ : ۲)

اللہ کی طرف سے مبعوث کیا ہوا رسول ان پاک صحیفوں کی تلاوت کرتا ہے جس میں پائیدار نوشتے محفوظ ہیں۔

و تمت کلمۃ ربک صدقا و عدلا لا مبدل لکلمتہ و ھوالسمیع العلیم۔ (۸ : ۱۱۶)۔

اور تیرے رب کی بات پوری ہو گئی سچائی اور انصاف کے ساتھ۔ کوئی نہیں جو اس کے کلمات کو بدل سکے وہی ہے جو سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

لا تحرک بہ لسانک لتعجل بہ۔ ان علینا جمعہ و قرآنہ۔ فاذا قرآنا ○ فاتبع قرآنہ۔ ثم ان علینا بیانہ (۷۵ : ۱۷ تا ۱۹)۔

اپنی زبان (یاد کرنے کے لیے) جلد جلد مت چلائیے۔ اس کا جمع کرنا اور پڑھانا ہمارا کام ہے لہذا جب ہم پڑھا چکیں تو آپ بھی دھرائیے پھر ہمارے ہی ذمہ اس کی تفسیر بھی ہے۔

انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون۔

یہ نصیحت نامہ ہم ہی نے اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

ان تمام آیات سے بخوبی ثابت ہوگیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن مجید کو اسی ترتیب سے یاد کیا کرتے تھے جو اس کی کتابی صورت کے لیے مقدر تھی (سنقرأک فلا تنسی الا ما شاء اللہ — ہم آپ کو اس طرح پڑھائیں گے کہ آپ بھولیں گے نہیں سوائے اس کے

جیسے اللہ چاہے) اور اسی طرح صحابۂ کرام نے اسے یاد کیا اور لکھا :

بل ھو آیت بینت فی صدور الذین اوتوا العلم ۔ وما یجحد بایتنا الا الظلمون ۔ (۲۹ : ۴۹)

بلکہ یہ آیات بینات اہل علم کے سینوں میں محفوظ ھیں اور ھماری آیات پر کوئی اعتراض نہیں کرتا سوائے ظالموں کے ۔

ترتیب نزولی

قرآن حکیم تئیس برس کی مدت میں رفتہ رفتہ حسب ضرورت نازل ھوا اور اس کی ترتیب کتابی نہیں تھی بلکہ بموجب اقتضا تھی ۔ چنانچہ قرآن پاک میں جگہ جگہ وارد ھے یسئلونک عن الانفال (وہ آپ سے انفال کے بارے میں پوچھتے ھیں) یسئلونک ماذا ینفقون (وہ آپ سے پوچھتے ھیں ھم کیا خرچ کریں) وغیرہ وغیرہ ۔

اس ترتیب نزولی پر لوگوں کا اعتراض ھے ۔ اللہ اس کے جواب میں فرماتا ھے :

وقال الذین کفروا لولا انزل علیہ القرآن جملۃ واحدۃ ۔ کذلک لنثبت بہ فؤادك ورتلنہ ترتیلا ۔ (۲۵ : ۳۲)

منکر لوگ کہتے ھیں ان پر پورا قرآن ایک ساتھ کیوں نازل نہیں ھوا ۔ یہ اس لیے ھے کہ ھم آپ کے دل کو اس کے نزول کا عادی بنائیں ۔ اس لیے ھم نے اسے رفتہ رفتہ اتارا ھے ۔

وقرآنا فرقنہ لتقرأہ علی الناس علی مکث و نزلنہ تنزیلا ۔ (۱۷ : ۱۰۶) ۔

اور یہ قرآن ھم نے اسے جدا جدا (آئتیں کر کے) اتارا تاکہ آپ لوگوں پر اسے ٹھہر ٹھہر کر وقفے سے پڑھیں اور ھم نے آھستہ آھستہ قرینے سے اتارا ھے ۔

ہمارا مدعا ثابت کرنے کے لیے یہ آیات کافی ہیں اور ان کے لیے کسی خارجی دلیل کی ضرورت نہیں۔ ویسے احادیث صحیحہ سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔

ربـــط آیات

قرآن پاک عربی زبان میں ہے اور ہر زبان میں مطلب ادا کرنے کا ایک اسلوب ہوتا ہے۔ مصنف کو آیات قرآنیہ کے مربوط نہ ہونے کا احساس ہوا تھا تو اس کی تشفی ایسے اہل زبان سے کرنی چاہیے تھی۔ قرآن کے مربوط ہونے پر کسی عرب نے کبھی اعتراض نہیں کیا اور آج بھی کوئی عرب ایسا نہیں جو مغربی زبانوں پر عبور رکھنے کے باوجود قرآن کو مربوط نہ سمجھتا ہو۔ غیر مسلم عرب جو معاندانہ جذبات رکھتے ہیں وہ بھی قرآن کریم کو معجزانہ کلام باور کرنے پر مجبور ہیں حتے کہ اپنے بچوں کی زبان میں لطافت و رفعت پیدا کرنے کے لیے انہیں قرآن حکیم پڑھاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ''الحمد سے لیکر والناس'' تک قرآن تمام مربوط ہے اور جس مضمون کی جو آیت جہاں آتی ہے وہ وہیں آ سکتی تھی۔ اگر نہ آتی تو خلا رہتا۔ یہ وہ چیز ہے جس پر مسلم اور غیر مسلم تمام عرب علماء متفق اللسان ہیں۔ اگر کوئی عرب عالم معترض ہوا ہے تو مصنف کو حوالہ دینا چاہیے تھا۔

تـاریخ وار تـرتیب

مختلف آیات کے تاریخ وار مرتب نہ ہونے کی وجہ خود قرآن

حکیم نے بتا دی ہے جیسا کہ ہم بیان کر چکے اور یہ وجہ بالکل شافی ہے۔ آیات کے نزول کی وقتی وجہ کچھ بھی ہو جب قرآن کے لیے مقدر تھا کہ وہ کتاب ہوگی تو یہ سوال ہی نہیں اٹھتا کہ فلاں آیت کب نازل ہوئی اور فلاں کب؟ یہ اور بات ہے کہ امت مسلمہ نے یہ تاریخی مواد بھی محفوظ کر لیا ہے اور مسلم علماء جانتے ہیں کہ کونسی آیت کس موقعے پر نازل ہوئی اور کس سورت میں کتنی آیتیں مکی ہیں اور کتنی مدنی۔ مگر وہ اس شان نزول کو کسی قسم کی اہمیت نہیں دیتے - دوام جس چیز کو ہے وہ کتاب کو ہے۔ کتابی ترتیب ہی وہ اصل اصول ہے جو ہر قسم کی فکر باطل کو نسیا منسیا کر دیتا ہے۔

انه لکتاب عزیز لا یاتیه الباطل من بین یدیه ولا من خلفه تنزیل من حکیم حمید (۴۱ : ۴۱) -

بیشک یہ کتاب ایسی ہے جو (ہر کتاب ہر خیال، اور ہر تصور پر) غالب آ جانے والی ہے باطل نہ اس کے آگے سے آ سکتا ہے نہ پیچھے سے کیونکہ اسے اتارا ہے بڑی حکمت والے نے جو ہر ستائش کا حق دار ہے۔

مضمون وار ترتیب

اب ہم آتے ہیں اس اعتراض کی طرف جو بادی النظر میں واقعی وقیع معلوم ہوتا ہے کہ آیات کو مضامین کے اعتبار سے کیوں جمع نہیں کیا گیا یعنی ایسا کیوں نہیں ہوا کہ اخلاق نصائح ایک سورت میں ہوتیں، فقہی احکام دوسری سورت میں حقائق و معارف تیسری میں اور قصص ایک الگ عنوان کے تحت۔ اگر ایسا

ہوتا تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ پورے قرآن کے حفاظ ساری امت میں دو چار ہی نکلتے اور وہ بھی اس بے کیف کام کے لیے اپنے آپ کو بہ تکلف تیار کرتے۔ ہر شخص اپنے میلان طبع یا موضوع فکر کے مطابق اسی سورت کا مطالعہ کرتا جو اس کے مقصد کے حصول میں معین ہوتی۔ فقہاء صرف کتاب الاحکام پڑھتے اور واعظ لوگ بس قصص متکلمین اور مطالعۂ فطرت کرنے والے محض اس باب پر متوجہ ہوتے جو ان کے مطلب کا ہوتا۔

دوسرا نتیجہ یہ ہوتا کہ کتاب کے لا تعد و لا تحصی عنوان قائم کرنے پڑتے جو کار بے نمک ہوتا۔ دنیا کی مذہبی اور غیر مذہبی بلند پایہ کتابیں موجود ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی ایسی ہے کہ اس کے حفظ کرنے پر ہر افتاد طبع اور ہر مزاج و مقصد رکھنے والے لوگ ذوق و شوق کے ساتھ تیار ہو جائیں؟ باقی کتابوں کا تو ذکر ہی کیا، کوئی شخص کہیں ایسا ہے جو عہد عتیق یا عہد جدید ہی کا حافظ ہو؟ ہرگز نہیں۔ کتاب مقدس سب سے زیادہ چھپتی ہے لیکن سب سے کم پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ برخلاف اس کے قرآن کریم سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔

قرآن حکیم کی موجودہ ترتیب ہی کا یہ معجزہ اور کرشمہ ہے کہ امت مسلمہ میں کروڑوں حافظ ہوئے اور ہر عہد میں لاکھوں موجود ہوتے ہیں۔ ہر سورت سب کے لیے یکساں کشش رکھتی ہے اور ہر مضمون کی آیت میں ہر قاری کے لیے عجائبات ہیں۔

ایسے عجائبات جو کبھی ختم ہونے میں نہیں آتے۔ ہر تلاوت پر نئے معانی، نئے مطالب، نئے انوار اور نئی برکات کا ظہور ہوتا ہے۔ مضامین کی یہ بے ترتیبی جو مصنف کے نزدیک عیب ہے، وہی در اصل اس کی معجزانہ خوبی ہے جسے کوئی الہامی کتاب بھی نہیں پہنچتی چہ جائیکہ غیرالہامی۔

طــــرز ادا

تاریخ، جغرافیہ، طبقات الارض، کیمیا، طبیعیات، فلکیات، لونیات، نوریات، پیدائش کی ابتدا، زندگی کا اولین ظہور اور اس کے ارتقائی منازل، علم النبات اور علم الحیوان وغیرہ وغیرہ تمام امور قرآن حکیم میں مذکور ہیں، لیکن سب استدلال اور استشہاد کے طور پر۔ جہاں ان امور میں غور و فکر کی دعوت اور حکم ہے وہاں بھی مقصد دلیل ہی لانا ہے تاکہ اہل علم جب انفس و آفاق کی ان نشانیوں پر غور کریں گے تو ان کے مکاشفات اور ادراکات اور مشاہدات سب سے قرآنی بیان کی تصدیق ہوگی۔

قرآن کا طرز بیان تقریری ہے، اس لیے اسے قرآن کہتے ہیں۔ تقریر کے دوران میں تمام امور آ جاتے ہیں اور اس حسن کے ساتھ کہ مضامین کے متغائر اور متنوع ہونے کے باوجود کلام کا سلسلہ مربوط اور حیران کن انداز میں موثر رہتا ہے۔ تنزیل ایسی ہے کہ قاری یا سامع کے ذہن میں خود بخود جو سوال پیدا ہو یا اضطراراً کوئی فعل سر زد ہو جائے تو اس پر بھی تنبیہ ہو جاتی ہے اور

مثلاً صاف کر دیا جاتا ہے (قب ۵۰: ۱۷ تا ۱۹) - یہ ایسا اعجاز ہے کہ اس کی حلاوت اور تاثیر دلوں میں اترتی چلی جاتی ہے -

چونکہ قرآنی استدلال حقیقی اور اس کے شواہد واقعی ہیں جن میں سے ایک ایک جزئیے کی تصدیق تجربہ اور مشاہدے سے ہوتی ہے اور چونکہ تجربہ و مشاہدہ کی دعوت بھی سب سے پہلے قرآن ہی نے دی اور قرآن ہی ہے جس نے علوم حکمیہ کو علم و نظر سے زیادہ عمل اور تجربہ بنایا اور مسلمانوں پر فرض کیا کہ کائنات میں حسی انکشافات اور وجدانی مکاشفات کے درپے ہوں، اس لیے مسلمانوں نے یہ تمام علوم و فنون پوری جانفشانی سے مدون کیے - دنیا میں آج ایک بھی موضوع فکر و سخن نہیں کہ جس کی بنیادیں استوار کر کے مسلمانوں نے اس پر ایک قصر رفیع تعمیر نہ کر دیا ہو - قوموں کے پاس جو کچھ ہے وہ مسلمانوں کا سامنے لایا ہوا، مسلمانوں کا حاصل کیا ہوا، مسلمانوں کا محفوظ کیا ہوا اور مسلمانوں کا ترقی دیا ہوا ہے - مزید ترقی کی راہیں بھی مسلمانوں ہی کی دکھلائی ہوئی ہیں - تحقیق و تنقید کے جس منہاج پر آج مغرب کے اہل فکر نازاں ہیں یہ بھی مسلمانوں ہی کا مقرر کردہ منہاج ہے - ولکن اکثر الناس لا یشکرون (لیکن اکثر لوگ شکر گزار نہیں) اور یہ سب معجزہ قرآن حکیم کا ہے -

سیاق و سباق

علوم و فنون کی اس تدوین میں، سیاسیات کی تشکیل میں اور

روحانیات کی تکمیل میں ہر زاویۂ نگاہ ' ہر دائرۂ عمل' ہر افتاد طبع اور ہر قسم کے صاحبان ذوق نے قرآن کریم کا مطالعہ کیا اور اپنے نقطۂ خیال سے مضامین اور مفہوم اخذ کرنے کے درپے ہوئے۔ اس جد و جہد میں ہر صنف کے علماء ' ہر فن کے ماہر اور ہر مضمون کے حامل مجبور ہوئے کہ پورا قرآن مستحضر کریں ۔ اس استحضار میں انہیں کبھی نظر نہیں آیا کہ قرآن غیر مربوط ہے اور اس میں مضامین خلط کر دئیے گئے ہیں ۔ یہ سب علماء و حکماء اور فقہاء قرآنی آیات سے جو استدلال کرتے ہیں وہ سیاق و سباق ہی کی روشنی میں ہوتا ہے ۔ پھر کیسے ؟اور کہا جا سکتا ہے کہ قرآن کی آیات غیر مربوط اور سلسلۂ کلام منقطع ہے ؟

لہذا یہ اعتراض کہ قرآن مباحث کی ترتیب مضامین کے اعتبار سے ہوتی بالکل ناقابل اعتنا ہے ۔ مضامین کے اعتبار سے ترتیب تو اس وقت ہوتی جب قرآن نے ان مضامین کی کتاب ہونے کا دعوے کیا ہوتا ۔ قرآن جس مضمون کی کتاب ہے وہ تو صرف سعید ارواح پر وارد ہوتا ہے نہ کہ ان گم کردہ راہ لوگوں پر جو اپنے دل کی کجی پر مستقیم ہیں اور احقاق حق سے انہیں گریز ہے ۔

یضل به کثیرا و یهدی به کثیرا و ما یضل به الا الفاسقین الذین ینقضون عهد الله من بعد میثاقه و یقطعون ما امر الله به	اس (قرآن) کے ذریعہ (خدا تعالی) بہت سے لوگوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہت سوں کو اس کے ذریعہ ہدایت دیتا ہے اور وہ اسی کو گمراہ نہیں کرتا مگر ان حد سے بڑھنے والوں کو جو اللہ کا عہد مضبوطی سے کرنے کے

ان یوصل و یفسدون فی الارض ۔

بعد اسے توڑ ڈالتے ہیں اور
سلسلہ مربوط رکھنے کا ۔
ہے اسے کاٹ ڈالتے ہیں اور ز
پر فساد پیدا کرتے ہیں ۔

منقولی دلیل

قرآن کریم کی موجودہ ترتیب پر قرآنی زاویۂ نگاہ سے عقلی بحث کرنے کے بعد ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ کتب سابقہ سے بھی اس ترتیب کی شہادت بہم پہنچائیں (ملاحظہ ہو عہد عتیق یسعیا ۔ باب بست و ہشتم) : اس باب میں بنو اسرائیل سے نبوت چھین کر بیگانہ لبوں اور اجنبی زبان رکھنے والے زبردست اور زور آو شخص کے ظہور کی پیش گوئی اور اس کی لائی ہوئی کتاب کی ترتیب کی نوعیت اور اس کی حقانیت کی گواہی ہے :

"کاهن اور نبی بھی نشے میں چور ہیں اور مے میں غرق ہیں ۔ وہ نشے میں جھومتے ہیں اور رویا میں خطا کرتے ہیں اور عدالت میں لغزش کھاتے ہیں کیونکہ سب کے دسترخوان قے اور گندگی سے بھرے ہوئے ہیں ۔ کوئی جگہ باقی نہیں ۔ وہ کس کو دانش سکھائے گا ؟ کس کو وعظ کرکے سمجھائے گا ۔ کیا ان کو جن کا دودھ چھڑا دیا گیا جو چھاتیوں سے جدا کیے گئے؟ کیونکہ حکم پر حکم قانون پر قانون ہے ، تھوڑا یہاں تھوڑا وہاں لیکن وہ بیگانہ لبوں اور اجنبی زبان سے ان لوگوں سے کلام کرے گا جن کو اس نے فرمایا یہ آرام ہے تم تھکے

سالدوں کو آرام دو اور یہ تازگی یہی ہے - پر وہ شنوا نہ ہوئے -
سو خداوند کا کلام ان سے یہ ہوگا - حکم پر حکم، حکم پر حکم،
قانون پر قانون، قانون پر قانون تھوڑا یہاں، تھوڑا وہاں تاکہ
وہ چلے جائیں اور پیچھے گریں اور شکست کھائیں اور دام
میں پھنسیں اور گرفتار ہوں -''

قرآن کی ترتیب پر اعتراض کرنے والے اس وعید ربانی سے
سبق لیں کیونکہ جو چیز انہیں برگشتہ کرتی ہے یعنی مضامین کا
بکھرا ہونا وہی پہلے سے مقرر شدہ ترتیب تھی اور عین منشا و
مصلحت الہیٰ کے مطابق - آخری کتاب کی زبان اور اس کی ترتیب
ان قدیم نوشتوں کی طرح نہیں ہوسکتی تھی جو اپنی مدت ختم کرکے
یا توضائع ہو گئیں یا منسخ و منسوخ - اب ان کتابوں کی تعلیمات
کی بقا اور ان کی افادیت کی سبیل ہی یہ تھی کہ آخری کتاب
ایک زندہ و پائندہ زبان میں نازل ہو اور احکام و دیگر مضامین اس
میں جا بجا بکھرے ہوئے ہوں - اس طرح کہ ربط قائم رہے اور
اس کی لذت و تازگی میں کبھی فرق نہ آنے پائے - اس طرح تمام
کتاب ہر وقت مستحضر رہے گی اور اس کی اضاعت اور اس میں تحریف
کی تمام راہیں مسدود رہیں گی -

قرآنا عربیا

اگرچہ اکثر مہذب قوموں کے نزدیک عربی '' اجنبی '' زبان
ہے لیکن اگر وہ غور کریں تو یہ کلام انہیں '' بیگانہ لبوں '' کا
نہیں معلوم ہوگا ، کیونکہ در اصل عربی ہی ایسی زبان ہے جس پر

تمام اقوام عالم متفق ہو سکتی ہیں اور جسے کل اہل عالم کی مشترک زبان قرار دیا جا سکتا ۔

دنیا کی سب زبانیں چند قدیم ترین زبانوں سے نکلی ہیں اور یہی تمام عالم کا مشترک ورثہ قرار پائیں لیکن وہ سب فنا ہوگئیں اور ان کے دوبارہ زندہ ہونے کی کوئی سبیل نہیں ۔ ان میں سے صرف ایک زبان ایسی ہے جو قدیم ترین ہونے کے علاوہ فصیح ترین، بلیغ ترین، لطیف ترین، وسیع ترین اور عظیم ترین ہے ۔ زمانہ قبل از تاریخ سے زندہ و پائندہ چلی آتی ہے ۔ کروڑوں آدمیوں کی مادری زبان ہے اور کروڑوں کروڑ لوگ اس کے سمجھنے والے ہیں ۔ ادنے محنت سے اسے روزمرہ بنا لینے کی قدرت و صلاحیت بھی کروڑوں انسانوں میں موجود ہے ۔ لہذا یہی تمام بنی نوع انسان کا مشترک اور فطری ورثہ ہے ۔

قوموں کو اس زبان میں جو اجنبیت نظر آتی ہے وہ سطحی اور وقتی ہے کیونکہ اصل کی طرف دیکھنے کی بجائے یہ لوگ فروع پر فریفتہ ہیں جو اس وقت ان کی مادری زبانیں بنی ہوئی ہیں ۔ اگر تعصب و تنگ نظری چھوڑ دیں تو انہیں معلوم ہوگا کہ ذہنی " آرام " اور عالمگیر " آسودگی " اسی زبان میں ہے اور یہی زبان ہے جس میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے والا کلام نازل ہو سکتا تھا جس کی " تازگی " کبھی ختم نہیں ہوگی ۔

قرآن کی زبان اختیار کرنے اور اس کی دعوت قبول کرنے ہی میں بنو آدم کو فلاح میسر آ سکتی ہے جو قوموں کی حریفانہ چشمک

دور کرکے انہیں ایک برادری بنانے آیا ہے ۔

کلام کی نوعیت

مصنف نے قرآن حکیم کو آنحضرت ﷺ کے مقالات کا مجموعہ کہا ہے لیکن اس نے یہ نہیں دیکھا کہ امت مسلمہ کو آنحضرت ﷺ سے ورثے میں محض قرآن مجید ہی تو نہیں ملا - اس خزانے میں احادیث نبویہ بھی ہیں اور احادیث قدسیہ بھی - یہ تینوں قسم کا کلام ایک ہی دریعہ سے آیا ہے تو اس میں اتنا نمایاں فرق کیوں ہے کہ مسلمانوں کو امتیاز کرنے میں کبھی دقت نہیں ہوتی اور نہ دوسرے اہل زبان کو ؟

احادیث نبویہ

احادیث نبویہ آنحضرت ﷺ کے اپنے ارشادات عالیہ ہیں - یہ کلام بھی اگرچہ نہایت فصیح و بلیغ ہے لیکن لسانی اعتبار سے اس میں کوئی معجزانہ پہلو نہیں - یہ اور بات ہے کہ مسلم و غیر مسلم فصحا و بلغا ان " جوامع الکلم " (چھوٹے چھوٹے جملے اور بڑے بڑے معانی) پر سر دھنتے ہیں - نبی ﷺ سے انتساب نے اس کلام میں نورانیت اور رفعت بھی بدرجہ اتم پیدا کر دی ہے - لیکن ہے یہ کلام انسانی - یہی وجہ ہے کہ احادیث وضع کرنے والے لوگ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوگئے اور بادی النظر میں انہوں نے اس اسلوب سے بات کہدی کہ سننے والا شخص ان کلمات کی لسانی رفعت سے مرعوب ہو جائے اور اسے نبی کا کلام باور کرلے -

اگر امت مرحومہ پر اللہ کا فضل نہوتا تو حدیثیں وضع کرنے والے لوگ دین کا پورا مفہوم مسخ کرکے رکھ دیتے لیکن اللہ نے اپنے حبیب ﷺ کے کلام کی حفاظت کے دو طریقے پیدا کر دیئے۔ ایک تو محدثین کا گروہ وجود میں آیا جنہیں ملکہ ہوتا ہے کہ قرآنی طرز استقصاء کے تحت وہ نبی اور غیر نبی کے کلام میں فرق کر سکتے چنانچہ ہر ابلس کی تلبیس کا پردہ انہوں نے چاک کر دیا۔

دوسرا ذریعہ اللہ نے یہ بنایا کہ قلب نبوی کا نور آپ کی اُمت کے قلوب میں منتقل کر دیا اورایسے ایسے عارف اس امت میں پید ہوئے جوالفاظ کی بجائے کلام کی نورانیت و ظلمت کا ادراک کرکے اطمینان کے ساتھ فیصلہ کردیتے ہیں کہ اس کلام میں نبوت کا نور ہے اور اس میں ولایت کا۔ یہ کلام سراسر نورانیت سے خالی ہے اور اس میں فلاں قسم کی ظلمت وقسادت پائی جاتی ہے۔ یہ بات امت مرحومہ میں ایسی عام ہے اور عرفا کی اتنی تعداد ہر زمانے میں رہتی ہے کہ ہر عہد کی ایک ایک مثال دی جائے تو دفتر درکار ہو۔ حضرت عبدالعزیز الدباغ جونویں صدی کے آخر میں ایک مغربی بزرگ گزرے ہیں یا حضرت میاں شیر محمد پہیلی بھیتی یا حضرت سائیں توکل شاہ انبالوی رحمۃ اللہ علیہ بالکل ان پڑھ تھے لیکن ان بزرگواروں کا اس قسم کا ادراک ضرب المثل ہے۔ هزارها علماء نے ان کے علم لدنی کا امتحان لیا اور ان کے معترف و معتقد ہوگئے۔

ہر عہد میں محدثین کی تعداد بھی ہزاروں تک پہونچی اور عارفین کاملین کی بھی۔ اس طرح نبی کا کلام غیر نبی سے اور

صلحا کا کلام غیر صالح افراد کے کلام سے ممیز ہوگیا۔

احادیث قدسیہ

یہ اللہ کا وہ کلام ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی زبان مبارک پر جاری کیا گیا لیکن یہ قرآن نہیں جیسے فرشتہ لاتا تھا بلکہ اس میں بشریت غالب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض صحابہ کو وقتی طور پر شبہ ہوا کہ یہ قرآن ہی ہے لیکن اکابر صحابہ اور ان کے جمہور اس شبہے میں نہیں پڑے۔ اللہ تعالے نے ان میں منشاء نبوی اور مرضی الٰہی سمجھنے کا جو شعور پیدا کر دیا تھا اور قلب نبوی سے انہیں جو مناسبت تھی وہ ان کے کام آئی اور انہوں نے اس کلام کو احادیث قدسیہ کی حیثیت سے تو محفوظ کر لیا لیکن قرآن کے ساتھ خلط نہیں کیا، کیونکہ نہ تو یہ کلام قرآن مجید کی طرح نازل ہوا تھا نہ اسے منضبط کرنے کے لیے وہ طریقے اختیار کیے گئے جو قرآن کریم کے لیے مخصوص ہیں۔

یہ کلام اپنی ظاہری رفعت و لطافت اور معنوی نورالیت و طہارت میں ایسا ہے کہ اگر قرآن حکیم میں بھی شامل ہو جاتا تو کوئی خاص فرق نہ پڑتا۔ لیکن جس پروردگار نے قرآن کریم کی حفاظت کا حتمی وعدہ کیا تھا وہ کیسے گوارا کرتا کہ امت کو اپنا ''فرقان'' بروے کار لانے کا موقعہ نہ ملے۔ یہ فرقان یعنی حق و باطل کا امتیاز اور دو سچائیوں میں زیادہ سچائی اور دو برائیوں میں زیادہ برائی کا علی وجہ البصیرت ادراک کر لینا او

یہ تمیز کرنا کہ فلاں قول و فعل کس درجے اور کس حیثیت کا ہے۔ اسی "فرقان" سے اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کے متقی لوگوں کو نوازا ہے۔

یا ایھا الذین آمنو ان تتقوا اللہ یجعل لکم فرقانا — اے ایمان والو اگر تم پرہیزگار رہو گے تو ہم تمہیں فرقان عطا فرمائیں گے۔

یہی "فرقان" ہمیشہ مسلمانوں کے قلوب کو حق پر قائم رکھتا ہے اور کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ یہ امت باطل پر مجتمع ہو جائے۔ یہی وجہ کہ مسلمانوں میں وقتاً فوقتاً جتنے باطل فرقے پیدا ہوئے وہ اپنی موت مرتے رہے اور جتنے باطل تصورات یا لاطائل امور وقتی طور پر رائج ہوئے وہ مسلمانوں کی اجتماعی قوت کے سامنے سپر اندازی پر مجبور ہو گئے۔ اگر کہیں کوئی باطل تصور دین موجود بھی رہا تو ایسے لوگوں کی عددی قوت کبھی اتنی نہیں ہو سکی کہ سب لوگ مجموعی طور پر بھی سواد اعظم کے مقابلے میں موثر اقلیت بن سکیں۔ قران حکیم کی تالیف، احادیث قدسیہ کی تمیز اور احادیث نبویہ کا امتیاز مسلم الثبوت ہے۔ نہ کوئی روایت اس پر اثر انداز ہوسکی اور نہ کسی دشمن دین و ملت کی دسیسہ کاری۔

مصنف بھی قرآن کو اس کی اصلی صورت اور حقیقی ضخامت کے ساتھ محفوظ کہتا ہے لیکن اس کا استدلال طعن آمیز ہے - وہ اسے ایک جاہل قوم کا علمی کارنامہ کہتا ہے جنہیں سیاق و سباق کی تو تمیز تھی نہیں اور نہ مضامین کے اعتبار سے تالیف کی، البتہ صحت پر قرار رکھنے میں شدت ضرور تھی۔

قرآن مجید

بیشک قرآن مجید کا تحفظ ایک کارنامہ ہے اور عظیم ترین جس کے بہت سے ظاہری اسباب ہیں لیکن اس جہت میں بڑا دخل اس کی زبان کو ہے۔ احادیث نبویہ اور احادیث قدسیہ کی موجودگی میں دیگر اقوام کے لیے قرآنی کلمات کی ظاہری اور معنوی برتری کا ادراک آسان نہیں تھا بھی قرآن منضبط کرنے کی ان تمام تدابیر کے باوجود جو عہد نبوی میں اختیار کی گئیں۔ لیکن اگر یہ تدابیر اختیار نہ بھی کی گئی ہوتیں تب بھی عربوں کے لیے قرآن کریم کو احادیث نبویہ سے جدا کر لینا کچھ مشکل نہ تھا۔

جس طرح مصر کے ساحر جو لکڑیوں اور رسیوں کو پھنکارتے ہوئے سانپ دکھا دینے پر قادر تھے اور عصائے موسوی کی کرامات دیکھ کر بے ساختہ سجدہ ریز ہوگئے اور پکار اٹھے ''آمنا برب ھارون و موسی'' (ہم ھارون اور موسی کے پروردگار پر ایمان لے آئے) بالکل اسی طرح ''معلقات'' کی عظمت لسانی پر سجدہ کرنے والے عرب بھی بالآخر پکار اٹھے :

انا سمعنا قرآنا عجبا یہدی الی الرشد فامنا بہ

ہم نے عجیب قرآن سنا ہے جو بھلائی کی طرف ھدایت فرمایا ہے تو ہم اس پر ایمان لے آئے

قرآن کریم میں کسی دوسرے کلام کے خلط ہو جانے کا امکان نہیں۔ آج تک کوئی جماعت بھی ایسا کلام وضع نہ کرسکی چہ جائیکہ کوئی فرد کرتا۔ لوگوں نے نبوت و رسالت کے دعوے

تو کردئیے اور بعض نے الوہیت اور الہیت کے بھی لیکن قرآن کی طرح کا کلام کوئی پیش نہ کر سکا - دعوی اپنی جگہ ہے لیکن صحت پوری ہوتی ہے اہل زبان اور عرفان کے اعتراف سے - تیرہ سو برس ہوگئے ' سیکڑوں لوگوں نے اپنی عمریں صرف کر دیں کہ قرآن کی سی ایک سورت یا دس ھی آیتیں وضع کر لیں یا قرآنی تعلیمات سے بڑھ کر کوئی نصب العین پیش کر سکیں لیکن ہمیشہ منہ کی کھائی اور واقعات نے ثابت کر دیا کہ قرآن کا مقابلہ یا اس سے معارضہ دنیا و آخرت کی رسوائی مول لینا ہے -

یہی وجہ ہے کہ قرآن کو ایک جگہ جمع کرلینے میں مسلمانوں کو کوئی مشکل درپیش نہیں آئی - نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتب کردہ مجموعے کے باھر/کوئی کلام ایسا نہ ملا جو قرآن کی آیات میں کسی جگہ چسپاں ہو سکے اور مسلمانوں کو دھوکے میں ڈال دے - قرآن تو ایسا کلام ہے کہ اگر کسی آیت میں علیم کی جگہ رحیم یا یعملون کی جگہ یعقلون یا یعقلون کی جگہ یشعرون کوئی بڑھ جائے تو دل میں فوراً کھٹک پیدا ہو جاتی ہے حالانکہ یہ سب الفاظ متشابہ المعنی ہیں اور خود قرآنی فقہا کے نزدیک نماز ہو جاتی ہے مگر دل کا کھٹکا پیچھا نہیں چھوڑتا - لا مبدل لکلمتہ (اسکے کلام میں کوئی تبدیلی کرنے والا پیدا نہیں ہو سکتا) -

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم یقینا امی محض تھے اور آپکا کم سخن ہونا بھی مسلم ہے لیکن آج تک کسی شخص نے

یہ نہیں کہا کہ نبی کا کلام غیر فصیح یا غیر واضح ہوتا تھا۔ آپ کا ارشاد ہے "انا افصح من نطق بالضاد ("ض" کو صحیح مخرج سے نکالنے والی قوم یعنی عرب میں مجھے فصاحت کا سب سے اونچا درجہ حاصل ہے۔ اس ارشاد کی حقانیت تیرہ سو برس سے مسلم الثبوت ہے۔ آپ کی فصاحت و بلاغت پر کسی ہم عصر یا زمانہ ما بعد کے کسی شخص نے حرف نہیں رکھا۔ آپ کے خطبات موجود ہیں نیز پیچیدہ اور سادہ مسائل کے بارے میں ارشادات بھی۔ کون کہہ سکتا ہے اور کسی معتبر نے کب کہا ہے کہ ظاہری یا باطنی فلاں مفہوم کی ادائیگی سے یہ الفاظ قاصر ہیں۔ تصوف اور علم الکلام کی مصطلحات سب کی سب انہی ارشادات نبویہ سے اخذ کی گئی ہیں ان سے زیادہ فلسفیانہ مفہوم کن مصطلحات میں ہوگا ؟

قرآن حکیم البتہ وضاحت ' تفصیل اور تبیین میں احادیث نبویہ سے بھی بدرجہا زیادہ اعلی پایہ رکھتا ہے۔ ممکن ہے اپنی دعوت شروع کرنے سے پہلے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فطرت لبوبہ کے تحت غور و فکر کرتے ہوں تو آپ کو مصلحانہ خیالات کی ادائیگی میں دقت محسوس ہوتی ہو کیونکہ حقائق و معارف کا اس وقت تک آپ پر نزول نہیں ہوا تھا ، جیسا کہ ارشاد حق ہے "و وجدک ضالا فهدی (اس نے آپ کو حیران و سرگردان پایا تو ہدایت دی) لیکن نزول قرآن اور الہی دستگیری کے بعد کوئی مشکل کیسے باقی رہ سکتی تھی پہلی وحی ہے : ؟

اقرأ باسم ربک الذی خلق۔ خلق الانسان من علق ۔ اقرأ و ربک الاکرم ۔ الذی علم بالقلم ۔ علم الانسان مالم یعلم

پڑھ اپنے پروردگار کے نام سے جس جس نے پیدا کیا ۔ پیدا کیا انسان کو لٹکنے والے گچھے سے ۔ پڑھ تیرا رب بڑا داتا ہے جس نے قلم کے ذریعہ سکھایا ۔ اس نے انسان کو وہ سب کچھ بتا دیا جو وہ جانتا نہیں تھا ۔

اور آخری وحی یہ ہے :

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا ۔

آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمتیں پوری کر دیں اور میری رضا یہ ہے کہ تمہارا دین اسلام رہے ۔

تمام قرآن انہیں دو آیات کے درمیان نازل ہوا ہے ۔ کیا یہ عیاں نہیں کہ جو رفعت ، جو جامعیت اور جو بلاغت و فصاحت روز اول تھی وہی آخر تک قائم رہی ؟ قرآن نے کتاب مبین ہونے کا جو دعوی پہلے دن کیا وہ آج تک قائم ہے ۔ عقلاے دھر عاجز ہیں کہ جو بات جس طرح قرآن میں کہیں گئی ہے اسے کسی طرح دوسری طرح اسی شان سے ادا کر دیں ۔ جو مقصد و مدعا ہو اسی کے مناسب الفاظ و مصطلحات قرآن میں وارد ہوئی ہیں ۔

رہا فلسفہ تو یہ انسانی دماغ کی اختراع اور علوم نبویہ سے سرقہ کیا ہوا طرز فکر ہے چونکہ فلسفیوں کو مشکواۃ نبوت سے استنارت کی توفیق نہیں بلکہ انہوں نے سلسلہ نبوت کے مقابلے میں ایک متوازی جعلی نظام فکر پیدا کرنے کی سعی لا حاصل کی اس لئے یہ لوگ ہر وادی میں بھٹکتے ہیں اور ان کا اختلاف انتہا کو پہنچا ہوا ہے ۔ حتی کہ فلسفے کی مصطلحات کا مفہوم بھی سب کے

نزدیک' یکساں نہیں ۔ اس پر مستزاد یہ ہے بلکہ اسے بھی سلسلہ نبوت کا اعجاز ہی کہنا چاہئیے کہ آج تک کسی فلسفی تصور کو حرف آخر کہنے کی کسی کو جرأت نہیں ہوئی ۔ لہذا اس علم کی مصطلحات میں جامعیت و کمال کی تلاش سعی لا حاصل ہے ۔ وقعت' استحکام اور دوام جس چیز کو ہے وہ علوم نبویہ ہیں اور وحی الہی ہے ۔ محک وحی پر جو بات پوری اترے وہی اصیل ہے ۔ فلسفے میں بھی دلاویز وہی فلسفہ ہے جس کی بنیاد وحی الہی پر ہو اعتراف تابعیت اور فروتنی کے ساتھ ۔

چنانچہ دارالاسلام میں ہزاروں مسلم فلسفی ہر عہد میں گذرے ہیں انہیں قرآنی مصطلحات میں کوئی خامی یا تشنگی محسوس نہیں ہوئی ۔ بلکہ اپنی پیاس انہوں نے قرآنی سلسبیل ہی سے بجھائی ۔ ابن رشد ہوں یا ابن سینا ' فارابی ہوں یا کندی رازی ہوں یا غزالی رحمہم اللہ یہ سب حضرات خیالات و تصورات کے جزوی اختلاف کے باوجود قرآن کریم کے حامل اور اس سے متمیز ہونے کے شیدائی تھے ۔ علم کی راہ میں جو مشکل بھی انہیں درپیش آئی اس کا حل انہیں قرآن کریم ہی میں ملا ۔ اور بالاخر ان کا انجام یہ ہوا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہ لوگ قرآن ہی کے ہو رہے ۔ اب پوچھنا چاہئیے کہ ان فلسفیوں پر قرآن کی لذت کیسے کھلی اور کیوں ۔

ابو نصر فارابی جنہیں مشرق کا سب سے بڑا فلسفی تسلیم کیا گیا ہے عابد زاہد متقی مسلمان تھے اور اسلام کا یہ شرف انہیں ہر شرف سے عزیز تھا انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و

آلہ وسلم کے وہ اشادات جمع کئے تھے جو منطق کی بنیاد ہیں (ابن ابی اصیبعہ ' عیون الانبا فی طبقات الاطباء ' ج ۲' ص ۳۲ ۱ ببعد) -

ابن سینا تمام عالم میں سب سے زیادہ شہرت رکھنے والے فلسفی اور جامع العلوم شخص تھے - انہوں نے سورۂ اخلاق کی تفسیر لکھی ہے جو مطبوعہ ہے اور ان کی وصیت عیون الانباء میں موجود ہے جو انہوں نے اپنے عزیز دوست اور مشہور صوفی حضرت ابو سعید ابوالخیر کے لیے لکھی تھی - اس سے ان کا اپنا مقام معلوم ہوتا ہے (عیون الانباء : ص ۸ تا ۱۰' ج ۲) -

ابن رشد یعنی قاضی ابوالولید محمد بن احمد بن محمد بن رشد کو فقہ ، طب ، تشریح' فلسفہ ، طبیعات اور نفسیات وغیرہ وغیرہ علوم میں امامت کا درجہ حاصل تھا (عیون : ص ۷۵ ج ۲) اور یہی شان حضرت امام فخرالدین رازی کی تھی - رہے امام غزالی تو وہ تعارف سے بالا ہیں -

اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یورپ کے بڑے بڑے فلسفی اپنے موروثی دین سے برگشتہ ہیں اور اپنے کبر و غرور میں نبوت کے اتباع سے بے نیاز - انہیں عہد عتیق اور عہد جدید میں کوئی دلچسپی نہیں بلکہ نطشہ تو عہد جدید کے خلاف شمشیر بران ہے لیکن مسلمانوں میں جو شخص جتنا بڑا فلسفی ہے اتنا ہی زیادہ وہ قرآن کریم کا' شیفتہ اور اس کی تعلیمات کا گرویدہ ہے - فروتنی و انکسار کے ساتھ وہ اس کی تعلیات کا پیرو ہے بلکہ فقہائے اسلام کے مذاهب کا پابند بھی -

خود ہمارے زمانے میں دو فلسفی ہوئے اور وہ دونوں بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں - دونوں کے فلسفی تصورات و ارشادات کو مشرق و مغرب میں احترام و عقیدت کے ساتھ دیکھا جاتا ہے - یعنی حضرت علامہ اقبال اور حضرت علامہ سید ظفر الحسن رحمہم اللہ - دونوں مغرب کی بہترین درسگاہوں کے پڑھے ہوئے اور عظیم ترین فلاسفہ یورپ کے شاگرد ہیں لیکن علامہ اقبال کے فلسفۂ خودی اور دائرۂ فکر کا محور آیت مبارکہ علیکم انفسکم ہے - یا ایہاالذین آمنو علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اھتدیتم (اے اہل یقین! تم اپنی ہی طرف متوجہ رہو - اس طرح گمراہ لوگ تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتے بشرطیکہ تم ہدایت پر رہو [۵:۱۰۸] -

سید صاحب نے ہر اس شے کا وجود "حق" ثابت کیا ہے جس پر "شے" کا اطلاق ہوتا ہو - جو لوگ اشیاء کے وجود کے وہمی ہونے کے قائل ہیں ان کا رد اس حسن کے ساتھ کیا ہے کہ تمام عالم قائل ہو گیا - ان کے فلسفے کی بنیاد یہ آیت مبارکہ ہے : ربنا ماخلقت ھذا باطلا (خدایا تو نے کائنات کو موہوم پیدا نہیں کیا) -

ان دونوں بزرگواروں کا رسوخ فی الاسلام اور کمال یقین ضرب المثل ہے - پھر کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ قرآن میں آخر تک فلسفی تصورات کے اظہار میں خامیاں موجود ہیں - برگساں، جو "زمان" کا صحیح تصور قائم کرنے میں عاجز تھا ، کے فکر کی

کبھی علامہ اقبال نے اس حدیث قدسی کی تلاوت سے سلجھائی تھی -

یسب ابن آدم الدھر و انا الدھر بیدی اللیل و النہار

آدمی زمانے کو برا کہتا ہے حالانکہ زمانہ میں ہی ہوں۔ میرے ہی ہاتھ میں رات اور دن کا نظام ہے -

(بخاری : کتاب الادات، ج ۲، باب لاتسبوالدھر) -

نبی کی زبان سے نکلا ہوا یہ الہی کلام سن کر ہر کسان ششدر رہ گیا کہ نبی‌الامی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے یہ پیچیدہ مسئلہ بھی حل کیے بغیر نہ چھوڑا اور وہ بھی اس تیقن کے ساتھ کہ دھر کو اپنے ساتھ نسبت دی - خالق زمان و مکان کی قدرت کے ظہور میں زمان کا صحیح تصور صرف اسی طرح پیدا کیا جا سکتا ہے -

اس طرح یہ بات یقین محکم کے ساتھ کہی جا سکتی ہے اور مسلمان عقلاء و حکماء کہتے آئے ہیں کہ فلسفی تصورات کے حقیقی خدوخال قرآنی آیات میں ہیں - یہ موزوں الفاظ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی ریاضت سے پیدا نہیں ہوئے جیسا کہ مصنف کہتا ہے - بلکہ حضرت حق جل و علا نے بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے اپنے مقرر اندازے کے مطابق وقتاً فوقتاً نازل فرمائے - وحی الہی میں ارتقاء کا کوئی تصور نہیں - اس کا کمال لم یزل و لا یزال ہے - الفاظ کی موزونیت ارتقائے نفس کی بنا پر نہیں، مضامین کے اعتبار سے ہے - ذہن انسانی میں جن حقائق کے ادراک کی جیسی

خود ہمارے زمانے میں دو فلسفی ہوئے اور وہ دونوں بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ دونوں کے فلسفی تصورات و ارشادات کو مشرق و مغرب میں احترام و عقیدت کے ساتھ دیکھا جاتا ہے۔ یعنی حضرت علامہ اقبال اور حضرت علامہ سید ظفر الحسن رحمہم اللہ۔ دونوں مغرب کی بہترین درسگاہوں کے پڑھے ہوئے اور عظیم ترین فلاسفۂ یورپ کے شاگرد ہیں لیکن علامہ اقبال کے فلسفۂ خودی اور دائرۂ فکر کا محور آیت مبارکہ علیکم انفسکم ہے۔ یا ایہاالذین آمنو علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اھتدیتم (اے اہل یقین! تم اپنی ہی طرف متوجہ رہو۔ اس طرح گمراہ لوگ تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتے بشرطیکہ تم ہدایت پر رہو [۵:۱۰۸]۔

سید صاحب نے ہر اس شے کا وجود "حق" ثابت کیا ہے جس پر "شے" کا اطلاق ہوتا ہو۔ جو لوگ اشیاء کے وجود کے وہمی ہونے کے قائل ہیں ان کا رد اس حسن کے ساتھ کیا ہے کہ تمام عالم قائل ہو گیا۔ ان کے فلسفے کی بنیاد یہ آیت مبارکہ ہے: ربنا ما خلقت ھذا باطلا (خدایا تو نے کائنات کو موہوم پیدا نہیں کیا)۔

ان دونوں بزرگواروں کا رسوخ فی الاسلام اور کمال یقین ضرب المثل ہے۔ پھر کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ قرآن میں آخر تک فلسفی تصورات کے اظہار میں خامیاں موجود ہیں۔ برگسان، جو "زمان" کا صحیح تصور قائم کرنے میں عاجز تھا، کے فکر کی

گتھی علامہ اقبال نے اس حدیث قدسی کی تلاوت سے سلجھائی تھی -
یسب ابن آدم الدھر و انا الدھر آدمی زمانے کو برا کہتا
بیدی اللیل و النہار ہے حالانکہ زمانہ میں
ہی ہوں۔ میرے ہی ہاتھ
میں رات اور دن کا نظام
ہے -

(بخاری : کتاب الادات، ج ۲، باب لاتسبوالدھر) -

نبی کی زبان سے نکلا ہوا یہ الہی کلام سن کر ہر کسان ششدر رہ گیا کہ نبی الامی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے یہ پیچیدہ مسئلہ بھی حل کیے بغیر نہ چھوڑا اور وہ بھی اس تیقن کے ساتھ کہ دھر کو اپنے ساتھ نسبت دی - خالق زمان و مکان کی قدرت کے ظہور میں زمان کا صحیح تصور صرف اسی طرح پیدا کیا جا سکتا ہے ۔

اس طرح یہ بات یقین محکم کے ساتھ کہی جا سکتی ہے اور مسلمان عقلاء و حکماء کہتے آئے ہیں کہ فلسفی تصورات کے حقیقی خدوخال قرآنی آیات میں ہیں ۔ یہ موزوں الفاظ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی ریاضت سے پیدا نہیں ہوئے جیسا کہ مصنف کہتا ہے - بلکہ حضرت حق جل و علا نے بنی نوع انسان کی ھدایت کے لیے اپنے مقرر اندازے کے مطابق وقتاً فوقتاً نازل فرمائے ۔ وحی الہی میں ارتقاء کا کوئی تصور نہیں - اس کا کمال لم یزل و لا یزال ہے ۔ الفاظ کی موزونیت ارتقائے نفس کی بنا پر نہیں، مضامین کے اعتبار سے ہے ۔ ذھن انسانی میں جن حقائق کے ادراک کی جیسی

صلاحیت پیدا ہوتی گئی اسی اعتبار سے کلام بھی نازل ہوا۔

۳۔اسلوب قرآنی بھی ایک معجزہ ہے۔ دنیا کی کسی زبان میں ادب کی کوئی صنف اسلوب قرآنی کو نہیں پہنچتی۔ یہ کتاب ہے لہذا اس کی تدوین کتابی ہے یہ تقریر ہے لہذا اس کا انداز تقریری ہے۔ اسی لیے اسے ''کتاب'' بھی کہا گیا ہے اور ''قرآن'' بھی۔ یہ نثر ہے منظوم اور نظم ہے منثور۔ یہ سجع ہے لیکن غیر مقفی۔ یہ عبارت مقفی ہے لیکن غیر مسجع۔ غرض یہ ہے کہ یہ بدایع اور اچھوتا طرز عبارت دنیا میں نہ پہلے کہیں تھا اور نہ بعد میں کہیں پیدا ہوا۔ اس اعتبار سے بھی زمانے کے ہر دور میں اس کا اعجاز تسلیم کیا گیا۔ ہر آیت جس مضمون کی حامل ہے اسی کی مناسبت سے اس کے الفاظ کی نشست ہے لیکن ہر آیت اپنی سادگی و پرکاری میں سہل ممتنع ہے۔ بادی النظر میں کہنے والا کہہ اٹھتا ہے: لو نشاء لقلنا مثل ھذا (ہم چاہیں تو ہم بھی ایسا کلام کہہ سکتے ہیں) لیکن تیرہ سو برس ہو گئے کوئی پیش کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔ (پروفیسر حکیم علی احمد عباسی)

ضمیمه ۲

(چند مشہور و معروف شعراء کا حال)

امـــرء القیـــس

امرء القیس سبعه معلقات کے سات شعراء میں سے ایک ہے اس کا اصل نام حنه ج بن حجر تھا اور قبیله کننده سے تعلق رکھتا تھا۔ عربی کا یه مشہور شاعر چھٹی صدی میلادی میں ہو گزرا ہے۔ اس کا خاندان یمن سے هجرت کرکے آیا تھا - نجد میں اس کے باپ کی ایک ریاست تھی جو بعد میں زوال پذ ہو گئی - اسے اس کے والد نے ایک عشقیه قصیده لکھنے کی بناء پر گھر سے نکال دیا تھا بلکه یه بھی کہا جاتا ہے که حجر نے اپنے ملازم ربیع کو اسے قتل کروانے کا حکم بھی دے دیا تھا لیکن اس نے اس کی بجائے ایک گوزن بچه ذبح کیا اور اسی کی آنکھیں نکال کر امرءالقیس کے والد کو دکھائیں۔ والد کے مرنے کے بعد اس کی حالت خسته ہو گئی، مارا مارا پھرنے لگا جس کے باعث الملک الضلیل ''آواره بادشاه'' کے نام سے مشہور ہو گیا۔

۵۳۰ع میں قیصر یوسطنیانوس نے اسے ایرانیوں کے خلاف اپنا آله کار بنانے کی خاطر قسطنطیه بلایا۔ پھر سرحد دار کا لقب دے کر فلسطین اور سرحدی قبائل کا والی بنا دیا - لیکن جب وه امر

عہدے کو سنبھالنے کی خاطر ۵۳۰ء اور ۵۴۰ء کے درمیان جا رہا تھا۔ تو انقرہ میں وفات پا گیا۔ عربی روایات کے مطابق آسے یوسطنیانوس نے زہر آلود خلعت فاخرہ پہنوائی جس سے اس کے جسم پر پھوڑے نمودار ہوئے۔ اسی کے سبب اسے ذوالقروح بھی کہا جاتا ہے۔ امرءالقیس کے خلاف قیصر کی بیٹی سے معاشقہ کا الزام تھا۔

امرءالقیس ہی نے سب سے پہلے عربی اشعار کو مقررہ قواعد کے تابع بنایا اور قافیے کے معین اصول وضع کیے۔ اس نے قدیم عربی قصیدے میں لئے رسا پیدا کرکے اس میں ایک نئی روح پھونک دی۔ وہ ایک آزاد خیال آدمی تھا۔

امرءالقیس کا ایک قصیدہ معلقات میں موجود ہے جس کے مختلف زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔

ابــــوتمــــام

اصلی نام حبیب، والد کا نام اوس اور کنیت ابوتمام تھی۔ وہ مامون و معتصم کے زمانے میں ایک مشہور شاعر اور منتخب نویس ہو گزرا ہے۔ ابوتمام دمشق کے قریب ایک گاوں جاسم میں عیسائی تھا ۱۸۰ یا ۱۸۸ھ (۷۹۶ یا ۸۰۴ء) کو پیدا ہوا ابوتمام الطائی کی نسبت سے مشہور ہے۔ اس نے اپنی زندگی کا کچھ ابتدائی حصہ دمشق میں بھی گزارا جہاں اس کا والد شراب کی دکان کیا کرتا تھا اور وہ خود بطور معاون نساج (نورباف) کے وہاں کام کیا کرتا تھا۔ پھر وہ حمص چلا گیا۔ یہاں وہ اپنے

عربی بنو عبدالکریم کے مفاد کی خاطر عتبہ بن ابی عاصم کے خاندان کی ھجو لکھتا رھا ۔ تب وہ مصر چلا گیا جہاں پہلے وہ جامع مسجد میں پانی فروخت کرکے گزراوقات کرتا رھا ۔ اس کے ساتھ ھی اسے عربی ادب بالخصوص علم شعر پڑھنے کا موقع ملا ۔ مامون کے دربار میں کچھ رسائی حاصل کرنے کے بعد وہ موصل چلا گیا جہاں اس نے زندگی کا بیشتر حصہ گزار دیا ۔ ابوتمام معتصم کے دربار میں رسائی حاصل کرنے میں نسبتۂ زیادہ کامیاب رھا جس نے اس کی مدح سرائی کی کماحقہ داد دی بلکہ اسے اپنے ساتھ سہات پر بھی ھمراہ لے گیا ۔ ابوتمام کو معتصم کے بیٹے، اور جانشین الواثق کی پذیرائی بھی حاصل رھی ۔

درباری امراء میں سے اس کے ممدوحین حسب ذیل امراء، وزراء اور والی رہے ھیں : احمد بن ابی داود ، محمد الزیات افشین ابوسعید محمد بن یوسف ، ابودلف الاعجی، جعفر الخیاط ، عبداللہ بن طاھر، مالک بن طوق ، الحسن بن سہل ، الحسن بن رجا ، حسن بن وھب ، خالد بن یزید الشیبانی ۔ حسن بن وھب نے اسے موصل کا صاحب البرید مقرر کیا اور وہ یہاں دو سال کے قیام کے بعد قریباً ۲۳۱ھ = ۸۴۵-۴۶ع میں فوت ھوا ۔ اس کی قبر بھی اس شہر کے باھر کافی دیر تک موجود رھی ۔

نابغـــہ ذیبانی

نابغہ ذیبانی دور جاھلیہ کا ایک مشہور شاعر ھو گزرا ہے ۔

اس کا اصل نام زیاد بن معاویہ تھا اور قبیلہ ذبیان سے تعلق رکھتا تھا ۔ اس کا زمانہ پیغمبر اسلام کی بعثت سے نصف صدی قبل ہے اور اشاعت اسلام سے تھوڑی مدت پہلے وفات پا گیا ۔ بعض مستشرقین اس کی تاریخ ولادت ۵۳۵ بتاتے ہیں اور پادری شیخو نے اس کی تاریخ وفات ۶۰۴ بتائی ہے لیکن یہ تاریخیں مستند نہیں ہیں ۔

نابغہ کے لقب سے مشہور ہونے کے متعلق متعدد روایات ہیں ۔ بعض روایات کے مطابق تو اس نے اپنے ایک شعر میں نابغ استعمال کرنے کی بنا پر یہ لقب پایا اور بعض روایات کے مطابق اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس نے شعور زندگی کے بعد شعر کہنا شروع کیا یا مختصر یہ کہ اس کا کلام ایسا ہے جیسے چشمہ بہہ رہا ہو ۔

نابغہ ذبیانی کے خاندان کے متعلق ہمیں معلومات حاصل نہیں ہیں ۔ اس کی تاریخ پیدائش بھی ابن قتیبہ اور کتاب الاغانی کے بیان کے مطابق مشکوک ہے ۔ اس کے بچپن اور جوانی سے متعلق بھی کچھ معلوم نہیں ہے ۔ نابغہ ذبیانی الحیرہ کے لخمی بادشاہوں کے درباریوں میں شامل ہوا ۔ شاہ منذر ثالث اور شاہ منذر رابع کے زمانۂ حکومت میں تو یہ نیم عرب اور نیم ایرانی عیسائی شہر ایک اہم ادبی مرکز بنا ہوا تھا ۔

نابغہ ذبیانی نے انہیں دو بادشاہوں کی مدح سرائی کی اور ان سے انعام و اکرام پاتا رہا لیکن اس کی تقدیر نعمان ابو قابوس کے دور حکومت میں عروج پر پہنچی جس کا یہ یار شاطر اور دلپسند گویا بنا ۔ یہ بادشاہ کے ساتھ بے تکلف داد عیش دیا کرتا ۔ اس تقرب سے

دوسرے درباریوں میں حسد پیدا ہوا لہذا اس کے دشمن بالخصوص مرہ بن سعد نے بادشاہ سے اس کے تعلقات کشیدہ کرانے کا تہیہ کیا لیکن وہ اپنے ارادے میں ناکام ہوا ۔ مرہ بن سعد ایک اور موقع کی تلاش میں رہا جو اس کو جلد ہی ہاتھ آیا ۔ کتاب الاغانی کے بیان کے مطابق نابغۃ نعمان کے حرم میں بے تکلف آتا جاتا تھا ایک روز اچانک شہزادی المتجردہ کے کمرے میں داخل ہوا جو اپنے حسن کا جواب نہ رکھتی تھی ۔ حیرت سے گھبرا کر اس نے شاعر کی مسرور آنکھوں کے سامنے اپنے صنم وش جسم کا کچھ حصہ دکھاتے ہوئے پردہ کر لیا اور کچھ دیر کے بعد ہی وہ آپے بدل سکی لیکن اب پردہ بے سود تھا ۔ نابغہ نے اس کے حسن سے متاثر ہو کر ایک نظم لکھی جو اس نے اپنے دشمن المرہ بن سعد کو سنا دی ۔ مرہ نے جلدی سے نعمان کو خبر کر دی جس نے غصہ میں آ کر نابغہ کو تباہ و برباد کرنے کی ٹھان لی ۔

ایک دوسری روایت یہ ہے کہ جب نابغہ شہزادی ، بادشاہ اور ایک دوسرے شاعر منخل الیشکری کی معیت میں بیٹھا ہوا تھا نعمان نے نابغہ سے المتجردہ کے بارےمیں کچھ کہنے کی فرمایش کی ۔ نابغہ نے فوراً تعمیل کی اور تھوڑی دیر پہلے کی لکھی ہوئی نظم سنا دی ۔ منخل نے جو شہزادی کا عاشق کہا جاتا تھا حیران ہو کر کہا کہ حضور یہ بیان تو چشم دید ہے ۔ اس کے بعد شاعر کے عروج کے دن ختم ہونے کو تھے ۔ نابغہ اپنے دوست عصام کی معرفت خبر پا کر فرار ہوا اور شاہ غسان کے ہاں پناہ گیر ہوا ۔

یہ روایتیں مجموعی طور تقریبا موضوع معلوم ہوتی ہیں اور ان سے مقصود نابغۃ کی بیعزتی اور تحقیر و توہین ہے ۔ طہ حسین نے اپنی کتاب میں ان روایات کی تردید کی ہے بلکہ اس کے بر عکس وہ اس قصیدے کی بنا پر یہ ثابت کرتا ہے کہ شاہ غسان نے نابغۃ کے ذریعے اچھی شہرت حاصل کر لی اور شاعر نے مدح سرائی کرتے ہوئے اظہار تشکر کیا جو نعمان کے کانوں پڑا اور اس کی بنا پر نعمان کی بربادی کا قصد کیا ۔

نابغۃ بہر حال شاہان غسان سے غیر معروف نہ تھا ۔ شاہ الحارث بن ابو شمار اور الحارث الاصغر نے نابغۃ کی اچھی خوش آمد کی ۔ اول الذکر نے اس کی درخواست پر جنگ حلیمہ میں گرفتار شدہ بنو اسد کے کئی قیدی رہا کر دئیے ۔ موخر الذکر نے بھی جنگ عین اماغۃ میں اس کی درخواست پر بنو اسد اور بنو فزارۃ کے کئی قیدی رہا کر دئیے ۔ ان کوائف کے پیش نظر ہم نابغۃ کی سیاسی سرگرمیوں کے متعلق بھی کچھ کہنے پر مجبور ہیں ۔

نابغۃ اپنے قبائل سے جنگ کے دوران میں اپنے افراد قبائل اور حلیفوں کے مفاد سے کبھی بے تعلق نہ رہا ۔ اس کے ثبوت میں ہم قبائل اور بنوغسان کے درمیان نابغۃ کی مداخلت کا ذکر کر چکے ہیں ۔ عبس اور ذبیان کے درمیان مشہور جنگ داحس کے دوران میں بنو اسد اور بنو تمیم کے درمیان معاهدۂ اتحاد صرف نابغۃ کی ہی خاص حزم و احتیاط کا نتیجہ تھا ۔ اس کے بعد بھی نابغۃ نے کئی مرتبہ اپنی سیاسی مصروفیتوں اور سرگرمیوں کا ثبوت دیا ۔

شاہ غسان کے دربار میں نابغہ عمر و بن حارث اور پھر اس کے جانشین نعمان کی عنایات کا مورد توجہ رہا۔ چنانچہ وہ عمر و بن حارث کی سخاوت کو اپنے ایک قصیدے میں بڑے اظہار تشکر و امتنان سے سراھتا ہے۔ اس کے علاوہ نعمان کی موت پر اس کا مرثیہ گہرے جذبات و اثرات کی غمازی کرتا ہے۔

غسانی دربار میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کے باوجود نابغة الحیرہ اور شاہ حیرہ کی طرف مائل تھا۔ لہذا نعمان بن حارث ابو کریب کی موت پر نابغة نے حیرہ جاکر المنذر کے بیٹے کے ھاں دوبارہ جاکر مورد عنایات ھونے کا فیصلہ کیا۔

نعمان کی علالت کا سن کر وہ بادشاہ کے دوست دو فزاریوں منثور بن زبان اور سیار ابن عمرو کے ساتھ روانہ ھوا۔ جب وہ حیرہ پہنچے تو نعمان صحت یاب ھو چکا تھا۔ اپنے دو دوستوں کی آمد کا سن کر نعمان نے ان کی خاطر خیمہ نصب کرایا اور ان کی خاطر تواضع کے لیے ایک مغنیہ بھیج دی۔ نعمان خود بھی اکثر ان کے پاس جاتا تھا۔ ایک شام جب کہ محفل میں مغنیہ نے نابغة کا قصیدہ پڑھا بادشاہ نے خوش ھو کر کہا کہ بڑی اچھی نظم ہے۔ فزاریوں کو نابغہ کی حمایت کا موقع ھاتھ آیا اور سخی بادشاہ نے نابغة کو بخش دیا۔ کچھ دیر بعد نعمان ساسانی بادشاہ کسری پرویز کے حکم سے موت کے گھاٹ اتارا گیا کیونکہ اس نے اپنی ایک رشتہ دار عورت کو اس کی زوجیت میں دینے سے انکار کر دیا تھا۔ نابغة نے اپنے مربی پر

ماتم کیا اور پھر اپنے قبیلہ میں لوٹ آیا ۔ ہمیں اس کی تاریخ وفات کے متعلق کچھ علم نہیں ہے ۔

ڈیبنبرگ کے بیان کے مطابق نابغۃ ذبیانی مذھباً توحید پرست تھا ۔ شہادت کے طور پر مصنف نابغۃ کے چند اشعار پیش کرتا ہے جن میں نابغۃ نے خدا کا ذکر کیا ہے لیکن شیخو اس کو عیسائی خیال کرتا ہے ۔ درحقیقت نابغۃ بے دین تھا اور عیسائیت سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا ۔

نابغۃ قدیم عرب شعراء میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے اور اس کا شمار درجہ اول کے شعراء میں ہے ۔ ہم اس میں دو خاصیتیں ایسی پاتے ہیں جو کسی شاعر کو بڑا بناتی ہیں ۔ حساسیت اور تخیل ۔ خلوص احساس پر اس کی شان تخیل اور شوکت اظہار اسے دوبالا کرتے ہیں ۔ نابغہ میں الفاظ ، خیالات ، احساسات ، محاورہ ، مواد اور شکل اپنے مکمل توازن کے ساتھ موجود ہیں ۔ اس کی ھجو اکثر تلخ ، طنز آمیز اور تکلیف دہ ہوتی ہے ۔ اس کے علاوہ اسے شاعری کے دوسرے اوصاف بھی بکمال و تمام حاصل ہیں ۔

ذوالرمۃ

ذوالرمۃ قبیلۂ بنو عدی کا ایک مشہور شاعر ہو گزرا ہے ۔ اس کا اصلی نام غیلان بن مسعود تھا ۔ جریر اور فرزدق کا معاصر تھا اور فرزدق کی حمایت کرتا تھا ۔ اس شاعر نے امرء القیس کی بھی ھجو کی ہے ۔ ابو موسیٰ اشعری کے پوتے بلال بن ابی بردہ کی مدح

سرائی کا شرف بھی حاصل ہے ۔

ذوالرمۃ کی عشقیہ نظمیں پہلے ایک بدویہ عورت میۃ کے نام منسوب ہوتی تھیں ۔ ان دونوں میں محبت کا عہد و پیمان تھا ' لیکن جب بعد میں میۃ نے اپنے خاوند کے کہنے سے ذوالرمۃ کے جام محبت کو ٹھکرا دیا تو کہا جاتا ہے کہ ذوالرمۃ نے خرخاء کو مورد توجہ بنا لیا ۔

ذوالرمۃ کی وفات سے متعلق متعدد روایات مشہور ہیں ۔ ابن خلکان نے اس کی تاریخ وفات ۱۱۷ھ بتائی ہے ۔ کسی دوسری جگہ ۱۰۱ھ دی ہے ۔ صاحب کتاب الاغانی اس کی وفات خلیفہ عبدالملک کے زمانہ میں بتاتا ہے لیکن یہ تاریخیں بعض قرائن و شواھد کی بنا پر غلط معلوم ہوتی ہیں ۔ اس بات پر سب مورخ متفق ہیں کہ ذوالرمۃ عین عنفوان شباب یعنی ۴۰ سال کی عمر میں وفات پا گیا اور بصرہ کے قریب ہی ایک صحرا میں دفن ہوا ۔ ذوالرمۃ کی صحرا میں تدفین ایک افسانہ معلوم ہوتا ہے ۔ ذوالرمۃ عادت و اطوار' خیالات ومقاصد اور کم از کم طرز نگارش کے لحاظ سے بالکل ایک بدوی معلوم ہوتا ہے ۔ بعض نے اسے امرء القیس کا ہم مرتبہ مانا ہے اور آخری رجز گو شاعر متصور ہوتا ہے ۔

الاعشی

الاعشی ابو بصیر میمون بن قیس البکری دور جاھلیہ اور دور اسلام کا ایک مشہور عرب شاعر ہو گزرا ہے ۔ یہ شاعر قبیلہ

قیس بن تعلبہ سے تعلق رکھتا ہے - دوسرے عرب شعراء سے اسے ممتاز کرنے کے واسطے اسے اعشی الکبیر بھی کہتے ہیں -

اس شاعر کی تاریخ ولادت معلوم نہیں' البتہ اس کی وفات تقریباً ٦۲۹ ع میں واقع ہوئی - اس شاعر کے متعلق یہ بھی مشہور کہ اس نے نبی علیہ الصلواۃ کی مدح میں بھی نعت لکھی تھی لیکن اس کے با وجود مشرف بہ اسلام نہیں ہوا - امرء القیس سے دوسرے درجہ پر عرب شعراء میں الاعشی ہی کا شمار ہے کہ جس نے اپنی دنیا کی اکثر حصہ کی سیر و سیاحت کی - اس لیے اس کے کلام میں غیر زبانوں کی تلمیحات اور غیر زبانوں کے الفاظ بلخصوص فارسی الفاظ مستعمل ہیں -

ابو الاسود

ابو الاسود ظالم بن سفیان دئلی قبیلہ دیل کا ایک شاعر ہو گزرا ہے - اس نے نذیلیوں کے ہاں رہنے کی خاطر یہ قبیلہ چھوڑ دیا تھا - وہ کچھ دیر بنو قشیر کے ساتھ بھی رہے - ابوالاسود حضرت علی کے حامیوں میں سے تھا - اسی کو حضرت علی نے مصالحت کرانے کی غرض سے حضرت عائشہ ' طلحہ اور زبیر کے پاس بھی بھیج دیا تھا - جنگ صفین میں بھی اس نے حصہ لیا - ابوالعباس کے دور ولایت میں ابوالاسود دئلی بصرہ میں ایک اہم عہدہ پر فائز تھے - یوں ابوالاسود کچھ زیادہ خوشحال نہ تھا - دوسرے عربوں کی طرح یہ بھی حاشیہ نشین قسم کے اور چاپلوس لوگوں سے نفرت کرتے

تھی - بیان کیا جاتا ہے کہ آپ ۹۸ھ میں ۸۰ سال کی عمر پا کر ہیضہ سے وفات پا گئے - یہ بھی محض ایک کہاوت ہے کہ آنھوں نے صرف ونحو کے قواعد کی بنیاد ڈالی -

المتنبی

متنبی کا اصل نام ابوالطیب احمد بن الحسین تھا اور متنبی کے نام سے اس لیے مشہور ہوا کہ اس نے بادیہ کاویہ میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور معجزہ کے طور پر اپنا کلام پیش کیا تھا - اس لیے اس کا نام متنبی یعنی جھوٹا مدعی نبوت مشہور ہوگیا - یہ مشہور شاعر ۳۰۳ ھ میں کوفہ کے ایک محلہ کندہ میں پیدا ہوا ا اس نسبت سے وہ کندی بھی کہلاتا ہے اور قبیلہ جعف سے تعلق رکھنے کے باعث جعفی کے لقب سے بھی مشہور ہے -

متنبی نے ابتدائی تعلیم اپنے ھی شہر میں پائی اور اپنی ذہانت ، بیدار مغزی اور پیش از وقت اپنی شاعرانہ استعداد کے ظہور کے باعث مشہور و ممتاز ہوگیا - خدا نے متنبی کو بلا کا حافظہ دیا تھا - بعد میں چل کر متنبی کے فلسفیانہ معتقدات کی نشوونما زیدی شعبیوں کے زیر اثر ہوئی - یہ وہ زمانہ تھا جب قرامطہ کی تحریک زوروں پر تھی اور سارا ملک ان کی فتنہ پردازیوں کی آماج گاہ بنا ہوا تھا - عرب بدویوں کی زندگی کے ساتھ متعلق رہنے کے باعث متنبی کو عربی زبان کا گہرا علم حاصل ہوا جس پر وہ فخر کیا کرتا تھا -

۳۱۲ھ میں جب قرمطیوں نے کوفہ فتح کرنے کے بعد اسے خوب غارت کیا تو وہ دو سال تک ساوہ میں مقیم رہا - اس علاقہ اور لواح کے قرمطیوں کی توجہ کا مورد ررھا - معلوم ھوتا ھے کہ شاید متنبی کا فرقہ ملاحدہ کے ساتھ کچھ اختلاط پیدا ھو گیا ھو - پھر کوفہ واپس آنے کے بعد اس نے ھمہ تن ھو کر شعر و شاعری کا مشغلہ اختیار کیا اور مختلف مربیوں کی مدح سرائی کرتا رھا - اس کی ساری تصنیفات میں رواقی اور قنوطی عقائد کی غمازی موجود ھے - اس میں اپنی ذھنی فوقیت کا شعور بدرجہ اتم موجود تھا اس نے مشہور اکابر علمای ادب مغل الزجاج اور ابن السراج، ابوالحسن، الاخفش، ابن درید اور بو علی فارسی وغیرہ سے استفادۂ علم کیا -

متنبی کی خاص بات یہ تھی کہ وہ ھر ممدوح سے کسی بات پر ناراض ھو کر دوسرے ممدوح کے پاس چلا جاتا - چنانچہ وہ پہلے امیر سیف الدولہ کا مداح رھا، پھر اس نے کافور اخشیدی کی مدح کی - کافور سے اس کو کسی علاقہ کے گورنر بننے کی امید تھی - نا امید ھونے پر اس کی ھجو کرنے کے بعد بھاگ گیا - پھر ارحان میں جا کر ابن العمید کا مداح رھا اور پھر اس کے بعد شیراز میں عضد الدولہ کے ھاں رھا - اس کی شاعری پر ابو تمام اور بحتری کا اثر غالب نظر آتا ھے -

متنبی صرف شاعر ھی نہ تھا بلکہ اس کا ذھن سیاسی سرگرمیوں اور انقلابی تحریکات سے بھی بھر پور تھا - چنانچہ الا ذقیہ میں اس نے

قصیدہ خوانی اور مدح سرائی کے فن کو چھوڑ کر ایک انقلابی تحریک کا آغاز کیا اور انہیں داعیات کے زیر اثر اس نے نبوت کا دعویٰ بھی کر دیا لیکن اخشیدی فوج نے اسے فوراً گرفتار کر لیا اور دو سال حمص میں قید رہنے کے بعد توبہ کرنے پر رہا کر دیا۔ اس کے علاوہ اس کے دیوان کی نظمیں بھی اس کے سیاسی سرغنہ ہونے پر دلالت کرتی ہیں لیکن افسوس کہ سیاسی ناکامیوں کے بعد اس نے شعر میں ہی اپنی اقتدار پسند خوابوں کی تعبیر دیکھی۔

متنبی کی موت کا واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ جب وہ بغداد کو واپس جا رہا تھا تو دیر العاقول میں بدویوں نے اس پر حملہ کر دیا اور اسے بچوں سمیں موت کے گھاٹ اتارا۔ یہ واقعہ رمضان ۳۵۴ھ میں ہوا۔ اس کا سارا سامان لوٹ لیا گیا۔

متنبی نے ایک دیوان مرتب کیا جو دیوان متنبی کے نام سے مشہور ہے۔ اس کتاب میں شاعر نے اپنی شاعرانہ جولانیاں دکھائی ہیں۔ اب اس کتاب کو ہندوستان، پاکستان، ایران اور افغانستان وغیرہ میں بطور درس پڑھایا جاتا ہے۔ اس کے اس دیوان کی شرح ابن جنی اور بعد میں ابو العلا الواحدی، التبریزی، العبکری اور ابن سیدہ نے لکھی ہے۔ بعد کی شاعری کا اگر متنبی کی شاعری سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بعد کی شاعری اس شاعری سے کافی حد تک متاثر ہوگئی ہے۔

لبید رضی اللہ عنہ

زمانۂ جاہلیت کے مشہور شاعر تھے۔ پھر عہد نبوت ہی

میں اسلام لے آئے تھے - مرزبان نے اپنی معجم میں تذکرہ کیا ہے کہ جب حضرت فاروق اعظم نے عامل کوفہ کو فرمان بھیجا کہ لبید اور اغلب عجلی سے یہ دریافت کیا جائے کہ اسلام لانے کے بعد انہوں نے کتنے اشعار کہے ہیں تو حضرت لبید نے فرمایا "مجھے اللہ نے شعر کے بدلے سورۂ بقرہ اور آل عمران عطا فرما دی ہیں" - اس پر حضرت فاروق نے ان کے وظیفے میں اضافہ کر دیا - کہا جاتا ہے آپ نے اسلام لانے کے بعد صرف ایک ہی شعر کہا ہے :

ما عاتب المرء اللبيب كنفسه
والمرء يصلحه الجليس الجابس الصالح

"سمجھدار آدمی کو اس کے نفس سے زیادہ ملامت کرنے والا کوئی نہیں اور آدمی کو اچھی صحبت اچھا بنا دیتی ہے"۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اسلام میں انہوں نے جو شعر کہا تھا وہ یہ ہے :

الحمد لله اذا لم يأتنى اجلى
حتى لبست من الاسلام سربلا

"خدا کا شکر ہے مجھے اس وقت تک موت نہ آئی جب تک میں نے اسلام کی قمیص زیب تن نہ کر لی"۔

اسلام لانے کے بعد اول آپ اپنی قوم میں تشریف لے گئے، پھر کوفہ وطن بنا لیا اور وفات تک وہیں رہے - آپ کی وفات ۴۱ھ میں ہوئی اور ایک سو پنتالیس برس کی عمر میں پائی - پچپن برس

اسلام میں گزرے اور نوے برس جاهلیت میں۔ میں کہتا هوں (یعنی امام ابن حجر عسقلانی) کہ در اصل اسلام میں آن کی عمر کے صرف تیس برس گزرے یہ اور بات ہے کہ دو ایک برس کا فرق هو البتہ اگر ان کی وفات کا سن ساٹھ اور کچھ تسلیم کیا جائے جیسا کہ بعض لوگوں نے کیا ہے تو پھر پچپن برس کے قریب هو جاتے هیں۔

ابو عمر کا قول ہے کہ " الحمد لله ا ذ لم یأتنی اجلی" والا شعر لبید کا نہیں بلکہ قردہ بن نفاثہ کا ہے۔

لبید کے اشعار میں ان کا وہ قصیدہ بہت مشہور ہے جس کا پہلا مصرعہ ہے: الا کل شیٔ ما خلا الله باطل۔

احادیث سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ثابت ہے کہ سب سے سچی بات جو کسی شاعر نے کہی ہے وہ لبید کا یہ مصرعہ ہے۔ ابو عمر کا بیان ہے کہ پورا قصیدہ ظاهر کرتا ہے کہ لبید کا یہ قصیدہ اسلام لانے کے بعد کا ہے کیونکہ اس کا ایک شعر یہ بھی ہے۔

وکل امرء یوما سیعلم سعیہ
اذا کشفت عند الله ماحصل

"هر شخص اس دن اپنی تگ و دو کی ماهیت سمجھ لے گا جس دن اللہ کے نامۂ اعمال کے جزئیات کھولے جائیں گے"۔

میں کہتا هوں (یعنی امام ابن حجر عسقلانی) کہ در اصل یہ شعر دلیل ہے اس بات کی کہ حضرت لبید رضی اللہ تعالیٰ عنہ

بھی جاھلیت کے دوسرے عقلاء کی طرح بعث بعد موت کے قائل تھے جیسا کہ حضرت قسی بن ساعدہ اور زید بن عمرو۔

تعجب ہے ابو عمر پر یہ بات کیسے پوشیدہ رہی حالانکہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ اور لبید رضی اللہ عنہ کا قصہ مشہور ہے کہ جب لبید نے اپنا یہی قصیدہ قریش کے سامنے پڑھا اور اس شعر پر آئے : الا کل شئی ما خلا اللہ باطل (ہر چیز سوائے اللہ کے باطل ہے) تو حضرت ابن مظعون نے فرمایا بالکل سچ لیکن جب انہوں نے دوسرا مصرع پڑھا : و کل نعیم لا محالۃ زائل (اور ہر نعمت بہر حال زائل ہونے والی ہے) تو حضرت ابن مظعون نے فرمایا "جھوٹ ! جنت کی نعمت زائل ہونے والی نہیں"۔ اس پر لبید کو غصہ آ گیا اور قریش بھی تلواریں بے نیام کرکے جھپٹ پڑے ۔ گویا یہ واقعہ لبید کے زمانۂ جاھلیت کا ہے ۔

مدائنی نے ابو معشر کی سند سے یزید ابن رومان وغیرہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ بنو کلاب کا جو وفد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہؤا تھا اس میں لبید بھی تھا ۔

ابن مندہ اور سعدان بن نصر نے اپنی قواعد کی دوسری کتاب میں ھشام بن عروہ کی روایت بیان کی ہے جو ان کے والد حضرت عروہ نے بیان کی کہ حضرت عائشہ صدیقہ نے فرمایا "خدا لبید پر رحم فرمائے کیا شعر کہا ہے :

ذھب الذین یعاش فی اکنافھم
و بقیت فی خلف کجلد الاجرب

"وہ لوگ گزر گئے جن کے سایہ عاطفت میں زندگی بسر ہوتی تھی اور جو باقی رہ گئے وہ خارش کردہ اونٹ کی جلد کی مانند ہیں" ۔

المقـــدسی

شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن ابی بکرالبناء السامی المقدسی المعروف به البشاری کے نام سے ظاہر ہے کہ وہ بیت المقدس کے کسی خاندان میں سے تھا ۔ یاقوت اس کا حوالہ ہمیشہ البشاری کے نام سے دیتا ہے ۔ المقدسی کا لقب بھی ہمیں سپرنگر کی سند سے پہنچا ہے جو اس کی تصنیف کا ایک مخطوطہ ہندوستان سے برلن میں لائے تھے اور انہیں نے سب سے پہلے یورپ کو اس مصنف سے آشنا کرایا ۔

مصنف کی زندگی کے حالات اس کی اپنی تفسیر ہی کے متن میں ملتے ہیں ۔ اس کا دادا ابوبکر البناء فلسطین میں میر عمارت تھا اور ۳۵۶ھ (۹٦٦ع) میں المقدسی مکہ معظمہ میں تھا ۔ اس وقت اس کی عمر کوئی بیس برس کے قریب تھی ۔ وہ غالباً کم از کم ایک ہزار عیسوی تک زندہ رہا ہوگا ۔ اس نے ابن طولون کی فرمائش پر شہر عکا کے دروازے تعمیر کرائے تھے ۔ اس کی ماں کا خاندان علاقہ قومس کے شہر بیار سے تعلق رکھتا تھا جہاں سے اس کا نانا ابو طیب بن الشوا بیت المقدس میں ہجرت کرکے آیا تھا ۔

اس نے علم جغرافیہ میں بے نظیر تصنیف کی ہے جس کا نام "احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم" بتایا جاتا ہے ۔ قسطنطنیہ کے نسخہ میں اس تصنیف کا نام "صرف کتاب الاقالیم" درج ہے ۔ یہ کتاب

۳۷۵ھ (۹۸۵ع) میں مکمل ہوئی لیکن اس میں بعد کی تاریخوں کے واقعات بھی درج ھیں اس لیے اس کا سن تصنیف ۳۷۸ھ (۹۸۸ع) معلوم ہوتا ہے۔

اس مصنف کا بیان دوسرے قدیم جغرافیہ دانان اسلام سے زیادہ مفصل اور صحیح ہے۔

الیعـــقو بـــی

احمد بن ابی یعقوب بن جعفر بن وھب بن واضح الکاتب العباسی عرب مورخ اور جغرافیہ نویس ہے جو صالح اور بعد میں اس کے والد خلیفہ المنصور کا مولی تھا اور اسی سے یہ خاندان العباسی کہلاتا ہے۔ اپنے مورث کی طرح جو مصر کا والی تھا اور ادریس بن عبداللہ کو الفخ میں ۱٦۹ھ (٦۸۵ع) میں شکست کھانے کے بعد پناہ دینے کے باعث جان سے مارا گیا۔ الیعقوبی بھی امامیہ معتدل موسوی فرقہ کا شیعہ تھا۔ اس نے اپنی جوانی آرمینیہ میں اور خراسان میں طاہریوں کی ملازمت میں گزاری جن کے کارناموں کا ذکر اس نے ایک خاص کتاب (۲ : ۵۳۷ سطر ۵) میں کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنی تاریخ عالم جس میں ۲۰۹ھ=۸۷۲ع تک کے حالات مرقوم ھیں مشرق ھی کے قیام میں لکھی تھی۔ اس کا آغاز انبیائے بنی اسرائیل کے حالات سے ہوتا ہے، پھر مسیح اور ان کے حواری اور شام و بابل کے حکمرانوں کے واقعات ھیں۔ بعد ازاں هندوستانیوں، یونانیوں اور رومیوں ایرانیوں اور شمالی اقوام بہ شمول اتراک مصریوں بربروں اھل ابی سینا بجا اور حبشیوں اور آخر میں

قبل اسلامی عربوں کے حالات ہیں۔ دوسرے میں جو پہلے سے قریباً
گنا ہے پیغمبر کی ولادت کا ذکر ہے اور ۲۵۹ھ=۸۷۲ع تا
اسلامی تاریخ کے واقعات مذکور ہیں۔ کتاب سے شیعی میلان عیاں
اگرچہ اتنا شدید کبھی نہیں ہوتا کہ اسے کوئی غلط نظریہ پر
کرنے پر ابھارے۔ علاوہ ازیں نجوم کے ساتھ اس کا شغف واضح ہ
ہے کیونکہ وہ ہر عہد حکومت کے آغاز میں بروج و کواکب
صحیح نقشہ دیتا ہے۔

ظاہریوں کے زوال کے بعد الیعقوبی مصر چلا گیا جہاں اس
وفات ۲۸۴ھ=۸۹۷ع میں ہوئی۔ اس نے وہاں ۲۷۸ھ=۸۹۱ع
اپنی جغرافیائی تصنیف ''کتاب البلدان'' لکھی۔

شریف الرضی

نام ابوالحسن محمد بن ابی طاہرالحسینی بن موسیٰ۔ ملسلہ نس
موسیٰ الکاظم کے واسطہ سے حضرت حسین بن حضرت علی رضی
عنہ سے جا ملتا ہے۔ بغداد میں ۳۵۹ھ (۹۷۰ع) میں پیدا ہؤا۔
نے اپنی پہلی نظم پندرہ سال کی عمر میں ۳۷۴ھ میں لکھی۔ ثعا
اور دوسرے مصنفین اسے قریش کا سب سے بڑا شاعر مانتے ہیں
بعض مصائب کی وجہ سے اس کے بال اکیس سال کی عمر ہی میں س
ہو گئے تھے۔ اپنے باپ کے بعد بغداد میں طالبیوں کے لقیب کے ع
پر متعین ہؤا۔ الرضی اور الشریف کے دو القاب حکومت نے عطا کیے
۱۶ محرم ۴۰۳ھ بروز جمعہ امیر کی پوری سلطنت میں آل رس

صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا نقیب مقرر ہوا۔ اتوار کے روز
محرم ۴۰۶ھ (۲۶ جون ۱۰۱۶ع) بوقت صبح وفات پا گیا۔ وز
فخرالملک نے نماز جنازہ اس کی قبر پر پڑھی۔ وہ اپنے مکان
اندر دفن کیا گیا۔ وہ دل آویز سیرت کا مالک تھا اور وسیع العلم
تھا۔

تصانیف: تفاسیر قرآن (۱) معانی القرآن (۲) مجازات القرآ
(جو اب نایاب ہے)۔ اس کے علاوہ اس نے بیشمار نظمیں اور مرا
لکھے جو بہاء الدولہ اور سلطان الدولہ کے نام پر تھے۔ سب
آخری نظم وہ مرثیہ ہے جو اس نے ایک شاعر احمد بن علی البتی
کی وفات پر لکھا۔ اس نے ایک غیر مسلم دوست الصابی کی وفات
پہلے ایک پھر دوسرے مرثیہ میں مزید رنج و الم کا اظہار کیا
کچھ دوسری کتابیں جو اس کے بھائی المرتضی نے لکھیں غلطی
اس کے نام منسوب کی جاتی ہیں۔

ابوبکر محمد بن زکریا رازی

یہ ایک مشہور و معروف طبیب، کیمیا دان اور فلسفی
گزرا ہے۔ وہ ۲۵۰ھ ۸۶۴ع میں رے کے مقام پر پیدا ہوا۔ ا
نے وہاں ریاضیات، فلسفہ، ہیئت اور ادب کا مطالعہ کیا۔ اس نے
کیمیا حاصل کیا اور اس میں خاصا کمال پایا اور اسی کمال
باعث وہ الکیمیاوی مشہور ہے۔ قریباً بڑھاپے کی عمر میں حصہ
طب میں مصروف ہوا اور کمال پیدا کیا۔

سرکاری ملازمت میں داخل ہونے پر پہلے رے اور پھر بغداد کے ہسپتالوں کا افسر اعلی بن گیا ۔ طبیب کامل ہونے کے باعث یہ متعدد درباروں میں یکے بعد دیگرے پہنچتا رہا ۔ آخر اپنے ہی وطن رے میں ۳۱۳ھ یا ۳۲۳ھ میں فوت ہو گیا ۔

اس کے لیم معلوم اساتذہ میں سے علی بن ربن طبری بلخی خیال کیے جاتے ہیں ۔ اس کا مشہور معاصر الحلاج ہوا ہے ۔ اس کے نظریات کا رد فارابی ابن الہیثم علی بن رضوان اور ابن میمون وغیرہ ہم نے کیا ہے ۔

رازی نے طبابت کے شعبہ میں خاص کمال حاصل کیا اور متعدد رسالے اور کتابیں تصنیف کی ہیں مثلاً کتاب الجدری والحصبہ (چیچک اور خسرہ)، منصوری ملوکی اور حاوی (بشکل دائرۃ المعارف طب انسائیکلوپیڈیا آف فزیکس) ۔ طریق علاج میں رازی جدت پسند تھا ۔ اس نے علم کیمیا پر بھی قلم اٹھایا لیکن اس فن کی جملہ کتب ضائع ہو گئیں ۔

فلسفہ ما بعد الطبیعیاتی پر اس نے بھی اپنے نظریات کا اظہار کیا ہے ۔ فلسفہ میں دھری ابو بکر حسین التمار المتطبب ثابت بن قرہ مسعودی احمد بن الطیب السرخسی کا شاگرد کندی اس کے مخالف نظر آتے ہیں ۔ حصول کمال سے پیدا شدہ عجب و فخر کی بنا پر اپنے تمام متقدمین پر اپنی فوقیت محسوس کرتا ہے لیکن ساتھ ہی وہ نظریۂ ارتقاء کا بھی قائل ہے کہ اس کے بعد آنے والے بھی حصول کمال میں اس سے سبقت لے جا سکتے ہیں ۔

الخوارزمی

اس کا پورا نام ابو عبداللہ محمد بن یوسف ہے ۔ اس کی پیدائش بلخ میں ہوئی اور چوتھی صدی ھجری کے نصف آخر میں ہو گزرا ہے ۔ اس کی کتاب مفاتیح العلوم کو اسلامی ادب میں پہلی دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا) کی قسم کی کتاب سمجھا جاتا ہے ۔ اس کتاب کو اس نے ایک وزیر کے نام منسوب کیا تھا ۔ اسے مشرق کے حالات سے خوب واقفیت حاصل تھی ۔ مختلف مباحث کے لیے یہ کتاب بڑی مستند حیثیت رکھتی ہے ۔ خوارزمی نے ریاضیات کے فن میں یونانی مصنفین سے بھی استفادہ کیا ہے جن میں اقلیدس، نکوما کولسی، ہیرون اور فلپ وغیرہ ہم مشہور ہیں ۔

پوری تصنیف دو مقالوں پر مشتمل ہیں ۔ ایک مقالہ میں شریعت اور متعلق علوم فقہ، کلام ، ۔ عروض، تاریخ سے بحث کی ہے ۔ اور دوسرے مقالہ میں طب، منطق، حساب، ہیئت، هندسہ، موسیقی، اور الکیمیا وغیرہ ایسے فنون پر مباحث درج ہیں ۔ اس کی صحیح اور متعین تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات معلوم نہیں ہے ۔

التنوخـــی

نام ابوعلی المحسن۔ ایک عرب مصنف جو ۹۳۹ع میں یا (بقول یاقوت) ۹۴۰—۹۴۱ء میں پیدا ہوا ۔ بصرہ کے ایک فاضل قاضی کا بیٹا تھا ۔ ابتدائی تعلیم الصولی اور ابوالفرج الاصفہانی وغیرہ سے بصرہ ہی میں پائی ۔ بعد ازاں بغداد اور پھر اھواز میں قاضی کے عہدے

پر متعین ہؤا - ۹۶۶-۷۰ع میں وزارت کی تبدیلی کی وجہ سے تین سال تک عہدہ سے معزول رہا اور جائداد بھی ضبط ہو گئی ' لیکن پھر بحال ہو گیا - ۹۹۴ع میں بغداد میں اس کا انتقال ہؤا - مرنے سے قبل قید و بند کی مصیبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں -

تصانیف : ایک دیوان جو اب نایاب ہے - قصے کہانیوں کے تین مجموعے :

(۱) کتاب نشوار المحاضرہ و اخبار المذاکرہ -

(۲) المستجاد من فعلات الاجواد -

(۳) الفرج بعد الشدۃ -

فـــــردوســـــی

(ابوالقاسم) اصل نام منصور یا احمد یا حسن (وثوق سے نہیں بتایا جا سکتا) - غالباً ۳۲۰ھ (۹۳۲ع) میں طوس (خراسان) کے محلہ طابران میں پیدا ہوا اپنے ہم وطن اسدی سے تعلیم پائی - باپ سے ایک مختصر سی جاگیر ورثہ میں پائی جس پر شریفانہ گزر اوقات ہوتا رہا - دولت شاہ نے اس کا سال وفات ۴۱۱ھ (۱۰۲۰-۲۱ع) بتایا ہے - اسے طوس کے قریب اس کی اپنی مملوکہ ایک قطعۂ زمین میں دفن کیا گیا - چونکہ عام طور پر اسے ملحد سمجھا جاتا تھا اس لیے اسے مسلمانوں کے قبرستان میں جگہ نہ ملی -

تصانیف : فردوسی ایک رزم گو فارسی شاعر تھا - اسے مشہور عالم قومی رزمیہ موسوم بہ ''شاھنامہ'' لکھنے کا شرف حاصل ہے -

مثنوی یوسف و زلیخا بھی اس نے لکھی تھی -

ہمذانـــی

نام ابوالفضل احمد بن حسین بن یحیی بن سعد بن بشرالمخاطب به بدیع الزمان - شاعر اور انشاءنویس - ہمذان میں ۳۵۸ھ میں پیدا ہوا - یہیں احمد بن فارس النحوی اور دیگر اساتذہ سے تعلیم پائی - ۳۸۰ھ میں ری میں ابن عباد کا تقرب حاصل رہا - پھر جرجان میں ابو سعید محمد بن منصور نے اس کی سر پرستی کی - نیسا پور میں لوٹا پھوٹا پہنچا اور ابوبکر خوارزمی سے مقابلہ ہوا - کافی شہرت حاصل ہوئی - دوسرے سال خوارزمی مر گیا اور اس کا مرتبہ اور بلند ہو گیا - اس کے بعد اس نے الحسین بن محمد الکشاجمی کی بیٹی سے شادی کر لی اور ۳۹۸ھ میں وفات پائی -

تصانیف : ''مقامات'' ایسے مضامین کا مجموعہ جن میں مذہبی مناظرے، مواعظ منظوم معمے، اور ان کے علاوہ سائلوں کے مختلف ہتھکنڈے شامل ہیں - مجموعہ رسائل (کل ۲۳۳ رسالے) جو نجی خطوط پر مشتمل ہے -

حـــلاج

ابوالمغیث حسین بن منصور بن محمی البیضاوی ایک ایرانی صوفی اور عالم الٰہیات جس نے عربی زبان میں قلم اٹھایا - وہ البیضا (فارس) کے قریب الطور میں ۲۴۴ھ (۸۵۸ع) کے قریب پیدا ہوا - ایک آتش پرست کا پوتا جس کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ

حضرات ابو ایوب کی اولاد میں سے تھا ۔۔۔ ۲۶۰ھ (۸۷۳ع) سے ۲۸۳
(۸۹۷ع) تک اس نے اپنی زندگی صوفی مشائخ (تستری عمرو مکّ
جنید) کے ساتھ خلوت میں بسر کی - بعد ازاں اس نے ان سے قط
تعلق کر لیا اور ایک قرمطی داعی کی حیثیت سے (طالقان) اھوا
فارس، ھند (گجرات) اور ترکستان میں تصوف اور رھبانیت
تبلیغ کرنے لگا - ۲۹۶ھ (۹۰۸ع) میں جب وہ مکہ سے بغداد وا
آیا تو مرید (حلاجیہ) بڑی تیزی سے اس کے گرد جمع ھونے لگے
اس پر معتزلہ نے تو یہ کہنا شروع کیا کہ وہ صرف چرب زب
اور عیاری سے کام لے رھا ھے لیکن امامیہ نے ایک توقیع ا
ظاھریہ نے ایک فتوی کے ذریعے اسے خارج از اسلام قرار د
عباسی شرط (پولیس) کے ھاتھوں وہ دو مرتبہ گرفتار ھوا - اسے ۱۰
(۹۱۳ع) میں وزیر ابن عیسیٰ کے سامنے پیش کیا گیا اور ٹکٹکی
چڑھائے جانے کے بعد اس نے آٹھ برس زندان بغداد میں گزارے
المقتدر کی ماں شغب اور حاجب نصر کی سرپرستی کے باعث
حکومت کے وزیر حامد کی نفرت کا شکار ھو گیا جس نے اس
سات مہینے مقدمہ چلانے کے بعد ایک فتوی کی بنا پر جس
مالکی قاضی ابو عمر نے تصدیق کی اسے موت کے گھاٹ اتار د
۲۴ ذوالقعدہ ۳۰۹ھ (۲۶ مارچ ۹۲۲ع) -

اسلام میں بہت کم ھستیاں (حلاج کی طرح) زیر بحث آئی ھیں
قاضیوں کے متفقہ فیصلہ (اجماع) کے باوجود جنھوں نے اسے م
کی سزا دی عوام کی عقیدت نے اسے اولیاء کی فہرست میں شا

کر دیا ہے -

المسعودی

ابوالحسن علی بن الحسین عرب مورخ اور جغرافیہ دان اور چوتھی صدی ہجری کا ایک باکمال مصنف - اس کی زندگی کے حالات کا پتہ کہیں کہیں اسی کی تصانیف میں چلتا ہے - چونکہ اس کے مشاغل علم و فضل کے معینہ دبستانوں کی حدود سے دور ہو گئے تھے اس لیے نمائندگان علم و فضل نے اس کا تذکرہ بہت کم کیا ہے - فہرست کے مصنف کے خیال میں وہ مغرب کا رہنے والا تھا مگر اس کے اپنے بیان کے مطابق اس کی پیدائش بغداد میں ہوئی تھی اور اس کا تعلق ایک عرب خاندان سے تھا جن کا سلسلۂ نسب ایک صحابی تک پہنچتا تھا - اپنے عنفوان شباب میں اس نے ایران کا سفر کیا اور ۳۰۰ھ (۹۱۲ع) کا کچھ حصہ اسطخر میں بسر کیا - اگلے سال وہ ہندوستان گیا اور ملتان اور المنصورہ کے شہروں کی سیاحت کی - اس نے کمبایت اور صیمور کے راستے لنکا تک کا سفر کیا - بعض سوداگروں کے ہمراہ بحر چین پہنچا اور وہاں سے زنجبار واپس ہوا - پھر عمان چلا آیا - اس کے بعد وہ پھر جادہ پیما ہوتا ہے اور اس مرتبہ ہم اس کو بحیرہ خزر کے جنوبی ساحل کے علاقوں میں سفر کرتے ہوئے پاتے ہیں - ۳۱۴ھ (۹۲۶ع) میں وہ طبریہ علاقہ فلسطین میں پہنچا - ۳۳۲ھ (۹۴۳ع) میں انطاکیہ اور ملک شام کے سرحدی شہروں کی سیاحت کی اور چند روز اپنے وطن مالوف

یعنی بصرہ کے صوبہ میں قیام کرکے ۳۲۸ھ (۹۴۰ع) میں دمشق پہنچ گیا۔ اس کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کبھی شام میں رہتا تھا کبھی مصر میں۔ ۳۳۶ھ (۹۴۷ع) اور ۳۴۴ھ (۹۵۵ع) میں وہ الفسطاط میں تھا جہاں جمادی الثانی ۳۴۵ھ (۹۵۶ع) یا ۳۴۶ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔

ابراھیم النظام

موصوف کا پورا نام ابراھیم بن سیار بن ھانی بن اسحاق تھا۔ وہ بصرہ کے معتزلی علماء میں سے ایک عالم ہو گزرا ہے۔ اس کی ابتدائی تعلیم و تربیت تو بصرہ میں ھی ہوئی لیکن آخری حصہ بغداد میں بسر کیا۔ اس کی تاریخ پیدائش کے متعلق ھمیں کچھ معلوم نہیں البتہ وفات ۲۲۰ اور ۲۳۰ھ کے درمیان واقع ہوئی۔

نظام ایک باکمال شاعر بھی تھا اور لسانیات کا ممتاز عالم، زیرک اور نکتہ رس فاضل تھا۔ اس کا شمار عباسی دور کے دلچسپ ترین لوگوں میں ہوتا ہے۔

اس نے اپنی خدا داد صلاحیت کو فلسفہ کے حصول میں صرف کیا اور ابطال دھریت کے لیے ساعی رھا۔ مخالفین اسے دھری کہتے تھے۔ اصول و عقائد میں مبالغہ آمیزی اور بے احتیاطی نے اسے جمہور مسلمین کے نزدیک نشانہ ملامت بنا دیا۔ اس نے اصل التوحید اصل العدل اور اصل الوعد والوعید ایسے مسائل سے بحث کی ہے۔ اس کے شاگردوں میں سے جاحظ نہایت ممتاز اور ادیب ہو گزرا ہے۔ جس

نے کتاب البیان والتبیین اور کتاب الحوالات مشہور کتا
ھیں ۔ اپنے دعاوی اور تعلیمات میں وہ قیاس و رائے کی شد
کرتا ہے اور اجماع پر بھی تنقید کا میلان رکھتا ہے ۔ اس نے
ارباب قیاس ورائے صلحاء پر تنقید بھی کی ۔

ابراھیم النظام ھی نے تعمیر مادہ کے سلسلہ میں
پیش کیا کہ جزو لا یتجزی یعنی ایٹم کے اندر جوھر فرد یعنی
کی حرکت مکانی نہیں ۔ ایک نقطے سے دوسرے کی طرف اس آ
بغیر فاصلہ طے کیسے ھوتی ہے ۔ اس کے لیے انہوں نے خاص
وضع کی ”طفرہ“۔ اس زمانے میں ان کے اس تصور کا مذاق ا
آج یہ امر مسلمات میں سے ہے کیونکہ ایٹم کے اندر خلائے
اور مکانیت کا کوئی تصور نہیں لہذا وھاں کی حرکت بھی
سمجھی جا سکتی ۔ طفرہ سے بہتر اس کے لیے کوئی اصطلا
سکتی ۔

الکنـــدی

الکندی کا پورا نام ابو عمر محمد بن یوسف تھا ۔ یہ
عرب مورخ ۱۰ ذوالحجہ ۲۸۳ھ کو مصر میں پیدا ھو
کے قبیلۂ تجیب سے نسبت کی بنا پر کندی مشہور ھوگیا
حدیث کی تعلیم امام نسائی رحمت اللہ علیہ اور ابن قدید سے
کی اور اپنی آخری عمر میں خود بھی حدیث کا درس د
مورخ نے قریباً ساری عمر فسطاط ھی میں گزار دی

۳ رمضان ۳۵۰ھ کو وفات پائی ۔ ان کی ایک تصنیف تاریخ قضا مصر دوسری تاریخ والیان مصر اور ہے ۔ ان کتابوں میں موصوف نے ملکی سیاسیات ارو دوسرے امور کی طرف بھی اشارات کیے ہیں ۔ کتاب قضا مصر میں انہوں نے قضاۃ (قاضیوں) کے حالات کے علاوہ ان کے اہم قانونی فیصلوں کو بھی درج کیا ہے ۔ مختلف ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ کندی نے اور بھی کئی کتابیں تصنیف کیں، مثلاً کتاب الجند الغربی، کتاب الخندق والتراویح، کتاب الخطط، کتاب اخبار المسجد اہل الرایہ المعظم اور کتاب الموالی وغیرہ ۔

ابوالفرج اصفہانی

ابولفراج اصفہانی کا پورا نام علی بن حسین بن محمد بن احمد القریشی الاصفہانی ہے ۔ وہ عہد اموی کا مشہور عرب مورخ ہو گزرا ہے ۔ یہ اصفہان میں ۲۸۴ھ کو پیدا ہؤا ۔ اس نے بغداد میں تعلیم پائی اور ۱۴ ذوالحجہ ۳۵۶ھ کو وفات پائی ۔ اس کی تصانیف میں اب صرف کتاب الاغانی موجود ہے جس کی نسبت سے وہ الاغانی کے نام سے زیادہ مشہور ہے ۔ اس کتاب میں اس نے اپنے زمانے کے مشہور غزلیں اور ان کے شعراء کے مختصر حالات دیئے ہیں ۔ اس سے پہلے بھی اسی طرح کا ایک مجموعہ تالیف کیا تھا لیکن اس میں زائد حواشی نہ تھے ۔ کتاب کا آغاز ایک سو غزلوں کے ایک مجموعہ سے ہوتا ہے ۔ یہ خلیفہ ہارون الرشید کی فرمائش پر ابراہیم الموصلی موسیقار عصر، اسماعیل بن جامع اور

لمیح بن العوراء نے لکھی تھیں جس پر الواثق کے زمانے میں اسحاق بن ابراھیم نے نظر ثانی کی تھی - اس کتاب میں خلفاء اور ان کے جانشینوں کے قصائد بھی درج ھیں - یہ کتاب تاریخی حیثیت رکھتی ھے لیکن اس کی صحیح نگاری مشکوک ھے - یہ کتاب اموی زمانہ کے عیاش معاشرہ کی عکاسی کرتی ھے - اموی حکمرانوں اور خلفاء کی رضا جوئی میں اس نے حضرت سکینہ کے متعلق بھی موسیقی سے شغف کے بعض بے بنیاد اور بے سروپا قصے لکھ دئیے ھیں۔

اسی جانب داری کے پیش نظر اس کی مورخانہ حیثیت کے تسلیم کرنے میں اھل تحقیق کو تامل ھے -

اخطـــــل

اخطل عرب کا ایک شاعر ھو گزرا ھے - وہ مذھباً عیسائی تھا - اس کا اصل نام غیاث بن صلت بن طارقہ تھا - وہ تقریباً ۶۴۰ع کو حیرہ میں پیدا ھوا - وہ جشم بن بکر قبیلہ بنو تغلب سے تعلق رکھتا تھا - اپنے بڑے لڑکے کے نام پر اس نے ابو مالک کی کنیت اختیار کر لی - یہ شاعر زمانہ اسلامی پانے کے باوجود سعادت اسلام سے محروم رھا - وہ آخری دم تک عیسائی رھا - اس کا اپنا دیوان اس کے عیسائی ھونے پر دلالت کرتا رھا - اخطل پرلے درجہ کا شرابی تھا - یزید بن معاویہ کے دربار میں اسے سرکاری شاعر کی حیثیت حاصل تھی - اس کے دیوان کو بعض امور سے تاریخی حیثیت بھی حاصل ھے - اخطل جریر کا ھمعصر تھا - ان کی رقابت تاریخ ادب میں کافی شہرت

رکھتی ہے۔ فرزدق، جریر اور اخطل عرب دنیا میں ممتاز شعراء کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ ہجو میں اس کی خمریات مشہور ہیں۔

اخطل ولید اول کے دور حکومت کے خاتمہ سے پہلے ہی وفات پا گیا تھا لیکن ابن عبد ربہ کے بیان کے مطابق وہ عمر ثانی کے عہد تک زندہ رہا اور اس کا دور شاعری قریباً چالیس برس تک ممتد ہے۔

جـــــریر

جریر کا پورا نام جریر بن خطفا تھا۔ وہ بنو کلیب بن یربوع کے قبیلہ کا اور دور اموی کا ایک زبردست ہجو نگار شاعر ہے۔ پہلے تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں بحثیت شاعر مشہور ہوا ۔ بعد میں بنو جہیل اور مجاشع قبائل کے باہم نزاع نے اسے فرزدق کا مد مقابل بنا دیا ۔ اس وقت والی عراق حجاج کی شخصیت جریر کے آئند مستقبل متعین کرنے میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے کیونکہ حجاج نے ہی اسے خلیفہ عبدالملک کے دربار میں متعارف کرایا ۔ درباری تقرب نے ہی جریر کو اخطل اور عدی بن الرقآ کی رقابت پر آمادہ کیا تھا۔ جریر کو پوری درباری سرپرستی حاصل رہی۔ جریر اپنے رقیب و حریف اخطل کی موت کے بعد جلدی ہی ۱۱۰ یا ۱۱۴ھ میں وفات پا گیا۔ اس کا ایک دیوان بھی ہے۔ اخطل کے ساتھ اس کے شاعرانہ نوک جھوک نقائض جریر فرزدق میں ملتے ہیں۔

ابن قـــتیبه

پورا نام ابو عبداللہ محمد بن مسلم تھا - القتبہ اور القتیب کے ناموں سے بھی مشہور تھے - مولد و وطن کے نسبت سے کوفی مروزی اور دینوری بھی کہلاتے تھے -

ابن قتیبہ مشہور عرب مصنف ہو گزرے ہیں- ۲۱۳ھ - ۸۲۸ع میں کوفہ میں پیدا ہوئے - کچھ عرصہ دینور میں قاضی رہے - پھر بغداد میں بطور مدرس کام کرتے رہے اور وہیں غالباً ۲۷۲ھ میں وفات پا گئے - ادبی دنیا میں موصوف بغداد کے نحوی مکتب کے نمائندے شمار ہوتے ہیں لیکن موصوف نے اپنے معاصروں ابو حنیفہ دینوری اور جاحظ کی طرح اپنے وقت کے مروجہ علوم و فنون کو بھی بالاستیعاب حاصل کیا - اس کے علاوہ انہوں نے فقہی بحث و تمحیص میں بھی حصہ لیا - اور قرآن و حدیث کے مقابلہ میں فلسفہ کا رد کیا - ان کی تصانیف میں سے کتاب ادب الکاتب کتاب معانی الشعر اور کتاب عیون الاخبار ہیں -

فقہ میں انہوں نے کتاب تاویل مختلف الحدیث اور کتاب مشکل القرآن اور کتاب المسائل والجوابات لکھیں - فن تاریخ میں بھی ان سے ایک کتاب ''کتاب الامامة والسیاسة'' منسوب ہے - لیکن بعض مورخین نے لکھا ہے کہ یہ کتاب ابن قتیبہ کے معاصر المغربی یا کسی اور مصری مصنف نے لکھی ہے -

فاضل جلیل محب الدین الخطیب المصر نے اس موضوع پر

مستقل بحث کرکے ثابت کر دیا ہے کہ کتاب الامامة والسیاسة ہرگز و زنہار امام ابن قتیبہ کی نہیں بلکہ ان کی وفات کے بعد یہ لغو کتاب اُن کی طرف منسوب کر دی گئی ۔ بڑی اور شاذ دلیل یہ :

ان مؤلف الامامة والسیاسة یروی کثیرا عن اثنین من کبار علما مصر وابن قتیبہ لم یدخل مصر[3] و لا اخذ من هذین العالمین فدل ذلک کله علی ان الکتاب مدسوس علیه ۔

ترجمہ : الامامة ولسیاسة کا مولف اکثر و بیشتر علمائے مصر کے دو عالموں سے روایت کرتا ہے حالانکہ ابن قتیبہ کبھی مصر نہ گئے اور نہ انہوں نے ان دونوں عالموں سے استفادہ کیا ہے لہذا یہ سب باتیں اس کی دلیل ہیں کہ اس کتاب کی نسبت ان کی طرف ایک طرح جعلسازی ہے ۔ (تعلیقات از محب‌الدین الخطیب ۲۳۶ بر العواصم من القواصم تالیف قاضی‌ابو بکر بن عربی مطبوعہ مصر مطبع سلفیہ ۱۳۷۱ع -

ابن حـــزم

ابن محمد علی بن احمد بن سعید بن حزم اندلس کا ایک فاضل مشہور عالم دین، مورخ اور ممتاز عرب شاعر ہو گزرا ہے ۔ اس کی تاریخ پیدائش رمضان ۳۸۴ھ ہے ۔ اس کے پر دادانے اسلام قبول کیا تھا ۔ اس کا والد اچھے عہدوں پر فائز رہا جس سے ابن حزم کافی فائدہ اٹھایا - اس نے ابن بشکوال سے مختلف علوم و فنون حاص

گئے - سیاسی انقلابات سے اُسے بیحد نقصان پہنچا - علی بن حمود نے اسے المریہ سے جلا وطن کر دیا تو یہ اپنے ایک دوست کے همراہ حصن القصر چلا گیا اور یہاں سے بلنسیہ چلا گیا اور شاهی فوج میں شامل هو کر غرناطہ کے محاذ پر لڑا اور قید هؤا رهائی کے بعد پهر قرطبہ لوٹ آیا - عبدالرحمان خامس المستظهر کے دور خلافت میں وزیر هوا اور خلیفہ کے قتل هونے پر قید هوا - پهر دوبارہ هشام المعتد کے عہد میں وزیر بنا - آخری عمر میں اس نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور تصنیف و تالیف میں مصروف هوا - اُس کی تصانیف حسب ذیل هیں :

(۱) طوق الحمامہ فی الالفة والالاف -

(۲) رسالة فی فضل الاندلس -

(۳) نقطہ العروس فی تواریخ الخلفاء -

(۴) ابطال القیاس والرائی والاستحسان والتقلید -

(۵) کتاب الاحکام فی اصول الاحکام -

(۶) کتاب المحلی بالاثارفی شرح المجلی -

(۷) کتاب الفصل فی الملل والا هواء والنحل -

ان کتابوں کے علاوہ ابن حزم نے منطق، فلسفہ، علوم دینیہ اور دیگر فنون میں کئی تصانیف چھوڑیں - اس نے اپنے وقت کے فرقوں پر بھی کڑی تنقید کی ہے -

ابن زیــــدون

ابو الولید احمد بن عبد اللہ بن احمد بن غالب بن زیدون

المعروف به ابن زیدون مخزومی اندلس کا ایک مشہور عرب شاعر ہو گزرا ہے ۔ وہ قرطبہ میں ۳۹۴ھ - ۱۰۰۳ع میں پیدا ہوا۔ کمسن ہی تھا کہ والدین رحلت کر گئے ۔ سرپرستوں نے تعلیم دلوائی ۔ بیس برس کی عمر میں ہی اس نے بحیثیت شاعر اچھی خاصی شہرت حاصل کر لی ۔ شعر و سخن کے علاوہ خاندانی جاہ و وقار کے پیش نظر اس کو سیاسی شعور بھی بکمال حاصل تھا ۔ چنانچہ عملی سیاست میں اس نے بطور وزیر سیاسی تدبر کا مظاہرہ کیا ہے ۔

ولادہ نامی ایک شاعرہ سے معاشقہ اس کے لیے اچھا خاصہ وبال جان بنا رہا ۔ اپنے رقیب کے ہاتھوں سے اسے قید و بند کی صعوبتوں سے بھی دو چار ہونا پڑا ۔ دشمنوں نے اس پر بنو اُمیہ کو بر سر اقتدار لانے کا الزام لگایا ۔ بلاآخر قرطبہ آ کر اُس نے سفارت کا عہدہ حاصل کیا لیکن اقتدار کے لالچ اور حرص نے اسے را به تنزل کر دیا ۔ یہاں سے نکل کر وہ دانیہ بطلیموس وغیرہ میں پھرا کر امیر اشبیلیہ کے ہاں سیکریٹری مقرر ہوا اور پھ وزیر اعلے بن گیا ۔

درباری رقابت نے اُسے ایک شہری فساد فرو کرنے کے لیے جانے پر مجبور کر دیا ۔ یہ اس اثنا میں بخار کے عارضہ سے راہئ ملک عدم ہوا ۔ اس نے ۱۰ رجب ۴۶۳ھ کو وفات پائی ۔

ابن زیدون شاعر ہونے کے علاوہ ایک عمدہ انشا پرداز بھی تھا ۔ چنانچہ اس کی کتابیں مشہور ہیں : (۱) رسالہ بنام ابن عبدوس (۲) خط بنام ابن جہور ۔ اس کے علاوہ ابن زیدون ک

دیوان بھی موجود ہے ۔

المعتمد علی اللہ (اشبیلی)

محمد بن عباد بن المعتضد بن محمد بن اسمعیل بن عباد المعروف بہ المعتمد علی اللہ عبادی خاندان کا تیسرا نامور بادشاہ ہو گزرا ہے ۔ وہ ۴۳۱ھ = ۱۰۴۰ع میں اشبیلیہ میں پیدا ہوا ۔ بچپن ہی سے اس میں قیادت کی صلاحیت موجود تھی ۔ چنانچہ اس نے اوائل عمر میں ہی شنتمریہ اور شلب پر حملہ کر دیا اور ان شہروں کا گورنر مقرر ہوا ۔ اس کا بڑا بھائی بغاوت کے الزام میں مارا گیا اور یہ تخت شاہی کا وارث بنا ۔ کچھ مدت بعد غرناطہ کے بربر حکمرانوں کے خلاف نبرد آزما ہوا لیکن شکست کھائی ۔ بہر کیف المعتضد کے مرنے کے بعد یہ وارث ملک بنا ۔ اس کی زندگی پر ابن عمار نامی ایک وزیر اور شاعر نے بہت اثر ڈالا ۔ چنانچہ معتمد سے عشق و معاشقہ کی بھی کچھ داستانیں منسوب ہیں ۔

عنان حکومت سنبھالنے کے بعد اس نے قرطبہ کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا لیکن کچھ عرصہ بعد یہ اس سے چھن گیا ۔ اسے حاصل کرنے کے لیے اس نے متواتر تین سال ناکام حملے کئے ۔ اس کی زندگی اسی طرح کی کشمکشوں میں گزری ۔ عیسائیوں کے علاوہ اپنے ہی مسلمان شہزادوں سے نبرد آزما ہوتا رہا ۔ بالآخر جب یوسف بن تاشفین نے دوسری مرتبہ آبنائے کو عبور کر کے ان ممالک پر اپنے نام سے علم جہاد بلند کیا اور مسلمان شہزادوں کو

معزول کرنا شروع کر دیا تو المعتمد بھی قید کر لیا گیا۔ چنانچہ پہلے اسے بیوی بچوں سمیت طنجہ پھر مکنس اور پھر چند ماہ کے بعد اغمات بھیجا گیا جہاں وہ کئی سال مصیبت زدگی کے عالم میں زندگی گزار کر پچپن سال کی عمر میں ۴۸۷ھ = ۱۰۹۵ع میں وفات پا گیا۔

المعتمد علی اللہ کے شعرو سخن سخاوت اور اولوالعزمی کے جذبات قابل تعریف تھے۔ وہ اپنے وقت اور ملک کا بہترین روشن دماغ انسان تھا۔ علم و ادب کا سرپرست، کشادہ دل اور متحمل مزاج تھا البتہ کچھ آرام پسند تھا۔ بہر کیف ھسپانوی تاریخ میں ایک اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔

حریری

ابو القاسم محمد بن علی بن محمد بن علی حریری ایک مشہور نحوی اور عرب انشاء پرداز ھو گزرا ہے۔ وہ بصرہ کے قریب مشان میں ۴۴۶ھ میں پیدا ھوا اور ۶ رجب ۵۱۶ کو فوت ھوا۔ اس نے بصرہ ھی میں تعلیم و تربیت پائی اور وھیں محکمۂ اطلاع رسانی کا رئیس متعین ھوا۔ یہ عہدہ بعد میں بھی کافی مدت تک اس کی اولاد میں جاری رھا۔ اس نے بغداد کا متعدد بار سفر کیا اور حج کعبہ سے بھی مشرف ھوا۔ حریری کو شناسائے عالم کرانے والی اس کی تصنیف ''مقامات حریری'' ہے۔ گو اس نے اور بھی بہت سی کتابیں لکھی ھیں لیکن وہ ''مقامات'' کے درجہ کی نہیں۔ یہ کتاب ''مقامات بدیع الزمان ھمذانی'' کے تتبع میں لکھی گئی ہے اور اسی سبک پر

رہو ہوئی ہے۔ کتاب کا میر فسانہ ابو زید سروجی نامی کوئی
شخص ہے اور داستان گو حارث بن ہمام۔ یہ کتاب مصنف کی زندگی
ہی میں شہرت حاصل کر چکی تھی۔ یہ کتاب سلاست و جدت
اسلوب میں اعلے مقام رکھتی ہے۔ اس کے تراجم مختلف زبانوں
میں کیے گئے ہیں۔

اس کی بقیہ تصانیف میں "درۃالغواص" اور رسائل کا ایک
مجموعہ معلوم ہے۔

المبرد

ابوالعباس محمد بن یزید الثمالی الازدی ۲۰۷ھ یا ۲۱۰ھ یا
۲۱۰ھ میں سزموار کو پیدا ہوا۔ اس کے مبرد کے نام سے مشہور
ہونے کا ایک عجیب قصہ ہے۔ کہتے ہیں کہ پولیس کے چند
آدمیوں نے مبرد سے ہم کلام ہونا چاہا۔ اسے ناگوار گزرا اور
بھاگ کر ابو حاتم سجستانی کے ہاں پناہ گیر ہؤا۔ صاحب خانہ
ہی کے ایما پر ٹھنڈے پانی کے گھڑے میں چھپ گیا۔ تلاش
کرنے پر جب اس کا پتہ نہ چلا تو پولیس والے نا امید ہوکر لوٹ
گئے تو ابو حاتم نے اسے ان الفاظ سے یاد کرنا شروع کیا۔ علی
المزملۃ المبرد المبرد۔ لوگوں نے سن لیا اور پھر وہ اسی نام سے
مشہور ہوا۔ اس نے علم و ادب کی کتب بڑے اساتذہ وقت سے
پڑھیں۔ علم و ادب میں اس کا تبحر علمی مسلم تھا۔ اس کا معاصر
ثعلب تھا جس پر بعض لوگ مبرد کو ترجیح دیتے ہیں۔ مبرد
کا انداز بیان صاف، شستہ اور نہایت فصیح و بلیغ تھا۔

اپنے معاصرین میں اسے یہ فوقیت حاصل ہے کہ اس نے عربی ثقافت اور ادب کو غیر عربی اثرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی۔ اس کی مشہور تصانیف یہ ہیں۔ کتاب الکامل، مقتضب الروضہ، کتاب المؤنث والمذکر، معانی القرآن۔ کتاب الحروف، کتاب الاعراب کتاب العروض، کتاب القوافی، کتاب قحطان و عدنان، کتاب الخط و الهجا، کتاب صفات اللہ وغیرہ کتاب اسماء الدواهی هندالعرب۔

موصوف کی ''الکامل'' دنیا کی بہترین ادبی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس کتاب پر مستشرقین نے بھی داد دی ہے۔

المبرد کی وفات شوال یا ذی القعدہ ۲۸۵ھ میں ہوئی اور بعض روایات کے مطابق ۲۸۶ھ میں۔ یہ زمانہ خلیفہ المعتضد باللہ کی خلافت کا تھا۔ اس کی وفات پر ثعلب نے درد انگیز مرثیہ لکھا:

ذهب المبرد وانقضت ایامه　　ولیذ هبن اثر المبرد ثعلب
بیت من الاداب اضحی نصفه　　خربا و باق النصف سیذهب
فتزولوا من ثعلب فبکاس ما　　شرب المبرد عن قریب یشرب

مـــآخـــذ

باب اول

(۱) C. Brockelmann : *Geschichte der Arabischen literatur*

(۲) جلدیں، Weimar ۱۸۹۸ع تا ۱۹۰۲ع) - سوانحی مآخذ کے خلاصہ جات کم یاب ہیں طباعت ثانی درکار ہے - اسی عنوان کے تحت مصنف کی چھوٹی کتابیں (لائپ زگ ۱۹۱۰ع) مفید اور کارآمد ہیں لیکن ذرا ثقیل ہیں -

(۳) R.A. Nicholson : *A Literary History of the Arabs* (۱)

(لندن ۱۹۰۷ع) - ایک دلچسپ تصنیف جو نظم کے لحاظ سے خاص قدر و قیمت رکھتی ہے -

(۲) *Eastern Poetry and Prose* (کیمبرج ۱۹۲۲ع) - ۳۲ عرب مصنفین کے مخصوص اقتباسات کی حامل ہے -

(۳) Carra de Vaux : *Les Penseurs de l'Islam* (چھوٹی جلدیں پیرس ۱۹۲۱ تا ۱۹۲۰ع)

(۴) D.B. Macdonald : *Development of Muslim Theology*

(لندن ۱۹۰۳ع) - اسلامی افکار سے متعلق ایک بیش قیمت اور عام تعارف -

اسلامی تاریخ پر ایک جامع تصنیف

(۵) A. Muller : *Der Islam im Margenund Abendland*

(دو جلدیں برلن ۱۸۸۵ تا ۱۸۸۷ع) -

عرب اور بدوی حالات پر معیاری تصنیف

(۹) *Travels in Arabia Deserta*: C. M. Dougty (لندن طبع ثانی ۱۹۲۲ع)

باب دوم

(۱) Noldeke مقالہ 'Semitic Languages' (سامی زبانیں) *Encyclopaedia Britannica* (انسائکلو پیڈیا برٹینیکا) *Die Semitischen Sprachen* (لائپ زگ ۱۸۸۶ع) -

باب سوم

(۱) Sir Charles Lyall: (۱) *Translations of Ancient Arabic Poetry* (لندن ۱۸۸۰ع) جو زیادہ تر حماسہ از ابو تمام سے ہے - سر چارلس لائل قدیم شعراء کے کلام کو انگریزی میں ترجمہ کرنے میں بلا شبہ ایک کامیاب مترجم ہے اور اس کی اس تصنیف میں تمہید قابل قدر ہے -

(۲) تراجم مفضلیات (آکسفورڈ ۱۹۱۸ع) - دیوان عبید بن ابرص (لیڈن ۱۹۱۳ع) اور دیگر قدیم شعراء -

(۳) Th. Noldeke: *Beitrage Zur Kemtnis der Paesie der alten Araber* (ہینوور ۱۸٦۴ع) - یہودی شعراء پر مضامین اور عام تعارف شامل ہے - نیز ایک مشہور شاعرہ الخنساء کے مرثیے -

(۴) W.A. Clouston: *Arabian Poetry for English Readers* (گلاسکو ۱۸۸۱ع) - یہ کتاب سر ولیم جونز کے معلقات نثری تراجم کی طبع ثانی ہے اور اس میں متفرق چھوٹی نظمیں ترجمہ J.D. Carlyle نثری تراجم جو J.W. Redhouse نے کئی

ضروری گیتوں یا غنائی نظموں کے کیے اور حصے تعارف اور حاشیوں
کے ساتھ شامل ہیں۔

(۵) Fr. Ruchert : *Die Hamasa* (Stuttgart ۱۸۴۶ء) - ایک ماهرانہ یا عمدہ ترجمہ جس میں کئی دوسری نظموں کے تراجم بھی شامل ہیں۔

(۶) معلقات (۱) W.S. Blunt : *Seven Golden Odes of Pagan Arabia* -

(۲) Th. Noldeke : *Funf Moallaqat ubers* (وی انا ۱۹۰۰ء) امرء القیس : دیوان امرء القیس - *Diwan d'Amrol kais* (۱۸۹۹ء) ترجمہ Macguskin de Slane (پیرس ۱۸۳۷ء) (۳) تابط شرا : تراجم لائل (۱) اور نکلسن (۱) اور (۲) - شنفرا : لامیۃ العرب J.W. Redhouse (لندن ۱۸۸۱ء) - نابغہ : دیوان . . . . ترجمہ Hartwig Derenbourg (پیرس ۱۸۶۹ء) - کئی دیوان معمولی شعراء کے بھی ترجمہ کیے گئے ہیں -

باب چہارم

محمد : کوئی تازہ تنقیدی کتاب موجود نہیں - قدیم تصانیف میں سرولیم میور کی کتاب *Life of Muhammad* (طبع چہارم - ایڈنبرگ ۱۹۱۲ء) عام ملتی ہے - مندرجہ ذیل کتب بھی تجویز کی جاتی ہیں - (۱) A,A. Bevan باب محمد در *Cambridge Mediaeval History* ج ۲ (۲) Leone Caetani : *Studi di Storia Orientale* ج ۳ (میلان ۱۹۱۴ء)' (۳) قرآن : انگریزی تراجم از Sale اور Rodwell (اکثر بار طبع ہوئی) اور E.H. Palmer (اکسفورڈ ۱۸۸۰ء) تمام مفید ہیں - ایک عمدہ عام خاکہ Th. Noldeke : *Orientalische Skizzen*, (انگریزی ترجمہ

Sketches from Eastern History لندن اور ایڈنبرگ ۱۸۹۲ع) میں پایا جاتا ہے - (۳) کعب بن زہیر: بانت سعاد: (۱) ترجمہ R. Basset الجزائر ۱۹۱۰ع) - (۲) ترجمہ R.A. Nicholson در (۲) مذکورہ بالا - (۵) لبید: *Die Gedichte des Lebid* Urbes A. Huber. (لیلن ۱۸۹۱ع) - (٦) فرزدق: دیوان . . . ترجمہ R. Boucher (پیرس ۱۸۷۰ تا ۱۸۷۵) - (۷) عمر بن ابی ربیعہ *Essays on* در The Poet Omar: W.G. Palgrave: *Eastern Questions* (لندن ۱۸۷۲ع) -

باب پنجم جزء ا

سیبویہ: . . . . *Sibawaihis Buch*: G. Jabn ubers (برلن ۱۸۹۳ع) -

شعوبیہ: (۱) Goldziher: *Muhammedanische Studien* Halle ۱۸۸۸ع) ص ۱۴۷ تا ۲۱۶ - کلیلہ و دمنہ: ترجمہ S. de Sacy (پیرس ۱۸۱٦ع انگریزی ترجمہ از W. Knatchbull آکسفورڈ ۱۸۱۹ع) -

ابویوسف: Le Livre de l'Impot Foncier ترجمہ E. Fagnan (پیرس ۱۹۲۱ع) -

ابن ہشام: *Das Leben Mohammads*: G. Weil urbers Stuttgart ۱۸٦۴ع) -

(۵) واقدی: *Muhammad in Medina* (ملخص ترجمہ کتاب المغازی از J. Wellhousen (برلن ۱۸۸۲ع) -

ابو نواس: دیوان deutsch von A. von Kremer (وی آنا ۱۸۵۵ع) -

جز ۲

(۱) F. Dieterici ubers : Die sogenannte Theologie des Aristoteles (لائپ زگ ۱۸۸۳ع) - (۲) جاحظ : The Merits of the Turks ترجمہ Harby Walker (Journal of the Royal Asiatic Society ۱۹۱۰ع) - (۳) Pseudo Jahiz : کتاب المحاسن والاضداد ۲ Teil - O. Rescher. ubers. (Stuttgart ۱۹۱۲ع)

جز ۳

تصوف : (۱) R.A. Nicholson : *The Mystics of Isiam* (لندن ۱۹۱۴ع) - ایک مختصر تعارفی تبصرہ کرتا ہے ۔

(۲) L. Massignon : *Essai sur les origines du Lexique technique de la Mystique Musalmane* (پیرس ۱۹۲۲ء) ابتدائی تین صدیوں کے دوران میں ارتقاء تصوف اور مکاتیب خیال کا بیش بہا خلاصہ درج ہے ۔

(۳) حلاج : L. Massignon : La Passion d' al-Hallaj (پیرس ۱۹۲۲ع) ۔

(۴) قشیری : R Hasrtmann : *Al-kuschairis Darstellung des Sufitums* (برلن ۱۹۱۴ء)

روایت : (۱) I. Goldziher : *Muhammedanische Studien* : Theil (Halle ۱۸۹۰ع) اس مضمون پر معیاری مقالہ ہے ۔

(۲) A. Guillaume : *The Traditions of Islam* (آکسفورڈ ۱۹۲۴ء) ایک عمدہ تمہید جس کی بنیاد پہلی تصنیف پر ہے ۔

(۳) W. Goldsack : *Selections from Muhammadan Tradi-*

tions (مدراس ۱۹۲۷ء) جو چودھویں صدی کی عبدالعزیز تالیف مشکواۃ المصابیح سے اخذ کی گئی ہیں۔ بخاری : *Les traditions islamiques* ترجمہ O. Houdes et W. Marcais (پیرس ۱۹۰۳ تا ۱۹۱۴ع) ۔

بلاذری : *The Origins of the Islamic State* ترجمہ P.K. Hitti اور F.C. Murgotten (نیویارک ۱۹۱۶ع تا ۱۹۲۴ع)

طبری : *Geschichte der Perser and Araber Zur Zeit der Sassaniden ubers* .... Th. Noldeke لیڈن ۱۸۷۹ع)[1] ۔

مسعودی : (۱) ...... Les Prairies d'Or ترجمہ C. Barbier de Meynard et Pavet de Courteille (پیرس ۱۸۶۱ع ۱۸۷۷ع) ۔ *Advertissement et de la* Revision *LeLivpre de L'* ترجمہ B. Carra de Vaux (پیرس ۱۸۹۷ع)۔

جغرافیہ دان : فرانسیسی تراجم کا ایک سلسلہ زیر ترتیب ہے ۔

اصطخری : *The Oriental Geography of Ebn Haukal* ترجمہ (ایک فارسی مسودہ سے جو دونوں تصانیف پر مشتمل ہے) سرولیم اوسلے (لندن ۱۸۰۰ع) ۔

ابن یعقوب : G. Jacob : *Ein arabischcr Berichterstatter* aus dem 10 Jahsh (برلن ۱۸۹۶ع) ۔

ابن فضلان : *Ibn Foszlans u.a. Araber* ubers C.M.Frahn : Berichte .... (سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۲۲ع) ۔

سلسلہھائے تواریخ

(۱) Chain of Histories : *Relations des voyages faits par*

---

(۱) طبری کے فارسی ترجمہ کا ترجمہ Chronique de Tabari ترجمہ M.H, Zotenberg اصل عربی عبارت کا بہت نامکمل مفہوم پیش کرتا ہے ۔

. . . . *les Arabes* ترجمہ Reinaud (پیرس ۱۸۴۵ع) قدیم ترجمہ
از Renandot کا انگریزی ترجمہ (لندن ۱۷۳۳ع) موجود ہے -

(۲) *Voyage du Maschand Sulay man en Inde et en*
chine . . . ترجمہ G. Ferrand (پیرس ۱۹۲۲ع) -

Livre des Merveilles de I' Inde ترجمہ L.M. Devic
(لیڈن ۱۸۸۶ع) ترجمہ B. Carra de Vaux L'Aberege des
Merveilles (پیرس ۱۸۹۸ع) -

جز ٤

Motenebbi, der grosste arabische Dichter . . . ubers.
J. Von Hammer (لیڈن ۱۸۹۰ع) - الفارابی : *Philosophische*
Abband lungen ubers. F. Dieterici (لیڈن ۱۸۹۲ع) -

(۲) *Der Musterstaat* : ubers F. Dieterici (لیڈن ۱۹۰۰ع) -

ابوالعلاء : (۱) R.A. Nicholson : *Studies in Islamic Poetry*
(کیمبرج ۱۹۲۱ع) (۲) *The Letters of Abui-Ala* ترجمہ D.S.
Margoliouth (آکسفورڈ ۱۸۹۸ع) -

مسکویہ : D.S. Margoliouth : *The Eclipse of the*
Abbasid Caliphate (آکسفورڈ ۱۹۲۱ع) اس میں تراجم جلد ۵ ، ۶
Experiences of the Nations متاخر مصنفوں کے دو سلسلوں
کے ساتھ شامل ہیں -

التنوخی : *The Table-Talk of a Mesopotamian Judge*
(یعنی The Collection of Histories کی ج (۱) ترجمہ D.S.
Margoliouth (لندن ۱۹۲۲ع) -

البشیہی : المستطرف ترجمہ Pae G. Rat (پیرس ۱۸۹۹ع تا
۱۹۰۲ع)

ماوردی: Les Statutes governmentaua ترجمہ E. Fagnan (الجزائر ۱۹۱۰ع) علی (جس کے نام منسوب ہے): *La kasida ez-Zainabiyya* ترجمہ A. Raux (پیرس ۱۹۰۷ع) -

اخوان الصفا: *Die propacdeutik (logik, Naturans-chauung, Anthropologie Lehrevon der Weltseele) der* ubers. F. Dieterici : *Araber in X Jahah ....* (برلن اور لائپزگ ۱۸۶۱ع تا ۱۸۷۲ع) -

بدیع الزمان همذانی: *The Maqamat* ترجمہ W. Prendergast (مدراس ۱۹۱۵ء) -

ثعالبی: (۱) *Les Rois de Perse ...* ترجمہ H. Zotenberg (پیرس ۱۹۰۰ع)

(۲) C. Barbier de Meynard :*Tableau literaire de la Khorassan* (ترجمہ از ج ۳ کتاب یتیمۃ الدھر) جرنل ایشیاٹک ۱۸۵۳ع ۱۸۵۳ع) -

عتبی: کتاب الیمینی ترجمہ J. Reynolds (لندن ۱۸۵۸ء) -

البیرونی: (۱) *The Chronoloy of Ancient Nations* ترجمہ E. Sachau لندن ۱۸۷۹ع) -

(۲) *India* ترجمہ E. Sachau (لندن ۱۸۸۸ع) -

ابن سینا: (۱) *Traites mystiques d' .... Avicenne* ترجمہ A.F. Mehren (لیڈن ۱۸۸۹ع تا ۱۸۹۹ع) -

(۲) *Qasida on the Human Soul* ترجمہ E. G. Browne *A Literary History of Persia* ج ۲ (لندن ۱۹۰۶ع) ص ۱۱۰--۱۱۱) -

ھسپانوی اور سسلی کی شعر و شاعری کے لیے عام طور پر معیاری تصانیف یہ ھیں -

(۱) *Poesie und kunst der Araber in Spanien und Sicilien*: A.F. Von Schack (طبع دوم ۱۸۷۷ء) -

ابن زیدون: *Un Poete arabe de Andalousie* A. Cour (قسطنطین ۱۹۲۰ء) اس میں بعض پچاس نظموں کے تراجم کے علاوہ *Epistle to Ibn Abdus* کا ترجمہ بھی شامل ہے -

علی الطبری: *The Book of Religion and Empire* ترجمہ A. Mingana (لندن ۱۹۲۲ء) -

البغدادی: *Moslem Sects and Schisms* ترجمہ K. Seeley (کولمبیا ۱۹۲۰ء)

باب ششم

الغزالی: (۱) *Streitschrift . . . . gegen die Batinijja Sekte* طبع مع تجزیہ از I. Goldziher (لیڈن ۱۹۱۶ء) -

(۲) *Die Widerspruche der Philosophie nach al-Gazzali und ihr Ausgleich durch Ibn Roshd*: T.J. de Boer (سٹراسبرگ ۱۸۹۴ء) -

(۳) *Le Presorvatif de l' Erreur* ترجمہ C. Barbier de Maynard (در جرنل ایشیاٹک ۱۸۷۷ء C &) -

(۴) *Islamische Ethik*: Haus Baner (Halle ۱۹۱۶ء تا ۱۹۲۲ء) امام غزالی کی احیاء کی کتب ۱۲، تا ۱۴ کے تراجم -

(۵) Le Perle precieuse ترجمہ L. Gantier (جنیوا ۱۸۷۸ء) عقیدۂ معاد پر ایک مشہور عام رسالہ -

(۶) مشکواۃ الانوار ترجمہ W. H. T. Gairdner (لندن ۱۹۲۴ء) - نور (روشنی) پر صوفیانہ مقالہ -

زمخشری: Les Colliersd'or ترجمہ C. Barbier Meynard (پیرس ۱۸۷۶ء) -

حریری : مقامات ترجمہ T. Chenery (لندن ۱۸۶۷ع) جسے F. Steingass نے جاری رکھا (لندن ۱۸۹۸ع) - دو "مقامات" کا ترجمہ R.A. Nicholson نے مقفی نثر میں کیا ہے -

(۲) مذکورہ بالا میں انگریزی نثری نظم میں ترجمہ ہوئے -

طغرائی : لامیۃ العجم ترجمہ از J.W. Redhouse در Clouston وہی کتاب -

نسوی : *Histoire de Sultan Djelaled Din* ترجمہ O. Houdas (پیرس ۱۸۹۵ع) -

شہرستانی : *Religious parteien und Philosophenschule* *ubers. Ths. Haarbruker* Halle) ۱۸۵۰ تا ۱۸۵۱ع) -

یاقوت : *Dichonnaire . . . de le Perse* ترجمہ C. Barbier de Meynard (پیرس ۱۸۶۱ع)

اسامہ بن منقذ : Souverniers historiques ترجمہ H. Deren-bourg (پیرس ۱۸۹۵ء)

ابن عربی : ترجمان الاشواق ترجمہ R. A. Nicholson (لندن ۱۹۱۱ع) -

عمر بن الفارض : نکلسن : Studies in Islamic Mysticism (کیمبرج ۱۹۲۱ع) -

بہاءالدین زہیر : دیوان ترجمہ E. H. Palmer (کیمبرج ۱۸۷۷ع)
بہاء الدین موصلی : حیات صلاح الدین ترجمہ C. R. Conde (لندن ۱۸۹۲ع) -

ابو شامہ : *Arab Quellenbeitrage* اور *Zur geschichte der Kreuzzuge* B and I ubers, g.p. Gorgers und : Rohricht, (برلن ۱۸۷۹ع) -

ابن الاثیر: (۱) *Historie de Atabecs de Mosul* ترجمہ Mac-
Guckin de slane -

(۲) *Extrait de la . . . Kamel* ترجمہ J. T. Reinaud
'*Annales du Maghrib et de l'Espagne* C. F. Defre-
mery ترجمہ E. Fagnan (ازکامل) (الجزائر ۱۹۰۱ع) -

المکین: . . . Historia Saraenica طبع ثانی بزبان لاطینی از
Th. Erpenius (لیڈن ۱۶۲۰ع انگریزی زبان میں از S.
Purchas (لندن ۱۶۲۹ع) -

ابوالفدا (۱) *De Vita . . . Muhammedis* بزبان لاطینی J.Gagnier
(آکسفورڈ ۱۷۲۳ع) -

(۲) *Annales Moslemici . . .* ترجمہ J. J. Reiske (لائپزگ
۱۷۵۴ع اور ۱۷۸۸ع) -

عبداللطیف: *Description del 'Egypte* ترجمہ S. de
Sacy (پیرس ۱۸۰۸ع) -

ابن خلکان: *Biographical Dictionary* ترجمہ MacGuckin
de Slane (۴ جلدیں پیرس ۱۸۳۲ تا ۱۸۷۱ع) -

ادریسی: (۱) *Geographie* ترجمہ P. A. Jaubert (پیرس ۱۸۳۶ع
تا ۱۸۴۰ع) -

(۲) *Description de l'Afrique et de l'Erspagne* ترجمہ
R. Dozy اور M. J. de Goeje (لیڈن ۱۸۶۶ع) -

ابن ظفر: '*Solwan* اور *Waters of Comfort* ترجمہ M.
Amari (لندن ۱۸۵۲ع) -

ابن طفیل: حی بن یقظان ترجمہ Leon Gauthier (الجزائر
۱۹۰۰ع) -

ابن رشد (۱) *ie Metaphysik des Averroes* M. Horten ubers (Halle ۱۹۱۲ء) -

(۲) *iilosophie und Theologie des* : ubers M. J. Miller *Averroes* (میونخ ۱۸۷۵ء) انہی رسالوں کا انگریزی تر محمد جمیل الرحمان (بڑودہ ۱۹۲۱ء) نے کیا ہے -

(۳) دیکھیں ذیل امام غزالی -

ابن سبعین : *rrespondance du Philosophe Soufi Ibn Sabin* . . . ترجمہ A. F. Mehren (در جرنل ایشیاٹک ۱۸۸۰

ابن جبیر : . . . *Ibn Gubayr Viaggis* ترجمہ Schiaparelli (روم ۱۹۰۶ء) -

باب ہشتم

ابن الطقطقیٰ : الفخری ترجمہ E. Amar (پیرس ۱۹۱۰ء) -

البصیری : La Bordah ترجمہ R. Basset (پیرس ۱۸۹۴ء

انگریزی ترجمہ از J. W. Redhouse در Clouston وہی کتا

دمشقی : *inuel de la Cosmographie du Moyen Age* ترجمہ A. F. Mehren (کوپن ہیگن ۱۸۷۴ء) -

ابوالفداء . . . . *Geographie* ترجمہ Reinaud اور Guyard (پیرس ۱۸۴۸ء تا ۱۸۸۳ء) -

ابن مجید : *Instructions nautiques* ترجمہ Ferrand اور Gaudefry-Demombynes (پیرس زیر اشاعت) -

قلقشندی : (۱) *La Syrie a l'Epoque des Mamelouks* Gaudefroy-Demomypnes (پیرس ۱۹۲۳ء) -

(۲) *Die Geographie und Verwattung* ترجمہ Wustenfeld von Agypten ترجمہ (گوٹنجن ۱۸۷۹ء) -

مقریزی: *Historie des Sultans Mamelouks de l' rgypte* ترجمہ E. Quatreniere (پیرس ۱۸۳۷ء تا ۱۸۴۵ء) -

ابن عرب شاہ: *Historie du grand Tamerlan* ترجمہ P. Vattier (پیرس ۱۶۵۸ء) -

سیوطی: *History of the Caliphs* ترجمہ H. S. Jarrett (کلکتہ ۱۸۸۱ء)

Thousand and One Nights:

(۱) *Les Mille et Une Nuits* ترجمہ M, Galland (ھلیگ ۱۷۱۴ء یا لگ بھگ) -

(۲) مکمل انگریزی ترجمہ از J. Payne (۱۳ جلدیں لندن ۱۸۳۹ء تا ۱۸۴۱ء) (۳) مختصر انگریزی ترجمہ از E.W. Lane (۳ جلدیں لندن ۱۸۳۹ء تا ۱۸۴۱ء) *Hundred and One Nights* ترجمہ Gaudefry-Demombynes (پیرس بلا تاریخ) Romance of Antar (ترجمہ شامی زبان سے) T. Hamilton (لندن ۱۸۲۰ء) Arabische Schattenspiele ترجمہ E. Littmann (برلن ۱۹۰۱ء) -

ابن ہذیل: *La Parure des Cavaliers* ترجمہ L. Mercier (پیرس ۱۹۲۴ء) -

ابن بطوطہ: (۱) *Les Voyages d'Ibn Batouta* ترجمہ C. Defrimery اور B. R. Sanguinetti (۴ جلدیں پیرس ۱۸۵۳ء یا لگ بھگ) -

(۲) *The Travels of Ibn Batouta* ترجمہ مختصر عربی مسودات سے (لندن ۱۸۲۹ء) -

Land Africanus: *The History on Description of Africa* نے ۱۶۰۰ء میں انگریزی میں ترجمہ کیا اور اب (لندن ۱۸۹۶ء) شائع کی -

عبدالواحد: *Histoire des Almohades* ترجمہ E. Fagnan
(الجزائر ۱۸۹۳ء)

ابن خلدون: (۱) *Prolegomenes* ترجمہ MacGuckin de Slane
(پیرس ۱۸۶۳ تا ۱۸۶۸ء) اس میں ابن خلدون کی خود نوشتہ سوانح عمری بھی ہے) -

(۲) *Histoire des Berberes* ترجمہ MacGuckin de Slane
(الجزائر ۱۸۰۲ء) -

مقری: *The History of the Mohammedan Dynasties in Spain* ترجمہ Pascuol de Cayangos (لندن ۱۸۳۰ء) -

تحفۃ المجاهدین ترجمہ M. J. Rowlandson (لندن ۱۸۳۳ ء) -

Abdallah's History of Gujarat ترجمہ سر ای ڈی راس
وزیر اشاعت) -

حاجی خلیفہ: *Lexicon bibliographicum* لاطینی ترجمہ G. Flugel (۷ جلدیں لائپ زگ ۱۸۳۰ء—۱۸۵۸ء) -

عرب فقیہ: *Conquiete de l' Abyssinie* ترجمہ R. Barret
(پیرس ۱۸۹۷ تا ۹۹ء) -

سعدی: تاریخ سوڈان ترجمہ از O. Houdas (پیرس ۱۹۰۰ء)

مقالہ جبرتی (۱) *Merveilles biographiques et historiques* ترجمہ Chefik Mansour Bey وغیرہ (قاہرہ ۱۸۸۸ تا ۱۸۹۳ء) -

(۲) *Journal d' Abdurrahman Gabarti* ترجمہ A. Cardin
(پیرس ۱۸۳۸ء) -

جرجی زیدان: *Omayyadi and ' Abbasids* یعنی جلد ۴
History of Islamic Civilization ترجمہ D. S. Margoliouth (لندن ۱۹۰۷ء) -

محمد عبدہ: رسالۃ التوحید ترجمہ B. Michel (پیرس ۱۹۲۵ء)

اضافـــۂ ضمیمہ

ابن المعتز (ص ۳۴) C. Lang : *Nustaqid als Prinz und' Regent*, Z. D. M. G., جلد ۴۰، ۴۱ -

خوارزمی (ص ۹۴) *The Algebra of Mohammed ben Musa* طبع و ترجمہ F. Rosen (لندن ۱۸۳۱ء) -

مقدسی (ص ۹۵) : المقدسی : احسن التقاسیم ترجمہ G. S. A. Ranking اور R. F. Azoo (کلکتہ ۱۸۹۷ء-۱۹۱۰ء)، نامکمل) -

مقریزی (ص ۱۰۵) : *Description . . . de l' Egypte* ترجمہ U. Bouriant (پیرس ۱۸۹۵ء تا ۱۹۰۰ء نامکمل) -

---

نوٹ : متن میں ابواب کے حرف نمبر دئے گئے ہیں - ماخذ میں جزو سے مراد اصل ہے

اغلاط نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴	۱۰ (حاشیہ)	ج	جو
۵	۱۱ (,,)	صلی اللہ علیہ و آلہ	صلی اللہ علیہ و علیٰ آلہ
۹	۷ (,,)	موقعہ	موقع
۱۰	۱۸	لہذا	لہٰذا
۲۶	۱۶	مخدوفات	محذوفات
۳۰	۲	جاۓ	جائے
,,	۱۶	بے	لیے
۳۴	نوٹ (حاشیہ) اسکا تعلق اس عبارت سے ہے جو صفحہ ۳۵ پر 'ہلاک کر دیتی ہے' پر ختم ہوتی ہے		
۴۱	۲	۰۵۷۰	۰۷۵۰
۴۳	۱۰	صلی اللہ علیہ وآلہ	صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ
,,	آخری (حاشہ)	نمبر ۲	نمبر ۱
۴۴	۱۴	صلی اللہ علیہ و آلہ	صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ
۴۸	۱۰	بوجہ	بوجھ
۵۶	۱۲	خالمے	خاتمے

صفحه	سطر	غلط	صحیح
۵۸	۱	ور	اور
٦٦	۱۰	التہ	البتہ
٦۸	۱۷	دستان	دبستان
٦۹	۲	ترجوں	ترجموں
٦۹	۱۷	حس	جس
۷۰	۱۱	(م ۳۳۸ع)	(۳۳۸ھ)
۷۲	۲	سبویہ	سیبویہ
۷۳	۱۷	شعولی	شعوبی
۷۴	۸	قدین تریم	قدیم ترین
,,	۱۷	سلاوہ	علاوہ
۷۵	۱۲	امالی	.اھالئی
,,	۲۰	حدب	حرب
۷٦	۸	وطنۃ	وطنہ
۷۷	۱۵	اس بے	اس نے
۷۹	۱	اعلے	اعلیٰ
,,	۹	شعروسحن	شعروسخن
۸۰	۱۰	ارادۃ	ارادۃً
۸۱	۱۲	ممایندگی	نمایندگی
۸۱	۱٦	اہر	پر
۸۳	۱	تشرچ	تشریح

صفحه	سطر	غلط	صحیح
۸۳	۶	ایکا	ایک
۸۴	۱۶	کہاس	که اس میں
۸۵	۲ (حاشیه)	اعلے	اعلیٰ
,,	۵ (,,)	حنبلی اور اهل حدیث لوگ بھی اصول میں معتزلی ملتے هیں	حنبلی اور اهل حدیث میں بھی بعض لوگ اصول میں معتزله سے ملتے هیں۔
۸۶	۴ (,,)	طرز مکر	طرز فکر
,,	۸ (,,)	قاطبه	قاطبةً
,,	۹ (,,)	ان میں	انھیں
۸۸	۹	علم هئیت	علم هیئت
۹۵	۱۹ (حاشیه)	مدراس	مدارس
,,	۱ (,,)	اس کا تعلق اس صفحه سے نہیں بلکه صفحه ۱۰۲ سے ہے جہاں یه درج ہے لہٰذا یہاں زائد ہے۔	
۹۶	۲	حتے	حتیٰ
۹۸	۵	دعوے	دعویٰ
۱۰۱	۱۱	(ص ۴۰)	(ص ۷۵)
۱۰۲	۲۵ (حاشیه)	اعلے	اعلیٰ
۱۰۳	۱۶	لبے	لیے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۰۳	۱۷	جسجو	جستجو
۱۰۴	۸	علی ہذالقیاس	علیٰ ہذالقیاس
۱۰۶	۲	صلی اللہ علیہ و آلہ	صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ
۱۰۷	۱	یہ	نہ
۱۱۱	۱۰	میں	میں
،،	۱۴	بیھ سکا -	نبھ سکا
۱۱۳	۵	ھ ں	ھیں
۱۱۴	۱۹	کتاب الرسالل و الا ستذکار	کتاب الرسائل والاستذکار
۱۱۵	۸	میں	میں
۱۲۱	۹	سلسے	سلسلے
۱۲۳	۲۰	منعوان	عنفوان
۱۲۴	۸	اعلے	اعلیٰ
۱۲۵	آخری	ناگوا	ناگوار
۱۲۶	۱۱	مقفے	مقفیٰ
،،	۱۵	ادی	ادبی
،،	۱۷	انحطاط	انحطاط
،،	۲۰	حکرالوں	حکمرانوں
۱۲۷	۹	اعلے	اعلیٰ
۱۲۸	۶	کہانیوں کر	کہانیوں کی
،،	۹	۹۴۰/۹۴	۹۴۱/۹۴۰ء

صفحه	سطر	غلط	صحیح
۱۳۰	۶	هوگئی	هوگی
,,	۷	اگرچه	اگر یه
۱۳۲	۱۵	قرون وسطے	قرون وسطیٰ
۱۴۱	آخری	منیں	سنین
۱۴۲	۷	بفض	بغض
۱۴۴	۱	(حاشیه) اعلے	اعلیٰ
,,	۴	(,,) مصر ۱۳۰۵ع ص ۱)	مصر ۱۳۰۵ء ص ۲،۲)
,,	۱۲	(,,) فسباً منکواً	نسباً منکراً
,,	۱۳	(,,) فیاتدی	فیاتدعی
,,	۱۳	(,,) فاله کراباً	فاذکر اباً
,,	۱۵	(,,) اولادع	اولا دع
۱۴۵	۱	برسراقشدار	برسر اقتدر
,,	۱	(حاشیه) (اس کتاب تاریخ الخلفا)	اس کتاب (تاریخ الخلفاء)
,,	۳	(,,) اعلے	اعلیٰ
,,	,,	(,,) قاطمین	فاطمیین
,,	۸	(,,) حتے	حتیٰ
۱۴۶	۹	(,,) حفید	حفیده
,,	۱۶	(,,) ممن	مسن
۱۴۷	۳	پائی جا:	پائی جاتی
۱۴۸	۲	له تو مسرت	نه تو وهاں مسرت

صفحه	سطر	غلط	صحیح
۱۴۸	۲	ند هی کچھ اور	نه هی کچھ اور
,,	,,	جو تویف	جو تعریف
,,	۹ (حاشیه)	لیبرد وهم	لیبردوهم
۱۴۹	۳	جن کی وجه سے زیاده اهم	جنکی وجه علمی اور ادبی ذوق‌کی ترقی مسدود رهی ان اسباب سے زیاده اهم
,,	٦ (حاشیه)	قال مختار القتل	قال مختارالقتل
,,	۸(,,ترجمه)	کو	کوئی
۱۵۲	آخری	اوزاں	اوزان
۱۵۵	۴	قهی	تهی
,,	۱۸	ارگرد	اردگرد
,,	آخری	بچپن کے تعویذ دور کرکے اتارے	بچپن کے تعویذ اتارے
۱٦۲	٦	دعوے	دعوی
,,	۱۰	پوری کرے	پوری کرنے
۱٦۴	۳	مکر وه	مکروه
,,	۱۱	زمانے	زمانے
۱۷۰	۱	البیضاری	البیضاوی رح
,,	۱۲	میں مالد پڑ جائے	میں ماند پڑ جائے
,,	۱۹	انهوں نے	انهوں نے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۷۱	٦	انھوں ” مقامات “	انھوں نے ” مقامات “
”	۱۸	علماء و فضلا	علماء و فضلا
۱۷۲	۱۳	تمہد	تمہید
”	۱۰	عربی کے اعلے	عربی کے اعلیٰ
۱۷۳	۱۲	جادو بیا	جادو بیانی
۱۷۴	۹	معدوے ھی چند	معدودے چند ھی
”	۱٦	(ص ۲۱)	(ص - ۳۷)
”	آخری	(ص ۸۰)	(ص - ۱۵٦)
۱۷۵	۱٦	کھڑے کہ دینے	کھڑے کر دینے
۱۷۸	۱۳	صوفی شیخ ار ابن عربی	صوفی شیخ اکبرابن عربیؒ
۱۷۹	۲	آشناہ	آشنا ھیں
”	”	مسلمار	مسلمان
۱۸۰	۲	مرلوط سے	مربوط ھے
”	۳	ابہام	ایہام
۱۸۲	۱۹	مقفے	مقفیٰ
۱۸۴	۵	سورخین	مورخین
”	۱۹۰	رکھیں	رکھیں جو
۱۸۵	۳	موسوعات	معجم
”	۱۳	علم طب	عالم طب
”	۲۰	اپنے آپ کو	یہ الفاظ حذف کئے جائیں

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
,,	آخری	کسی قسم	کسی خاص قسم
۱۸۶	۲	مستثنے	مستثنیٰ
,,	۱۶	قرون وسطے	قرون وسطیٰ
۱۸۷	۱۲	(ص - ۷۸)	(ص - ۱۵۴)
۱۹۱	۱۷	قرون وسطے	قرون وسطیٰ
۱۹۲	۹	اعلے	اعلیٰ
۱۹۲	۱۹	دعوے	دعویٰ
۱۹۷	۹	قوت متخیلہ نمایاں تھی	قوت متخلیہ میں کمزوری نمایاں تھی
۲۰۰	آخری	حوالمہ	حوالہ
۲۰۱	۸	مصر الخمطط	مصر الخطط
,,	۱۵	سوانح	سوانح
۲۰۲	۱	زمانے	زمانے میں
,,	۶	مقفے	مقفیٰ
,,	۱۸	سب بڑے	سب سے بڑے
۲۰۳	۱۱	(ص ۸۶)	(ص ۱۶۸ و ۱۶۹)
۲۰۴	۱	گیا	گیا
,,	۷	دعوے	دعویٰ
,,	۱۳	الهف لیلة	الف لیلة
۲۰۵	۱۵	ان کو ماخذ	ان کا ماخذ

صفحه	سطر	غلط	صحیح
۲۱۰	۱۴	قرون وسطے	قرون وسطیٰ
۲۱۱	۴	استعار	اشعار
,,	۸	دعوے	دعویٰ
,,	,,	دستور واقعات	انتخاب واقعات
,,	۱۶	هن	هیں
۲۱۲	۴	پا بر کت	با بر کت
,,	۱۷	منائع	ضائع
۲۱۳	٦	افریه	افریقه
۲۱۴	٦	دعوے	دعویٰ
۲۱۵	۱۴	انے	اپنے
,,	۱۵	اقتصا-ی	اقتصادی
۲۱۷	۱۳	فارس	فارسی
۲۱۸	٦	مقفے	مقفیٰ
۲۱۹	۷	سید مرتضے	سید مرتضیٰ
,,	۱۳	شرح هے	شرح شامل هے
,,	۱۸	پرالی	پرانی
۲۲۰	۹	قرون وسطے	قرون وسطیٰ
,,	۱٦	نقوذ	نفوذ
۲۲۱	۲۰	اعلے	اعلیٰ
۲۲۲	۱۲	قرون اولے	قرون اولیٰ

صحیح	غلط	سطر	صفحه
نے آیا''	لے آیا	٥	۲۲۳
ضمیمه (۱)	ضمیمه	۲	۲۲٥
به سلسلهٔ صفحه ۳۳ و ۴۴	صفحه ۲۰ الف	۸	,,
صلی‌الله علیه وعلیٰ‌آله وسلم	صلی الله و آله وسلم	۱۰	,,
صلی‌الله علیه وعلیٰ آله	صلی الله علیه و آله	۱۰	۲۲٦
اعلیٰ	اعلے	۱۲	,,
اجمعین	اجمعیں	۱٦	,,
فاذا قرانه	فاذاقرانا	۱۳	۲۲۷
کرنے والے	کرے والے	آخری(ترجمه)	,,
ورتّلنه ترتیلاً	ورقلناه ترتبلا	۱٦	۲۲۸
حتیٰ	حتے	۱۲	۲۲۹
جوهر ستائش	(ترجمه) جوهر ستالس	٦	۲۳۰
بس قصص ـ متکلمین	بس قصص متکلمین	٦	۲۳۱
للهذا	لبهذا	۱۱	۲۳۳
دعویٰ	دعوے	۱۳	,,
خدا تعالیٰ	(ترجمه) خدا تعالے	۱	,,
مصلحت الٰهی	معصلحت الهیٰ	۹	۲۳٦
لئهذا	لهذا	۱۲	۲۳۷
هرابلیس کی تلبیس	هرابلس کی تلیس	٦	۲۳۹
پیدا هوئے	پید هوئے	۸	,,

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۳۹	۱۲	ظلمت و قسادت	ظلمت و قسلوت
,,	۱۵	حونویں صدی	جو نویں صدی
,,	۱۶	پیلی بھتیتی	پیلی بھیتی
,,	۲۰	ھزا‌ون	ھزاروں
۲۴۰	۳	صلی اللہ علیہ و آلہ	صلی اللہ علیہ و علیٰ الہ
,,	آخری	برائی کا علی وجہ	برائی کا علیٰ وجہہ
۲۴۱	۳	نواز ہے	نوازا ہے
۲۴۳	۱	الیت	الٰہیت
,,	۲	دعوی	دعویٰ
,,	۳	ححت	حجت
,,	۱۸	پہچا نہیں	پیچھا نہیں
۲۴۴	۷	نیز پچیدہ	نیز پیچیدہ
,,	۱۰	مصنطلحات	مصطلحات
,,	۱۴	اعلی پاپہ	اعلیٰ پایہ
,,	۱۵	صلی اللہ علیہ و آلہ	صلی اللہ علیہ و علیٰ آلہ
,,	۱۹	اس ے	اس نے
,,	۲۰	الہی	الٰہی
۲۴۵	۳	(ترجمہ) گچے	گچھے
,,	۱۰	دعوے	دعویٰ
۲۴۵	۱۰	عقلاے دھر	عقلائے دھر

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۴۵	۱۱	کسی طرح دوسری طرح	کسی دوسری طرح
,,	۱۵	ہشکواۃ	مشکواۃ
,,	آخری	حتی	حتیٰ
۲۴۶	۳	لہذا	لٰہذا
,,	۵	الہی	الٰہی
,,	آخری	صلی اللہ علیہ وآلہ	صلی اللہ علیہ و علیٰ آلہ
۲۴۷	۱	اشادات	اشارات
,,	۱۹	گرویدہ کے	گرویدہ ہے
۲۴۸	۵	.رسگاھوں	درسگاھوں
۲۴۹	۸	الہی	الٰہی
,,	۱۹	الہی	الٰہی
۲۵۰	۴	لہذا	لٰہذا
,,	۴	لہذا	لٰہذا
,,	۶	غیر مقصی	غیر مقفیٰ
,,	۷	مقضی	مقفیٰ
۲۵۱	۵	حمہ ح	جندح
,,	۵	کنندہ	کندہ
,,	۸	زوال پذ	زوال پذیر
۲۵۲	۴	ذوالفروح	ذوالقروح
,,	۷	امرعالقیس	امرءالقیس

صفحه	سطر	غلط	صحیح
۲۵۳	۷	نسبتۂ	نسبۃً
"	۱۸	نابغه ذبیانی	نابغہ‌ذبیانی
۲۵۴	۱۴	بادشا هوں	بادشاهوں
"	۱۸	نابغه ذیپانی	نابغہ‌ذبیانی
۲۵۵	۱	لہذا	للہذا
"	۴	ره ا	رها
۲۵۶	۲	طه حسیں	طه حسین
۲۵۷	۷	لہذا	للہذا
"	۱۹	کسری	کسریٰ
۲۵۸	۲	عام	علم
۲۶۰	۴	مشهور	مشهور ہے
"	۸	دنیا کی	دنیا کے
"	۹	بلخصوص	بالخصوص
"	۱۴	رہے	رها
"	۱۸	نائز تھے	فائز تھا
"	آخری	نفرت کرتے	نفرت کرتا
۲۶۱	۱	تھے	تھا
"	۱۳	شاهرانه استعداو کے	شاعرانه استعداد کے
۲۶۲	۳	مورد ر۔ها	مورد رها
"	۹	اکابر علمای ادب	اکابر علماء ادب

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۶۲	آخری	اس ـ	اس نے
۲۶۳	۱۰	سمبں	سمیت
,,	۱۳	شاعرـ	شاعر نے
۲۶۴	۱۰	الجلیس الجایس الصالح	الجلیس الصالح
,,	۱۶	حتیٰ	حتی
۲۶۵	۱۶	پیعلم	سیعلم
۲۶۶	۸	انہوں ـ	انہوں نے
۲۶۷	۱۳	عیسوی نکہ	عیسوی تک
۲۶۸	۸	جغرافیہ نویس ہے جو صالح	جغرافیہ نویس ہے۔ یہ واضع کی اولاد سے ہے جو صالح
,,	۹	مولی	مولیٰ
,,	آخری	اتراک ، مصریوں	اتراک، چینیوں، مصریوں
,,	,,	بجا۔	حذف کیا جائے
۲۷۰	۸	بہاء الد ولہ	بہاء الدولہ
۲۷۱	۴	۱۳۳ھ	۳۱۳ھ
,,	۸، ۹	وغیرہ ہم	وغیرہم
۲۷۲	۱۰	,,	,,
,,	۱۱	مشتمل ہیں	مشتمل ہے
,,	,,	مقالہ ـ	مقالے میں

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۷۲	۱۲	متعلق علوم فقہ، کلام ۱۱- عروض، تاریخ	متعلقہ علوم :- فقہ، کلام، عروض اور تاریخ
۲۷۳	۷	نیساپور	نیشاپور
۲۷۵	۱	حضرات	حضرت
،،	۱۰	فتوی	فتوے
،،	۱۶	،،	،،
۲۷۶	۱۴	سیاصت	سیاحت
۲۷۸	۱	کتاب الیان والتبن	کتاب البیان والتبیین
،،	۶	جزولایتجزی	جزولایتجزیٰ
،،	۱۱	لبهذا	للهذا
۲۷۹	۲	مصر اور ہے	مصر ہے
،،	۳	سیاست ارو	سیاست اور
،،	۱۶	دئیے	دیے
۲۸۰	۷	دئیے	دیے
،،	۹	کرے	کرنے
۲۸۳	۱۱	لبهذا	للهذا
،،	۱۴	۱۷۳۱ع	(۱۷۳۱ع)
۲۸۴	۵	پھ قرطبہ	پھر قرطبہ
،،	۸	تصنیف وتافتف	تصنیف وتالیف
۲۸۵	۱۱	بلاآخر	بالآخر

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
٢٨٦	۰	اعلےٰ	اعلیٰ
,,	٩	ہاتھوں سے اسے	ہاتھوں اسے
٢٨٧	١٠	اعلےٰ	اعلیٰ
٢٨٨	٣	,,	,,
,,	٩	ابالعباس	ابوالعباس
٢٩٠	٣	(٢) جلدیں....	(٢- جلدیں ....
,,	٨	(٣)	(٢)
,,	١٣	de l'Islam	de l' Islam
,,	١٤	١٩٢١ء تا ١٩٢٠ء)	١٩٢١ تا ١٩٢٥ء)
٢٩١	٢٠ تا ٢٢		موجودہ عبارت کی بجائے حسب ذیل عبارت ہونی چاہیے
٢٩٢	١ تا ٢		''اس کتاب میں حسب ذیل تصانیف دوبارہ طبع ہوئی ہیں (١) '' معلقات '' کا ترجمہ نثر میں از سر ولیم جونز (٢) جملہ ادوار کی چھوٹی چھوٹی نظموں کا متفرق مجموعہ ترجمہ از J. D. Carlyle (٣) متعدد اہم غزلوں اور عشقیہ گیتوں کا ترجمہ از J. W. Redhouse (٤) متعدد دیگر قطعات شرح و حواشی کے ساتھ''
٢٩٢	٨، ٩	(١٩٠ء وی آنا ١٨٩٩ء)	(وی آنا ١٨٩٩ء تا ١٩٠٠ء).

صفحه	سطر	غلط	صحیح
۲۹۲	۱۴	ترجمه	تراجم
,,	۱۶	محمد	محمد صلعم
,,	۱۹	باب محمد	باب محمد صلعم
۲۹۵	۱ (حاشیه)	ترجمه	ترجمے
۲۹۹	۳	مقفے	مقفیٰ
۳۰۰	۷	(لبڈن ۱۶۲۵ء	(لیڈن ۱۶۲۵ء)
۳۰۱	آخری	گوٹنجن ۲۸۷۹ء	(گوٹنجن ۱۸۷۹ء)
۳۰۲	۱۱	۳ جلدیں)	(۳ جلدیں)
,,	۱۲	(لندن ۱۸۴۱ ۱۸۳۹ء تا)	(لندن ۱۸۳۹ء تا ۱۸۴۱ء)
,,	۲۴	Land Africanus	Leo Africanus